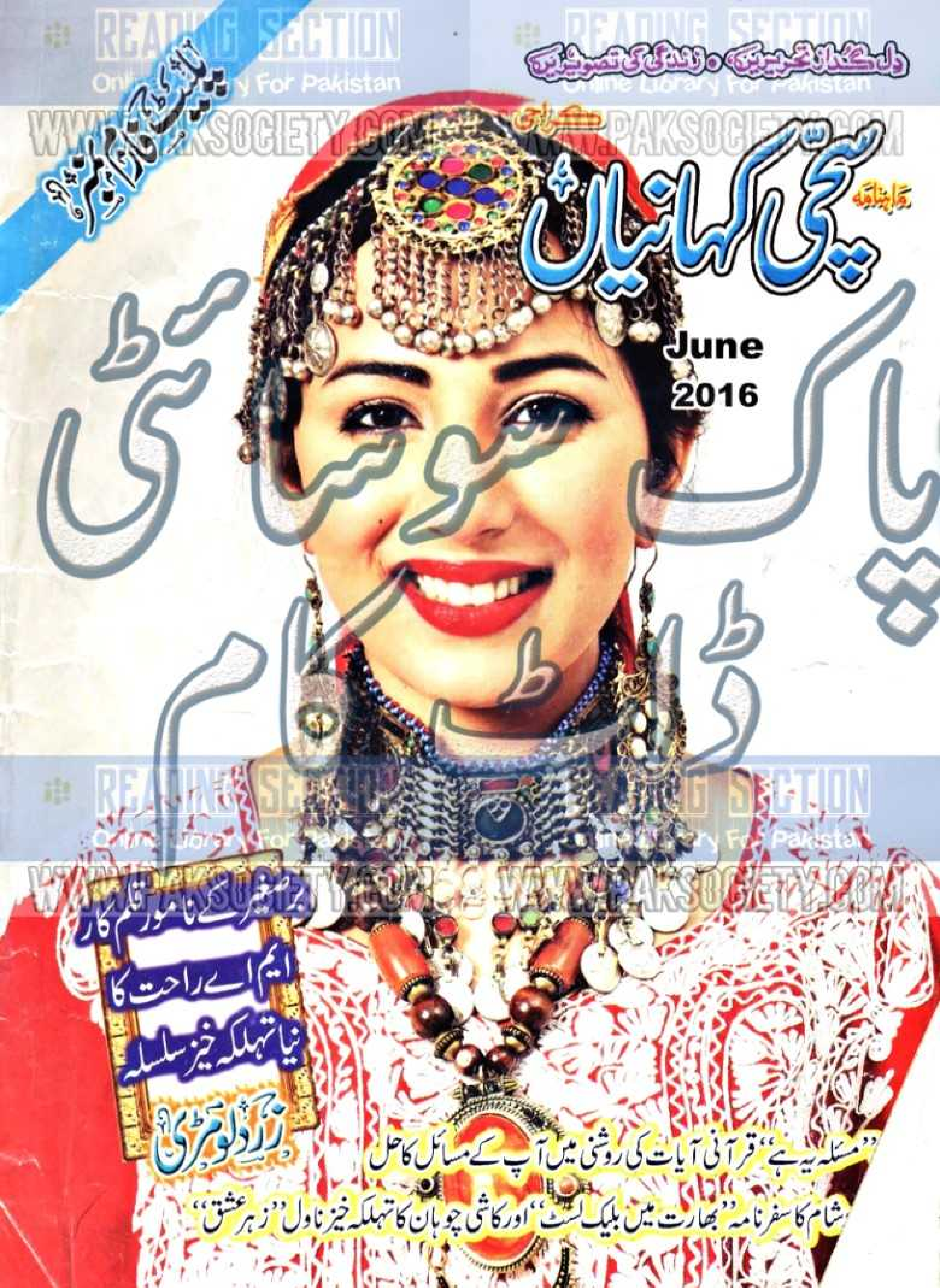

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں
ماہنامہ
کراچی
سچی کہانیاں
June
2016
بر صغیر کے نامور قلم کار
ایم اے راحت کا
نیا تہلکہ خیز سلسلہ
زردِ لومڑی
"مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
شام کا سفرنامہ "بھارت میں بلیک لسٹ" اور کاشی چوہان کا تہلکہ خیز ناول "زہر عشق"
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

منیجر مارکیٹنگ
021-35893121

منیجر سرکولیشن
0333-2269932

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز	MEMBER APNS CPNE

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے/ افریقہ 65 ڈالر/ کینیڈا/ آسٹریلیا 65 ڈالر/ ایشیا یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انہیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

کبھی تو ایسا ہو

کچھ مناظر ایسا اثر چھوڑتے ہیں کہ انسان کی زندگی مکمل طور پر تبدیل ہوجاتی ہے۔ اُس کی سوچ‘ اُس کا زمانے کو پرکھنے کا انداز سب بدل جاتا ہے...... کراچی کے رہنے والے اس بات سے اتفاق کریں گے کہ عرصہ ہوا گلاب کی پنکھڑیاں صرف جنازوں پر ہی پھیلی دیکھیں۔ لوگوں کا ہجوم جوانوں کے جنازوں کے ہمراہ ہی دیکھا۔ لاپتا ہونے والے ہمیشہ لاشوں کی صورت میں ہی ملے۔ زخموں سے چُور بدن گزری شب کی ساری کہانی سناتا رہا۔ اور ماں کلیجہ تھامے جگر کے ٹکڑے کے ٹکڑے دیکھتی رہی......

جب ننھی منی شہزادی لاپتا ہوئی تب وہ بھی اُدھڑی ہوئی ہی ملی۔ ماؤں کا تڑپنا اور بلکنا دل کو چیر کے رکھتا رہا۔ عام پاکستانی کی ڈکشنری میں ’لاپتا‘ ہونے کا مطلب ہے موت...... اگر قسمت اچھی ہوئی تو جنازہ اٹھایا جائے گا۔ ورنہ والدین کو اپنے کلیجوں پر صبر کی بھاری سِل رکھنی ہوگی۔ مگر خاص پاکستانیوں کا معاملہ مختلف ہے۔ کچھ عرصہ قبل سابق گورنر پنجاب کے صاحبزادے بازیاب ہوئے تھے۔ چمکتا چہرہ‘ صحت مند جسم‘ خصوصی طیارہ‘ مکمل طبی معائنہ‘ کالے شیشوں والی گاڑیوں کا قافلہ اور محبت سے جھومتے دیوانوں کی گل پاشی...... آج وہی منظر پھر آنکھوں نے دیکھا۔ سابق وزیراعظم کے صاحبزادے کی بازیابی...... بازیاب ہونے والا افغان فوج اور امریکی فوج کا شکر گزار اور حیران کہ اتنا وی آئی پی پروٹوکول کیوں مل رہا ہے؟ لیکن خیر مزہ آرہا ہے۔ بے شمار لذیذ پکوان‘ ڈھول پر رقص کرتے جیالے‘ ماں سے لپٹنے کا جذباتی منظر...... کیا نصیب ہے...... اللہ سب کے نصیب ایسے ہی سونے کے قلم سے لکھے...... میری تمنا ہے کہ ان کے لاپتا اسی طرح ملتے رہیں۔ مگر عام پاکستانی ماں کو بھی ان کے جگر کے گوشے کم از کم زندہ تو ملیں۔ نا گل پاشی کی تمنا نا خصوصی طیارے کی آرزو‘ نا ہی ڈھول کی تھاپ‘ فقط اتنی آرزو ہے کہ ہمارا بھی لاپتا زندہ بازیاب ہو...... کبھی تو ایسا ہو......

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

لیجیے برس کا چھٹا ماہ بھی آن پہنچا! 2016ء آدھا گزر گیا۔ دبے قدموں، بنا کسی امید وبیم کے اِدھر ذرا مجھے سنیے! مجھے بتایئے کہ اِس نئے برس سے جو آپ نے توقعات وابستہ کی تھیں، پوری ہوئیں! جو آپ نے منصوبہ سازی (پلاننگ) کی تھی۔ اُس میں کامیابی نے کتنے آپ کے قدم چومے...... مجھے آواز آ گئی۔ میں سمجھ گیا...... آپ ابھی بس سوچ رہے ہیں...... سوچنے والے سوچتے رہ جاتے ہیں اور وقت کا سفر اپنی رفتار سے رواں رہتا ہے اور پھر ہماری منزل آ جاتی ہے۔ ساتھیو! اٹھ جاؤ! جو ادھورے کام ہیں۔ اِس عزم کے ساتھ شروع کرو کہ 2016ء میں مکمل کرنے ہیں۔ بس اب اس سے زیادہ کیا کہوں کہ مجھے جو کام کرنا تھا۔ آپ کے عزم کو جگانا تھا۔ وہ میں کر چکا۔ اب آپ بتایئے اس 2016ء میں...... آپ اپنے آپ کو مطمئن کر پائیں گے۔ اپنی کاملیت سے، اور ہاں...... کاملیت ہی انسان کو اشرف المخلوق کا درجہ دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی محبتوں کے طلسم کدے میں قدم رکھتے ہیں۔

آیئے ساتھیو! احوال کی ابتداء ہم اپنی بہت پیاری، آفت کی پڑیا، اچھی گڑیا سدرہ انور علی جھنگ، صدر کے تبصرے کرتے ہیں۔ لکھتی ہیں۔ عزیز از جان بھیا کاشی چوہان ڈیئر سسٹرز برادرز اور آل اسٹاف السلام علیکم! اسی امید کے ساتھ حاضر محفل ہوں کہ تمام پڑھنے والے خیر سے ہوں گے۔ اور ہونا بھی چاہیے۔ اتنی طویل طویل کہانیاں جو پڑھ رہے ہیں۔ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ملا ٹائٹل بہت دلکش تھا۔ خوب صورت فہرست، پیاری آنٹی منزہ سہام نے ہمیشہ کی طرح سبق آموز اداریہ لکھا۔ احوال میں سبھی نے بہت اچھا لکھا تمام نئے آنے والوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید۔ اور تمام جانے والوں سے واپس آنے کی اپیل پلیز لوٹ آئیں۔ پیاری آپی زرینہ جونیجو امید کرتی ہوں خیر سے ہوں گی جس محبت اور فکر سے آپ نے میرے لیے دعا کی تو انشاء اللہ، اللہ ضرور اپنا کرم کرے گا۔ یقین کیجیے میں بھی آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔ مگر میری حالت میں تا حال کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ ڈیئر ملکہ احوال تحسین جونیجو آپ کی اس قدر دعاؤں پر بہت ممنون ہوں۔ اسماء اعوان نے لائف بوائے پر بہت زبردست کہانی لکھی اور یقین مانیے ہر ماہ مجھے اس کا انتظار رہتا ہے۔ اقبال بانو نے خوب صورت موضوع پر بہت دردناک کہانی لکھی۔ ریاض حسین شاہد، انگاروں پہ رقص، اقبال چنہ کی اناڑی، نوشابہ نوش کی وہ سات دن، نسیم سحر کی پرفیکٹ لائف بہت زبردست تحریریں ہیں۔ طاہرہ اشفاق، عشق عالی نصیب، نادیہ ملک، سفر لمحوں کا، فرزانہ نگہت، انجانے میں، مہر پرویز، خانہ برباد، ہم

کسی سے کم نہیں، دانیال شمسی، سید ملازم حسین شیرازی، قانون خاموش ہے، محمد ندیم عباس میواتی، بکاؤ مال، کرن شبیر، منظر پس منظر، بادبان، نعمان اسحاق، بھوک، اعجاز احمد فگرال، کھوٹ، ارم ناز، کنول عمران خان، کیسے کیسے لوگ، آصف اقبال، وہ سب کی سنتا ہے، عظمیٰ شکور کتنی محبت باقی ہے، سعدیہ عابد، آشنا نا آشنا، اُم عادل، محلے کی بیٹی، ان سب نے بہت دلچسپ سبق آموز کہانیاں لکھیں، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ آمین۔ کاشی بھیا کی زہر عشق بہت دلچسپ موڑ پر ہے۔ ایم اے راحت کی زرد لومڑی پہلی قسط بہت پسند آئی۔ انکل محمود شام کا سفرنامہ، بھارت میں بلیک لسٹ بہت دلچسپ ہے۔ مسئلہ یہ ہے بہت لاجواب سلسلہ ہے۔ ہائیڈ پارک میں تمام لوگوں نے بہت اعلیٰ اور خوب صورت انتخابات پیش کیے۔ تیر نیم کش میں سب لوگوں نے بہت پیاری شاعری بھیجی ویلڈن۔ تبصرے میں کچھ رہ گیا ہو تو بہت معذرت۔ اسے بھی میں نے تین نشستوں میں مکمل کیا ہے۔ کاشی بھیا آپ کی اور سچی کہانیاں کی محبت میں، میں رہ نہیں سکی ورنہ میں ایسی حالت میں نہیں تھی کہ لکھ سکوں۔ انشاء اللہ اللہ آپ کی اور سب کی دعاؤں کو قبولیت کا درجہ دے آمین۔ اور جس حالت میں، میں ہوں تو اللہ نہ کرے یہ میرا آخری خط ہوگا۔ سچی کہانیاں میں جانے انجانے میں کسی کا دل میری باتوں سے دکھا ہو تو میں معافی چاہتی ہوں۔ اسی بات کے ساتھ اجازت اپنا ڈھیر سارے والا خیال رکھیے گا۔ سانسوں کا تسلسل یونہی قائم رہے تو پھر ملاقات ہوگی انشاء اللہ۔ تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

☆: پیاری گڑیا! یہ تم نے کیا لکھ دیا۔ امید پہ تو دنیا قائم ہے بیٹا۔ خدا تمہارا مددگار ہوگا۔ ہمیں اتنا شاندار تبصرہ کرنے والی گڑیا کی زندگی بہت عزیز ہے۔ تمہارے لیے بطور خاص آپا مسز نوید ہاشمی نے دعائے صحت بھی کرائی ہے۔

✉: اسلام آباد سے ہماری سینئر لکھاری ساتھی رئیسہ خالد احوال میں شریک ہیں، لکھتی ہیں۔ میں احوال میں شاید دوسری بار شرکت کر رہی ہوں۔ ہماری طرف سے تمھیں اور تمہاری لکھاریوں کو محبت اور خلوص بھرا اسلام پہنچے۔ امید ہے کہ تم اور سچی کہانیاں سے وابستہ سبھی لوگ بخیر ہوں گے۔ اس بار سچی کہانیاں اچھی لگیں۔ کرن بشیر کی کہانی ہے تو بہت اچھی اور سبق آموز مگر یہ کہانی شاید پہلے بھی کہیں پڑھ چکی ہوں۔ ہماری قاری اور لکھاری سدرہ انور کے حادثے کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ انھیں جلد صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ عبدالعزیز جی آ کی والدہ کا بھی بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی والدہ کو جنت میں اونچا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: بہت پیاری رئیسہ آنٹی! سلامت رہیے۔ آپ کی آمد نے جیسے من میں مشعلیں روشن کر دیں۔ آتی رہا کریں۔ کرن کی کہانی سے ملتی جلتی کہانیاں ہر لکھنے والا نئے طریقے سے لکھتا ہے۔ کیونکہ مرکزی خیال یکساں ہے سو اس لیے آپ کو ایسا لگا۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔

✉: لیجیے ساتھیو! کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے بلکہ نام بدل کر۔ ہمارے مور شاہد حسین اب سے شاہد حسین نظام کے نام سے جانے جائیں گے۔ شاہد حسین نظام جیکب آباد سے لکھتے ہیں۔ عزیز ساتھیو! ایک بات شیئر کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے دلبر و محبوب دوست وفا گل ابڑو سے ہمیشہ بے پناہ محبتیں، چاہتیں اور اپنائیت ملی ہے۔ ان کا حکم ملتے ہی مور شاہد حسین قمبر شہداد کوٹ سے شاہد حسین نظام کے نام سے جیکب آباد شفٹ ہوا ہوں۔ میرے عزیزو! اب یہی نام میری شناخت پہچان ہے۔ امید ہے اب

آپ مجھے شاہد حسین نظام سے پہچانیں گے۔ اب آتے ہیں شمارے کی طرف سرورق اچھا تھا۔ اداریہ، لفظ لفظ موتی، دوسرے لمحے محفل احوال میں قدم رکھا جہاں آپ محبتیں تقسیم کر رہے تھے۔ احوالی ساتھیو چند ماہ غیر حاضر رہا دلی معذرت۔ جنھوں نے یاد کیا ان کا شکریہ اور یاد نہ کرنے والوں کا بے حد شکریہ۔ فیضان خورشید، مریم ملک، احسن ابرار رضوی، ایم اے راحت بھلی کر یے آیا خوش آمدید۔ کنزہ ملک مبارک باد۔ سدرہ انور علی خلوص دل سے خصوصی دعائیں۔ بہنا رب پاک آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے آمین۔ ملکہ احوال ادی تحسین جونیجو ادی زرینہ جونیجو کیسی ہیں آپ سلامت رہیں۔ ملک صفدر عباس، عبدالغفار عابد، ممتاز احمد، مجید احمد جائی، صائمہ مجید (خصوصی دعائیں) فیصل ندیم بھٹی، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا آپ سب کیسے ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ پیارے بھائی محمد اسماعیل بروہی اور منشی محمد عزیز آپ کہاں ہیں بھیا۔ لائف بوائے ہمیشہ کی طرح خوب رہی۔ تمام سچی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ایم اے راحت زرد لومڑی، پہلی قسط دلچسپ تھی۔ ایک تصویر ایک کہانی اچھا سلسلہ ہے۔ تینوں شعلے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ محمود شام صاحب نے معلومات میں اضافہ کر دیا۔ بادبان، نعمان اسحاق بہترین ہے۔ ساری حکایتیں بے مثال تھیں۔ زہر عشق، پسندیدہ سلسلہ ہے۔ اگلی قسط کا شوق سے انتظار ہے۔ مسئلہ یہ ہے، باباجی کے لیے دعائیں اور ان سے دعاؤں کی التماس ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش کے لیے الفاظ نہیں۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔

☆: اچھے شاہد! تمہارے نام بدلنے پر کیا کہوں۔ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے۔ خوش آمدید اچھا لگا تمہارا آنا۔ مگر اب غیر حاضر نہ ہونا۔ اپنی محبت کے پھول ہر ماہ ہمارے دامن میں ڈالتے رہنا۔

✉: سیدہ آسیہ عنبر گیلانی، اوکاڑہ سے پہلی بار شاملِ احوال ہیں۔ لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں سے وابستہ تمام احباب کو میرا سلام پہنچے۔ عزیز اِن من پرچہ کیسا ہے اس کا منہ بولتا ثبوت کاشی بھائی کی انتھک محنت ہے جو تمام ریڈرز کے سامنے ہے۔ اس میں لفاظی کی ضرورت ہرگز نہیں۔ طویل کہانی نمبر ایک میں عبدالغفار عابد، نفیسہ سعید، نائلہ طارق، شعبان کھوسہ کی کہانیاں نمبر ون رہیں۔ جبکہ طویل کہانی نمبر 2 میں اقبال بانو، ریاض حسین شاہد، اقبال چنہ، نسیم سحر اور مہر پرویز دولو کی کہانیاں زبردست رہیں۔ اس کے علاوہ کرن شبیر، ارم ناز، عظمٰی شکور، اُمّ عادل کی کہانیوں نے دل کو چھو لیا۔ زہر عشق لازوال ناول ہے۔ جبکہ ایم اے راحت کی زرد لومڑی کی پہلی قسط کمال تھی۔ پرچے کی مقبولیت عروج پر ہے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ خدا اس پیارے پرچے کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ آمین۔

☆: پیاری آسیہ! خوش آمدید! تمہارے مختصر تبصرے نے مزہ دیا۔ اب گڑیا احوال میں باقاعدگی برقرار رکھنی ہے۔ ورنہ بھیا ناراض ہو جائے گا۔

✉: میاں چنوں سے ہمارے لکھاری ساتھی مہر پرویز احمد دولو لکھتے ہیں۔ پیار و محبت کے سفیروں کی محفل میں سکون اور چاہت کے دو بول سننے کے ترسے لوگوں کا جم غفیر ہوتا ہے۔ محبت کے بول سننے کے لیے کان منتظر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی محفلیں ہمیشہ آباد رہتی ہیں۔ ہر آنے والے دن مہمانوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسی ہی ایک محفل عروس البلاد کراچی میں ادیبوں کی دھڑکن محترم جناب سہام مرزا کے لگائے گئے ادب کے درخت کے نیچے محترمہ منزہ سہام مرزا کی زیر صدارت جناب کاشی چوہان سجاتے ہیں۔ پورے ملک کے طول و عرض اور دنیا سے معطر پھولوں کی مہک یکجا کر کے اس محفل

سانحۂ ارتحال

ہمارے دفتر کے ساتھی اقبال حسین کے والد محترم گزشتہ ماہ انتقال فرما گئے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور مرحوم کے اعلیٰ درجات کے لیے دعا گو ہے اور لواحقین کے لیے صبر کی استدعا ہے۔

کو زعفران بنا کر خوشبو کی صورت میں سچی کہانیاں، کو پورے جہاں کی فضائیں مہکانے کے لیے ہر ماہ بڑی تگ و دو سے اہتمام کرتے ہیں۔ ہر ماہ لاکھوں آنکھیں دلوں کے در وا کر کے منتظر ہوتی ہیں۔ اس ماہِ ہر تحریر لاجواب تھی۔ دل و دماغ کی زنگ آلود کھڑکیوں میں ہیجان برپا ہو گیا۔ خواتین نے اسے یادگار بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کمالیہ تا سمندری جہاں میں اکثر جاتا ہوں، لکھاری حضرات کا تانتا بندھا دیکھ کر جی خوشی سے نہال ہو گیا۔ ایسی محفلوں کو سدا آباد رہنا چاہیے۔

☆: پیارے بھائی! آپ کے جذبات کی ہم قدر کرتے ہیں۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ تھوڑا تبصرہ بھی کر دیتے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اگلے ماہ ہمارا یہ گلہ ضرور دور کر دیں گے۔

✉: کراچی سے ہماری بہن عائشہ صدیقہ ضمیر ایک زمانے بعد احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ امید ہے آپ سب بہن بھائی خیریت سے ہوں گے۔ گزارش ہے میں نے کئی ماہ پہلے اپنی ایک کہانی ارسال کی تھی۔ اب مجھے معلوم نہیں چھپی یا نہیں۔ کیونکہ میں کئی ماہ ڈائجسٹ نہ پڑھ سکی۔ اس کا سبب تو آپ کو کیا بتاؤں۔ دوسری کہانی ایک اور ارسال کی ہے۔ اب کہانیوں کے متعلق عرض ہے۔ کہانیاں تو سب ہی اچھی ہیں بعض ایسی ہیں کہ دل کو تڑپا گئیں۔ جیسے 'تم مل گئے ہو' 'پتھر میرا نصیب'، چندر سے عبدالرحمٰن' ایسی کہانیاں ہیں کہ انھیں پڑھ کر وہ لوگ سبق حاصل کریں جو پیر فقیروں کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ عقیلہ حق کی کہانی 'دو کوڑی کی عورت' سب سے اچھی ہے۔ 'پھر صبح ہو گئی' محمد سلیم اختر' بھارتی دہشت گردوں کی کہانی ہے۔ 'ہم شکل' اچھا ناول ہے اینڈ بھی اچھا تھا۔ 'زہر عشق' پراسرار ہے اگلی قسط کا انتظار ہے۔ محمود شام 'بھارت میں بلیک لسٹ' دلچسپ ہے اور سب کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ بجیا کی موت کا دکھ ہے۔ اللہ انھیں جنت میں جگہ دے آمین۔

☆: سب سے پہلے تو اچھی بہن! آپ کی آمد کا شکریہ۔ آپ کی کہانی اس ماہ شاملِ اشاعت ہے۔ آپ کو اب اپنے اس چھوٹے بھائی سے ہر ماہ احوال میں آنے کا وعدہ کرنا ہو گا، قبول ہے نا۔

✉: کراچی سے ہماری بہت پیاری آپی سنبل کا نامہ احوال کو رونق بخش رہا ہے۔ لکھتی ہیں۔ عزیز جی آصاحب مجھے آپ کی والدہ کے انتقال کا بہت دکھ ہوا۔ اللہ مرحومہ کے درجات بلند کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ سلیم اختر صاحب کو بیٹی کی شادی مبارک۔ اللہ جویریہ کو دنیا جہان کی خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ مسز نوید ہاشمی میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں کیسی ہیں۔ دوشیزہ سے بالکل چھٹی لے لی ہے۔ کیا؟ کاشی تمہاری نظم بہت خوب صورت تھی۔ اللہ کرے زورِ قلم و ذہن اور زیادہ عبدالغفار صاحب جنت ٹائپ لڑکی سے میں بھی ملنا چاہوں گی کیوں کہ ان ایسے کردار عنقا ہو چکے ہیں۔ تم مل گئے کے رائٹر خود بھی الجھے ہوئے تھے اور ہمیں بھی الجھا دیا۔ اندھیرے دریچے سازشوں پر مبنی خوب صورت تحریر تھی۔ پتھر میرا نصیب کوثر نے بڑی مشکل سے سیٹ ہوئی زندگی اپنے ہی ہاتھوں سے برباد کر لی۔ سلیم اختر کی کہانی بھی اچھی تھی۔ چندر سے عبدالرحمٰن بہت خوب صورت کہانی تھی۔ دو

کوڑی کی عورت عقیلہ کمال کیا۔ ہم شکل کا اینڈ کچھ جلد بازی کا شکار لگا۔ پکا پھل اچھا تھا۔ بابل بھی اچھی تھی۔ اور اپنا خون بیسٹ تھی تینوں کہانیوں پر سبقت لے گئی۔ بھارت میں بلیک لسٹ کی تو بات ہی کیا ہے۔ حیرت ناتمام قسمت کے پھیر کی اچھی کہانی تھی۔ بادبان بہت اچھی چل رہی ہے۔ اس میں ہر قسط کے ساتھ دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ گردش جاوید راہی صاحب کی کیا بات ہے۔ زہر عشق، کاشی یہ کیا کیا شرجیل کو مار دیا۔ یہ ہے ٹرننگ پوائنٹ اب دیکھو کیا گل کھلاتے ہو۔ بہرحال بہت زبردست چل رہا ہے تمہارا ناول۔ پاباجی سلامت رہیں وہ لوگ جو دوسروں کے درد کی دوائی سبیل اللہ کرتے ہیں۔ ہائیڈ پارک دن بدن نکھر رہا ہے۔ پورے رسالے میں تمہاری محنت نظر آرہی ہے۔ تم نے اس کا معیار بڑھا کر اسے بلندی پر پہنچا دیا اور تم کیسے ہو؟ اب اجازت دو۔

☆: پیاری آپی! یقین کرلیں آپ کے خط ہم تک نہ پہنچ سکے اور انشاء اللہ آپ کو کیا اب کسی کو بھی ہم سے شکایت نہ ہوگی۔ اگلے ماہ تبصرہ آرہا ہے نا۔

✉: منچن آباد سے حسین خواجہ کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ سرورق ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا وقت کی قلت کے باعث تبصرہ کرنے سے محروم ہوں میں سچی کہانیوں سے 2009ء سے وابستہ ہوں۔ سچی کہانیاں کا آج بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ میرے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو اپنی آغوش میں جگہ عنایت فرمائی اپنی پہلی کاوش کہانی کی صورت میں بھیج رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ آپ اشاعت فرمائیں گے۔ میری لکھائی کچھ خاص تو ہے نہیں لہذا کمپوز کروا کر بھیج رہا ہوں خصوصی شفقت فرمائیں۔

☆: اچھے بھیا! ویلکم بیک! کہانی اچھی ہو، پلاٹ مضبوط ہو تو ٹوٹے پھوٹے الفاظ بھی رنگ جماتے ہیں۔ احوال میں آمد کو باقاعدہ بنائیے۔

✉: گوجر خان سے فوزیہ فرید خان احمد مختصر نامے کے ساتھ موجود ہیں۔ میں اپنی ایک اور تحریر ارسال کر رہی ہوں پچھلی تحریروں کی طرح یہ بھی سچی ہے اور میری امی کی دوست کے شوہر اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے۔ اس تحریر میں میں نے اپنی پوری کوشش کی تھی۔ مگر یہ واقعہ میں ٹھیک طرح سے نہ لکھ سکی۔ گزشتہ تحریر کی طرح آپ اسی تحریر کو بھی درست کر کے شائع کر دیجیے گا۔ پچھلی اشاعت کے لیے میں آپ سب کی بے حد مشکور ہوں۔

☆: اچھی بہن فوزیہ! آپ کی تحریر کا پلاٹ بڑا جاندار ہوتا ہے مگر یہ تو بتائیں کہ تبصرے میں کنجوسی کیوں؟؟

✉: ہمارے بھائی ایم افضل آزاد، ساہیوال سے ہمارے احوالی بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ منزہ سہام کی تبدیلی پڑھی ایک بندے کو تبدیل کرنے سے نظام تبدیل نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنا آپ بدلنا پڑے گا پھر نظام بدلے گا۔ احوال میں نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ مومینہ بتول، تسیم سحر، کرن شبیر، ایم عاصم بوٹا، ممتاز احمد، ملک علی رضا، سیدہ حجاب فاطمہ کے احوال بہت اچھے تھے۔ اسٹوریوں میں کرم کے فیصلے، عبدالغفار۔ تم مل گئے ہو، محمد یوسف، ایک تصویر ایک کہانی، دانیال شمسی، ہم شکل، ایم اے راحت، دو کوڑی کی عورت، عقیلہ حق، پکا پھل، نزہت جبیں، بابل، منزل خان، بادبان، نعمان اسحاق، بھارت میں بلیک لسٹ، محمود شام، گردش، جاوید راہی، حسرت ناتمام، ممتاز احمد، پورے ڈائجسٹ کی جان اسٹوری زہر عشق بہت اچھی جارہی ہے۔ بہت اچھی اسٹوری ہے۔ کاشی بھائی ہائیڈ پارک میں خالد یوسفی، ندیم عباس میوانی، اسامہ بلال، ملک علی رضا، شاہانہ احمد، جواد انور، عماد حسین اور تیر نیم کش میں احمر عبدالغنی،

معاویہ عنبر، فائزہ ناز، شازیہ رضوی، عابدہ بیگم، مقصود بلوچ کے شعر بہت اچھے تھے۔ بہت اچھا لکھتے ہیں سب۔ میری دعا ہے اللہ آپ کو صحت دے اور سچی کہانیاں دن دگنی ترقی دے آمین۔

☆: اچھے افضل! تمہارا تبصرہ کرنا اچھا لگا۔ تمہاری باقاعدہ آمد ہمیں بہت بھلی لگتی ہے۔

✉: کراچی سے ہماری بہت اچھی بہن روبینہ شاہین لکھتی ہیں۔ بہت عرصہ بعد حاضر ہو رہی ہوں۔ میں پڑھتی تو تھی سچی کہانیاں لیکن تبصرہ نہیں لکھ سکی کچھ مصروفیات تھیں اب میں نے اس پر تبصرہ لکھنے کے لیے وقت نکال ہی لیا۔ سچی کہانیاں کے سرورق کی ماڈل کی خوب صورت ہنسی بہت خاص ہے۔ 'تبدیلی' کی باتیں اب ہر سیاسی لیڈر شہرت اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کر لیتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ 'تبدیلی' جدوجہد اور قربانی مانگتی ہے، صرف عوام سے قربانیاں مانگنے سے نہیں آتی۔ اب ہم اس شمارے کی بات کرتے ہیں 'لائف بوائے' ہمیشہ کی طرح دلچسپ وخوب صورت ہے۔ کہانیوں میں بہت خاص 'دو کوڑی کی عورت' ایک ایسی کہانی ہے جس میں عام عورت اپنے پورے وقار کے ساتھ نظر آ رہی ہے 'کرم کے فیصلے' ہماری مشرقی روایات کی عکاس ہے 'بابل' بیٹی سے نفرت کرنے والے باپ کا قصہ ہے۔ 'اپنا خون' ایک ایسی کہانی ہے جس میں خون کے رشتے پر بھروسہ نہ کرنے والوں کا عکس پیش کیا گیا۔ 'پتھر میرا نصیب' خاندانی سازشوں اور بے حسی کی زبانی ہے لیکن ایک عورت کی سفاکی کو بہت زیادہ پیش کیا گیا ہے۔ جس سے عورت کی ماں، اس کی نسوانیت اور نرم مزاجی کا چہرہ زرد ہو گیا۔ باقی تمام کہانیاں بھی دلچسپ ہیں تمام سلسلے بہت خوب صورت ہیں۔ خاص طور پر 'تیر نیم کش' میں انتہائی معیاری اور خوب صورت اشعار شامل ہوتے ہیں۔ سچی کہانیاں واقعی بہت دلچسپ اور معیاری ماہنامہ ہے اور اس کی خوب صورتی بڑھانے میں ایڈیٹر صاحب کی کاوشیں نمایاں ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ سب کو بے شمار خوشیاں عطا کرے اور ماہنامہ سچی کہانیاں مزید کامیابیاں حاصل کرے آمین۔

☆: روبینہ جی! آخر یاد آ ہی گئی ہماری۔ اب آپ اس یاد کو برقرار رکھنا اور ہر ماہ احوال کے آنگن میں چکر لگا لیا کریں۔

✉: ملک عاشق حسین ساجد، ہیڈ بکائنی، مظفر گڑھ سے ایک طویل غیر حاضری کے بعد احوال میں حاضر ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ادب ونثر کی دنیا میں ماہنامہ 'سچی کہانیاں'' معیار اور ذوق کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔ خوب صورت سرورق کے ساتھ ماہ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 عمدہ تخلیقات پر مبنی بہت ہی سپر ہے۔ جناب کاشی چوہان کے رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان سچی کہانیاں کی جان ہے جو بہت زبردست انداز میں آگے جا رہی ہے۔ ویلڈن کاشی چوہان! جناب دانیال شمسی کی تخلیق بھی بہت منفرد اور لائق صد تحسین ہے۔ جناب ریاض حسین شاہد، اس بار انگاروں پہ رقص سپر ترین کہانی لیے جلوہ گر تھے جو کمال کے لکھاری اور عظیم شخصیت ہیں۔ اس کے علاوہ نوشابہ نوش، نادیہ ملک، مہر پرویز دولو، طاہرہ اشفاق، نسیم سحر بکا ڈمال، کرن شبیر، عظمیٰ شکور، ام عادل، سعدیہ عابد اور کنول عمران خان کی کہانیاں بھی پڑھ کر بے حد متاثر ہوا۔ ہائیڈ پارک، بے مثال ہے مگر اس کے صفحات کم ہیں۔ ہو سکے تو صفحات بڑھانے کے ساتھ غزلیات کو زیادہ جگہ دیں۔ اس بار 'احوال' میں سید ملازم حسین شیرازی، کرن ناز، محمد قاسم، ایم

حسن نظامی، سدرہ انور علی، زرینہ جونیجو، تحسین جونیجو، عمارہ ناز، عظمیٰ شکور، عبدالغفار عابد، فیصل ندیم بھٹی اور ناز یہ بتول کے خطوط بہترین تھے۔ اور اس احوال میں منزل خان، مجید جائی، علی حسنین تابش، تانیہ راجپوت، احسن ابرار رضوی، اور ایم اے راحیل کے تبصرے بھی خاصے وزن دار تھے اور سونیا خان اور کنزہ ملک بھی بہت منفرد مگر جامع الفاظ و انداز کے ساتھ پڑھنے کو ملیں۔ ان سب کو درجہ بہ درجہ سلام اور نیک دعاؤں کے نذرانے قبول ہوں۔ محترمہ سدرہ انور علی کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت کاملہ اور عمر خضر عنایت کرے آمین۔

☆: پیارے بھائی! کہانی پڑھ کر ہی کوئی رائے دے سکیں گے۔ فی الحال تو ہمیں یہ بتا دیں کہ محبتوں پر سے اپنا یقین ختم کر لیں؟؟ اتنے زمانے بعد آئے تو بھی اپنی ہی بات کی۔ کیا ہمیں آپ پر سے استحقاق بھی ختم کر لینا چاہیے۔ وعدہ کریں کہ ہر ماہ آمد کو مستقل بنائیں گے۔

✉: لاہور سے ہماری بہن حنا بشریٰ لکھتی ہیں۔ طویل کہانی نمبر 2 ہر لحاظ سے نمبر ون تھا۔ اس بار تمام کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ شمارے پر تبصرے سے پہلے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ سدرہ انور علی کی بیماری کا جان کر دل بہت غمگین ہوا۔ یقین نہیں آ رہا کہ اتنی پیاری لڑکی اتنی زندہ دل اتنی بیمار ہے۔ اللہ تمھیں ہر بلا سے بچائے تمھیں زندگی اور صحت عطا فرمائے تاکہ تم یونہی خوشیاں بانٹو اور خوش رہو۔ میری تمام لکھنے والوں اور پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ ہر نماز کے بعد سدرہ انور علی کے لیے خصوصی دعا کریں اب رسالے پر تبصرہ ہو جائے۔ بھیا طویل کہانی نمبر شائع کر کے آپ نے ان لوگوں کا شکوہ دور کر دیا ہے جو طویل کہانی لکھنا اور پڑھنا چاہتے تھے۔ منزہ سہام صاحبہ نے بالکل صحیح فرمایا ہے پہلی بارش کا پہلا قطرہ ابرِ رحمت میں بدل جائے اور ہمارے ملک کی سرزمین دہشت گردوں کے ناسور سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے آمین۔ اک دیا جلتا ہے، انگاروں پہ رقص، اناڑی، پرفیکٹ لائف بہترین کہانیاں تھیں۔ نوشابہ نوش کی تحریر وہ سات دن لاجواب تھی۔ شمارے کی تین کہانیاں بہت خوب صورت تھیں۔ طاہرہ اشفاق کی عشق عالی نصیب، نادیہ ملک کی سفر لمحوں کا، فرزانہ نگہت کی انجانے میں یہ تینوں بہت خوب تھیں۔ نادیہ ملک نے تو کمال کر دیا ہے۔ بہت زبردست ان تینوں نے مجبور کر دیا کہ میں خط میں ان کا خصوصی ذکر کروں۔ خانہ برباد عشق، قانون خاموش ہے، منظر پس منظر، بھوک، کیسے کیسے لوگ، وہ سب کی سنتا ہے، نصیحت آموز تحریریں تھیں۔ بکا ؤ مال اور کھوٹ نے بہت غمگین کیا۔ عظمیٰ شکور کی کتنی محبت باقی ہے۔ آشنا نا آشنا، سعدیہ عابد، محلے کی بیٹی ام عادل بھی بہترین تھیں۔ سب نے بہت محنت کی آپ سب کی محنت کی وجہ سے مجھے طویل کہانی نمبر 2 تو نمبر ون لگا ہے۔ بہت خوب اللہ مزید ترقی عطا فرمائے۔ زہر عشق کے کیا کہنے۔ کرن ناز، منزل خان، عظمیٰ شکور، قندیلہ صنم خان، تانیہ راجپوت، سونیا خان، کنزہ ملک کے خطوط پسند آئے اللہ انھیں مزید خوشیاں عطا فرمائے۔ کنزہ ملک کو کامیابی پر مبارک باد۔ باقی سب کے تبصرے بھی مزے دار تھے۔ سعدیہ بھٹی کی شاعری اچھی لگی۔ افشاں چوہدری کا حسنِ انتخاب زبردست تھا۔ ہائیڈ پارک بھی زبردست تھا۔ سب لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے لیے بہت سی دعائیں۔

☆: بہن بشریٰ! تمہاری باقاعدگی ہم سے محبت کا ثبوت ہے۔ اپنی تحریروں کی طرح تبصرہ بھی آپ نے لاجواب کیا۔ خوش رہو۔

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔



قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد......

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار......"

✉: کراچی سے ہماری بہن سیمیں غزالہ۔نہاں لکھتی ہیں۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ سچی کہانیاں کا طویل کہانی نمبر بھی آ رہا ہے۔ غفلت مجھ سے ہی ہوئی...... میں نے دھیان نہیں دیا ہوگا یا میں بھول گئی...... ورنہ میں بھی کوئی طویل کہانی بھیج دیتی۔ میں تو اس ڈر سے طویل کہانیاں نہیں لکھتی کہ شاید طوالت کی وجہ سے آپ شائع نہ کریں۔ میرے پاس ایسے بہت سے واقعات ہیں جس پر طویل کہانی لکھی جا سکتی ہے۔ بہرحال یہ طویل کہانی نمبر بہترین تھا۔ لکھاریوں نے بہت اچھے اور اچھوتے موضوع پر بہترین کہانیاں لکھی ہیں۔ کاشی صاحب آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ قاریوں کو بہترین کہانیاں پڑھوا رہے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ لوگ اب پڑھنے سے غافل ہو گئے ہیں۔ اچھا مواد بھی تو ملے۔ اس کا ثبوت سچی کہانیاں ہیں۔ اس دفعہ اپریل کا شمارہ 29 تاریخ کو ہی مل گیا۔ حسب معمول سب سے پہلے میں نے اپنا نام دیکھا یہاں سے مایوس ہو کر منزہ صاحبہ کی تبدیلی نوٹ کی اور دل سے ان کی تحریر کو داد دیتے ہوئے احوال میں شریک ہوئے۔ اپنے خط کا جواب دیکھ کر مسرور بھی ہوئے۔ اس کے بعد لائف بوائے کی کچھ نئی اور انوکھی خوبیوں کو سراہنے پر مجبور ہوئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جناب عبدالغفار عابد صاحب کی کہانی 'یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے' پڑھ کر بے اختیار ان کو داد دینے کا دل چاہا۔ کیا خوب صورت تحریر ہے۔ دل پر بڑا اثر ہوا۔ میرا پسندیدہ موضوع روحانیت ہی ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر اللہ پر توکل اور ایمان اور زیادہ مضبوط ہوا۔ جنت تو واقعی جنتی تھی۔ صبر و شکر اخلاق و اخلاص کا مجموعہ جنتی عورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ جنت جیسے اوصاف اپنا کر کوئی بھی عورت جنت کی حقدار ہو سکتی ہے۔ مذہب کو پوری طرح نہ سمجھنے والے اس کہانی کو محض افسانہ سمجھیں گے۔ مگر مجھے اس کی صداقت کا یقین ہے۔ عبدالغفار صاحب آپ کو اتنی اچھی اور سبق آموز کہانی لکھنے پر بہت بہت مبارک باد۔ اس دفعہ ہر کہانی نے بڑا متاثر کیا...... یہ طویل کہانی نمبر تو سب نمبروں پر سبق لے گیا۔ اللہ کرے لکھاریوں کا زور قلم اور زیادہ اور اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو بھی قبول منظور فرمائے۔ ہر کہانی اپنی جگہ بہترین ہے۔ 'بس تم ملے' تھوڑا سا ڈرامائی سی لگتی ہے۔ لکھنے کو تو بہت دل چاہ رہا ہے مگر پھر وہی طوالت کا خوف ہے۔

☆: بہت پیاری تسیمیں جی! اب دیکھیے کہ آپ کے تبصرے کی ہم کہاں تک کانٹ چھانٹ کر سکے۔ محفل میں آمد مستقل بنائیں آپ۔

✉: بفرزون، کراچی سے زمانوں بعد ہماری ایک بہت پیاری سی بہن ثمر احمد کی مختصر حاضری ہے۔ لکھتی ہیں۔ میں کئی سال بعد دوبارہ سچی کہانیاں میں شامل ہوتے آئی ہوں، آخری تحریر عشق آشنا شائع ہوئی تھی۔ امید کرتی ہوں آپ پھر سے مجھے جگہ دیں گے ماہنامہ سچی کہانیاں کے لکھنے والے نئے پرانے سب ہی بہت بہترین ہیں۔ میں اپنی ایک تحریر ارسال کر رہی ہوں معیاری ہو تو ضرور شائع کیجیے گا۔ انتظار رہے گا۔

☆: ارے ثمرہ جی یہ کیا! اپنی کہی اور بس چل دیے۔ اتنے دنوں بعد آئی تھیں تو تھوڑا سا اگر پرچے پر تبصرہ بھی کر دیتیں تو......

✉: شائلہ شہزادی کوئٹہ سے یہ پہلی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ میں سچی کہانیاں کی مستقل قاری ہوں۔ ہم شکل اور زہر عشق نے رسالے کو چار چاند لگا دیے ہیں تمام سلسلے اچھے ہیں کہانیوں کا ذکر کرنا مشکل

سانحۂ ارتحال

ہماری ساتھی لکھاری شانی خامان کے والد محترم طویل علالت کے باعث گزشتہ ماہ ذی میں کارزق ہوئے۔ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور مرحوم کے اعلیٰ درجات کے لیے دعا گو ہے اور لواحقین کے لیے صبر کی استدعا ہے۔

ہوگا کہ ابھی صرف یہ ہی دو کہانیاں پڑھی ہیں۔تیرنیم کش کے ونر کا اعلان کیسے کرتے ہیں۔اپنی ایک نظم بھیج رہی ہوں قابلِ اشاعت ہو تو ضرور چھاپیے گا۔میں نے کہانی بھی لکھی ہے بتائیے گا کہ قابل اشاعت ہے کہ نہیں۔اور ایک بات اور۔کیا کہانی کا بالکل سچا ہونا ضروری ہے یا مشاہدات کو بھی زبان دے سکتے ہیں۔اب اجازت چاہتی ہوں تمام اسٹاف کو سلام۔انشاءاللہ جلد حاضری دوں گی۔

☆: اچھی شمائلہ! خوش آمدید! کہانی گہرے مشاہدے کے بعد ہی وجود میں آتی ہے۔امید ہے تم سمجھ گئی ہوگی۔باقی اب آ گئی ہو تو ہر ماہ احوال میں حاضر رہنا۔

✉: فیصل آباد سے ہمارے نئے احوالی ساتھی محمد شعیب عرض گزار ہیں۔سچی کہانیاں کی محفل میں دوسری بار شرکت کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ویسے میرے خیال سے باقاعدہ طور پر یہ میری پہلی شرکت ہوگی کیونکہ آپ نے جو اپریل کے شمارے میں میرے دو چار جملے شائع کیے تھے۔مجھے اچھا لگا اور جتنے اچھے الفاظ میں آپ نے تھوڑی سی سرزنش کی۔وہ تو پڑھ کر چہرے پر مسکراہٹ ہی آ گئی۔اسی لیے یہ جامع خط لکھ کر بھیج رہا ہوں۔آپ نے شکوہ کیا تھا ناں کہ کہانیوں کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں۔نہ اچھا نہ برا...... تو جناب بندہ حاضر ہے لیکن میں پہلے ہی کہہ دوں مجھے تبصرہ کرنا بالکل بھی نہیں آتا۔صرف اچھا ہے یا برا ہے سے ہی کام چلانا پڑے گا۔تو سب سے پہلے تبدیلی کی طرف آتے ہیں۔چونکہ سیاسی موضوع تھا۔اس لیے میں کچھ نہ کہوں گا۔احوال کی دنیا میں سب کے خط لاجواب تھے۔اسماء اعوان کا لائف بوائے بہت اچھا رہا۔اس کے علاوہ پتھر میرا نصیب اور بادبان کہانیاں اچھی لگیں۔شعبان کھوسہ نے ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھا۔میرے خیال سے سب سے اچھی کہانی بھی انہی کی تھی۔باقی کہانیاں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔اور آخری بات...... کیا میں سچی کہانیاں کے لیے اپنی تحاریر کو ای میل بھی کر سکتا ہوں کیونکہ مجھے ٹائپ کرنا تحریر کرنے سے زیادہ آسان لگتا ہے۔ہاتھ سے لکھنے کے مقابلے میں۔

☆: اچھے شعیب! تبصرے کا شکریہ۔تم بالکل اپنی تحریر کو ای میل کر سکتے ہو۔اس ماہ کا تبصرہ کہاں ہے جناب؟

✉: کراچی سے ہماری بہن مومینہ بتول لکھتی ہیں۔طویل کہانی نمبر ملا پڑھا۔خدا آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے آمین۔احوال میں سب سے پہلا خط ضرور شائع کیا مگر میرے نام کے ساتھ رضا اضافہ کر دیا گیا خیر کوئی بات نہیں۔(سوری آپی) کاشی اس مرتبہ تو آپ کا ناول ہی سبقت لے گیا پڑھ کر جی چاہا کہ فوراً دوسری قسط مل جائے مگر صاحب اس کے لیے مہینے بھر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ویل ڈن بہت اچھا موڑ لیا ہے آپ نے۔چاچی بانوری تو اب قصہ پارینہ بن گئی ہے۔

☆: مومینہ آپی! انشاءاللہ جلد زرینہ کی شادی کی کوریج شامل ہوگی۔باقی ہماری اپنی بہن سے بھلا کیا ناراضگی۔چاچی بانوری بس آیا ہی چاہتی ہے۔

✉: داؤد احمد خان، بورے والا سے لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی میں کافی عرصہ سے ماہ نامہ سچی کہانیاں اپنے بھائی افضل آزاد کے ساتھ مل کر پڑھ رہا ہوں۔ اس دفعہ طویل کہانیاں نمبر آیا۔ مجھے بہت زیادہ اچھا لگا۔ آپ کی محنت کو سراہتا ہوں۔ سب سے پہلے منزہ سہام کی تبدیلی پڑھی جو کہ ایک بہت اچھا موضوع تھا۔ احوال میں کچھ نئے اور کچھ پرانے ساتھی تھے۔ جس میں ارم خان، سیمی غزالہ، ممتاز احمد، خالد یوسفی، علی حسنین تابش، سدرہ انور علی، افضل آزاد، ملک علی رضا ان کا احوال بہت اچھا تھا۔ اسٹوریوں میں نزاہت جبیں ضیاء، پکا پھل، عبدالغفار عابد کے فیصلے، ایم اے راحت، ہم شکل، زہر عشق، کاشی چوہان بہت اچھی اسٹوریاں ہیں۔ کاشی چوہان آپ کا ناول کب مکمل ہو رہا ہے؟ کہاں بیٹھ کر لکھتے ہو آپ؟ ہائیڈ پارک، جواد انور، شاہانہ احمد، ندیم عباس میواتی، احمر عبدالغنی نے بہت اچھا لکھا ہے۔

☆: بھائی داؤد! سب کچھ آپ سب لوگوں کی محبت ہے اور کچھ نہیں۔ اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✉: خضر حیات، روڑہ تھل سے عرض کرتے ہیں۔ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ایک خوب صورت اور دلکش سرورق کے ساتھ 4 مئی کو مل گیا۔ شمارہ بہت اچھا اور زبردست تھا۔ شمارہ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک بھرپور تھا۔ سب کہانیاں بہت زبردست اور سپرہٹ تھیں۔ لیکن مجھے چار کہانیاں بہت ہی بہت اچھی لگیں۔ ان میں ندیم عباس میواتی کی ''بکاؤ مال'' اقبال بانو کی ''اک دیا جلتا ہے'' ریاض حسین شاہد کی 'انگاروں پر رقص' فرزانہ نگہت کی ''انجانے میں' باقی کہانیاں بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔ تیر نیم کش میں سب اشعار بہت بہت اچھے تھے لیکن اپنا شعر نہ پاکر افسردگی ہوئی۔ پیارے کاشی صاحب میں نے شعر بھیجا تھا وہ اب تک نہیں لگا۔ پلیز کچھ تو خیال کریں۔ آپ نہیں تو کون ہمارا ہے جو خیال رکھے گا۔ ہائیڈ پارک میں سب تحریریں بھی بہت عمدہ، اچھی اور زبردست تھیں۔ اپنی غزل دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ میں اپنے پیارے دوست یاسر وکی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے مجھے اپنے خط میں یاد کیا اور میرے کلام کو پسند کیا۔ میری دعا ہے کہ سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ آمین۔

☆: اچھے خضر! تمہاری غزل لگادی اور تم شعر پر افسردہ ہو! کچھ تو خیال کیا کرو۔ اور ڈیئر تمہارے بھیجے مراسلے وغیرہ تو اکثر ہم لگاتے ہی ہیں۔ بے جا گلہ رنجشیں پیدا کرنا ہے پیارے۔ تبصرہ بہتر تھا۔ خوش رہو۔

✉: بورڑی شریف سے ملکہ احوال کی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ اب کی بار سرورق کچھ بھایا نہیں سوری آمنہ جی۔ ہیئر اسٹائل اور میک اپ بالکل پسند نہیں آیا۔ اداریہ 'بارش کا پہلا قطرہ' اور کاشی بھیا کی دعا پہ پرآمین کہا۔ میڈم قینچی جی اب آپ تو تکلیف اٹھانی نہیں پڑے گی۔ کیا فائدہ اتنی محنت اور مغز ماری کا جو قینچی اور ہمیں بھی گراں گزرے، اس سے بہتر خاموشی بھلی ہے۔ اب بڑی پیاری لگ رہی ہو سکون سے بیٹھی قینچی جی! اور کسی کی بے سکونی وجہ بننا ہمیں ہرگز گوارا نہیں۔ نیک تمنائیں آپ کے نام۔ اب احوال سن لو ظالمو! ایک شام ہمارے ساتھ۔ مگر ہم، تو نہیں تھے ناں چلو جی سب کی تصویریں ہی دیکھ کر ساتھ ہونے کا تصور کر لیتے ہیں۔ بڑی پیاری لگی یہ شام ماشاءاللہ سلامت رہو۔ فیصل ندیم اور

نبیل جاوید بھائی بہت ممنون ہوں تبصرہ پسند کرنے پہ خوش رہیے۔ اور منزل خان جی آپ کا بھی بہت شکریہ۔ یاد کر لیتی ہیں۔ بیٹا کیسا ہے اب آپ کا؟ اپنی شہزادی سدرہ کا خط اس قدر غمگین تھا کہ کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ حوصلہ رکھو جانی اللہ سائیں سب اچھا کرے گا انشاء اللہ ہر دم تمہارے لیے دعا گو ہوں۔ بہت اداسی ہے سدری۔ اب تو خط لکھنے کو دل بھی نہیں کرتا، بس تمہارے لیے آجاتی ہوں۔ اللہ پاک تمہیں صحت یاب، لمبی زندگی سے نوازے آمین ثمہ آمین۔ تمام نئے احوالیوں کو محفل میں خوش آمدید۔ کہانیوں میں 'قانون خاموش ہے' انگاروں پہ رقص' اس نے کیوں کیا' بکاؤ مال' تو نہیں تھا ناں' پتا نہیں' کیسے کیسے لوگ' ہیں جن میں 'کھوٹ' بھری ہوئی ہے۔ بس جی 'محلے کی بیٹی' کسی 'اناڑی' کا 'سفر لمحوں کا' 'زہر عشق' میں 'کتنی محبت باقی ہے' محبت کی 'بھوک' میں مگر وہ سب کی سنتا ہے' ضرور سنے گا۔ سب کی محنت رنگ رہی اور کہانیاں عمدہ پیش کی گئیں، تمام لکھاروں کو مبارک باد۔۔

☆: پیاری تحسین! جیتی رہو۔ بچے تم اور قینچی...... چہ چہ چہ...... یہ کیسے سوچا۔ تم تو ہم سب کی چہیتی ہو! احوال کی ملکہ ہو۔ اور اس لیے قربانی بھی دینا پڑے گی۔ اس بار تم نے خط بہت جامع لکھا قینچی نے بھی O.K کر دیا۔ خوش رہو۔ سدرہ کے لیے ہم سب بھی دعا گو ہیں۔

✉: ملازم حسین شیرازی، کوہاٹ سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں۔ مئی کے جریدے میں میرا خط اور کہانی کی موجودگی نہ صرف آپ کی مرہون منت ہے بلکہ میری حوصلہ افزائی ہے۔ آنکھوں کو بھاتا ہوا خوب صورت سرورق سانولی سلونی دوشیزہ سات رنگوں کی کہکشاؤں کے احاطے میں سوچوں میں غلطاں بھلی نظر آرہی ہے۔ بارش کا پہلا قطرہ، منزہ سہام، وطن عزیز میں نئی تبدیلیاں نئے تجربات ...... خدا کرے صدیوں کے پسے مظلوم عوام ان کے ثمرات سے بہرہ مند ہوں۔ اناڑی از قلم، اقبال چنہ، واردات میں سپنس اور نئی ٹیکنالوجی نہیں پھر بھی دلچسپی کی حامل کہانی تھی۔ محلے کی بیٹی، ام عادل، اک دیا جلتا ہے، اقبال بانو کی، نافرمان اولاد دنیا میں بھی ذلیل ہوتی ہے۔ آخرت میں بھی بخشش، خدا جانے عمدہ تحریر لگی۔ کھوٹ' ارم ناز، تربیت کا فقدان ہو۔ گھریلو حالات سے چشم پوشی ہو تو بربادی مقدر بن جاتی ہے۔ ہمیشہ کی طرح اچھی تحریر 'بھوک' اعجاز احمد فکرال، حقیقت سے پردہ اٹھاتی عبرت ناک کہانی۔ بہت عمدہ۔ کتنی محبت باقی ہے۔ عظمیٰ شکور، اچھا سبق دیتی عمدہ کہانی، بکاؤ مال' محمد ندیم عباس میواتی' فکر انگیز کہانی تھی۔ زرد لومڑی' ایم اے راحت...... سلسلہ کی اٹھان دلچسپ ہے۔ 'زہر عشق' کاشی چوہان' ڈر' خوف' اسرار اور عشق کو یکجا کیا جائے تو زہر عشق تخلیق ہوتا ہے۔ تحریر کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے الفاظ کہاں سے لائیں؟ بہت شاندار ہے باقی کہانیاں بھی بہت اچھی ہیں۔ بہت خوب احوال نامے، خطوط میں کرن ناز نے خوب تبصرہ کیا، ملک صفدر اعوان، تحریر بہت موثر ہے۔ حنا بشریٰ، جاندار تبصرہ کرتی ہیں۔ سدرہ انور علی، اللہ پاک آپ کو صحت دے۔ مدتوں اپنی آمد سے قارئین کو مستفیض فرماتی رہیں۔ آپ کی شرکت تقویت کا باعث بنتی ہے۔ ہماری دعائیں ساتھ ہیں۔ ذرینہ جونیجو، تحسین جونیجو، ماشاء اللہ آپ دونوں شہزادیوں کے خطوط، تبصرے، اپنے دامن میں بہت دلچسپیاں سمیٹے ہوئے ہیں۔ اللہ سلامت رکھے۔ عظمیٰ شکور، تبصرہ بہت شاندار ہوتا ہے۔ تحریر میں چاشنی ہوتی ہے اللہ پاک آپ کے قلم میں اتنی طاقت دے جو دوسروں کے لیے مشعل راہ ہوں۔ فیصل ندیم بھٹی، آپ کی احوال میں باقاعدہ حاضری سے بہت حوصلہ ملتا ہے۔ مجید احمد جائی، اتنا مختصر خط بھی نہ لکھا

کریں کہ اس میں ناراضگی کا عنصر شامل دکھائی دے۔ صائمہ مجید بھابی آپ مجید صاحب کو شاید زیادہ نہ بولنے دیتی ہوں گی لیکن ان کی تحریر پر تو پابندی نہ لگائیں کہ چار لائن میں خط ختم ...... جوڑی سلامت رہے۔ نازیہ بتول رضا، نبیل جاوید، علی حسنین تابش، کنزہ ملک، منزل خان، آپ سب کے خطوط تحریریں جریدے کو چار چاند لگاتی ہیں۔ سونیا خان، آپ کے خوب صورت خط کو ایڈیٹر صاحب نے آخر میں شائع کر کے نہ صرف آپ کو بلکہ ہمیں بھی تھوڑا رنجیدہ کر دیا۔ جیتی رہو۔ (آپا ہی سب سے آخر میں تھا) باقی ممتاز احمد، مجید احمد جائی، جاوید راہی، ملک محمد اکرم آهیر، سنبل صاحبہ، فیصل ندیم بھٹی کی کہانیاں موجودہ جریدے میں تلاش کرتے رہے۔ آپ سب کی غیر حاضری اچھی نہ لگی۔ آئندہ خیال رہے سب کی خدمت میں سلام۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، مسئلہ یہ ہے، سب شاندار ہیں۔ کاشی چوہان صاحب آپ کی محنت، لگن مدیرہ اعلیٰ کی سرپرستی اسٹاف کی جانفشانیاں قابلِ تحسین ہیں۔ جو قارئین کے منتشر اور اداس ذہنوں میں انرجی اور نئی طاقت وحوصلہ پیدا کرتی ہیں...... سب لکھاریوں...... قارئین اسٹاف ممبران کو سلام۔ اجازت دیں۔ پھر ملاقات ہوگی۔ انشاء اللہ۔

☆: پیارے بھائی ملازم حسین شیرازی! آپ کے پاس سے پچھلے ماہ پرچہ واپس آ گیا تھا۔ خیریت تو تھی نا۔ اور کہانیاں گاہے بگاہے شائع ہوتی رہیں گی۔ خوبصورت تبصرے کے لیے شکریہ۔

✉: لڈن، وہاڑی سے ہمارے بہت پیارے بھائی منشی محمد عزیز مئے ایک طویل عرصے بعد اپنی جائز شکایات کے ساتھ احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ایک طویل مدت کے بعد آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ منزہ باجی آپ کو میرا نام تو یاد ہوگا ہی۔ 1998ء سے سچی کہانیاں میں میرے خطوط لگنا شروع ہوئے اور پھر غالباً جنوری 99ء کے سچی کہانیاں میں میرا مختصر انٹرویو بھی شائع ہوا۔ اس کے علاوہ میری متعدد کہانیاں، سچی کہانیاں کے صفحات پر شائع ہوتی رہیں۔ 2002ء میں بھی میری تحریر لگی تھی اور پھر اس کے بعد میں گردشِ زمانہ کے ساتھ سچی کہانیاں سے دور ہو گیا۔ اس وقت بھی بقول آپ کے ''عزیز! آپ کی متعدد کہانیاں منتخب ہو چکی ہیں، جو کہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں گی۔'' پھر دوبارہ 2013ء کے آخر میں جب سلیم فاروقی صاحب چلے گئے اور کاشی چوہان صاحب کو ایڈیٹر بنا دیا گیا تو اس وقت سے دوبارہ رابطہ برقرار ہے۔ اس ساری تمہید کا مقصد آپ کو محض یہ بتانا درکار ہے کہ مارچ 2014ء میں، میں نے سچی کہانیاں کا زرسالانہ جمع کروایا تھا اور اپریل سے مجھے پرچہ ملنا شروع ہوا تھا۔ اپریل 2015ء سے شروع ہونے والی سالانہ مدت دسمبر 2015 میں کیسے ختم ہوگئی؟؟ دیگر احوال یہ کہ کاشی چوہان سے ہمیں کوئی گلہ نہیں بلکہ ان کے خلوص اور محبت کے سامنے مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوتی ہے جب وہ پیار بھرے لہجے میں خطوط اور کہانیاں باقاعدگی سے بھیجنے کا وعدہ لیتے ہیں اور لیکن ناگزیر وجوہات کی بنا پر اپنے وعدے وفا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے میں کاشی چوہان کے ساتھ آپ سے بھی معذرت خواہ ہوں، دو دیگر میرے لائق کوئی حکم ہو تو میں حاضر ہوں۔

☆: بھائی عزیز! سلامت رہو! آپ کی ساری شکایات جائز ہیں۔ منزہ جی نے از خود اس بات کا نوٹس لیا ہے۔ پرچے سے جڑا ہر فرد ہمارا اپنا ہے۔ اب خاطر جمع رکھو اور ہاں اب پورا سال آپ کو پرچہ ملتا رہے گا۔ اور ہمیں بھی ہر ماہ تبصرہ ملتا رہے۔ آپ کی محبت کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔

✉: ڈیرہ غازی خان سے ایک عرصے بعد ہمارے لکھاری ساتھی ایم یعقوب احمدانی احوال کا

ایک بہت خاص آپ بیتی

لاہور کی جیل میں سزائے موت کی سزا کاٹنے والے اُس قیدی کی زندگی کے شب روز جو اسے ایک معصوم انسان سے مجرم بننے پر مجبور کر گئے۔ اُس قیدی کی داستانِ عبرت جس میں آہیں بھی ہیں...... سسکیاں بھی ہیں محبت اور نفرت کے رنگ بھی...... بہت جلد رانا حبیب الرحمٰن کے قلم سے ایک آتش فشانی سچی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے۔

حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ جناب آپ نے فروری میں میری اسٹوری کو جگہ دی جس کا بہت بہت شکر گزار ہوں۔ بہت سے دوستوں نے کہانی کو پسند کیا۔ ممتاز احمد، شعبان کھوسہ، عبدالغفار عابد، راشد بھائی، ایم ظفر اللہ، اللہ دتہ صاحب، نیاز احمد، رمضان پریمی، دین محمد بلوچستان، رابعہ، فرح انیس، شوکت لیہ، بے وس بھٹی، استاد لیاقت، آر جی رستم احسان، محمد شہزاد لیہ، محمد شہزاد پاک پتن، محمد کاشف کمال، نجف علی، عبدالستار تبسم صاحب، غلام شبیر ماموں، محمد اسماعیل، اسد، جمشید عبداللہ اور سبھی احوالی جنھوں نے پسند کیا تھا۔ سبھی کا شکریہ اور میرے پیارے کزن سپاہی محمد عاصم لعل احمدانی صاحب آپ نے بہت عزت دی اور کڑی دھوپ میں مجھے سپورٹ کیا زندگی بھر آپ کی قدر رہے گی اور ارم ناز اور پیاری فرح انیس جی کیسی ہیں آپ؟ اور آپ کی اسٹوریز بہت پیاری تھی۔ ارم خان اور سدرہ انور علی سلام قبول ہو۔ منعم اصغر، یوسف لغاری بڑے بھائی ممتاز احمد صاحب آداب عرض۔ کاشی ناراضگی نہیں چلے گی کچھ وقت کی تلخی نے مجبور کر دیا جو احوال میں حاضری نہ دے سکا اور آپ کی محبت خلوص کو سلام کہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھا اور نوک پلک سنوار کے جگہ دی اور سبھی لکھنے والوں اور نئے دوستوں کو ویلکم سچی کہانیاں سے دوری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بس کبھی کبھی انسان نہ چاہتے ہوئے بھی دور ہو جاتا ہے۔ ہماری بہت پرانی رائٹر شفق شہزادی آپ کی دوستی اور محبت کو خراج تحسین اور کاشی جی اب اجازت انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی۔

☆: پیارے یعقوب! ہم تم سے کب ناراض تھے۔ تم خود ہی لیٹ لوٹ کر آئے ہو۔ ہاں اب اگر ہم سے دور ہوئے تو واقعی ہم ناراض ہو جائیں گے۔

✉: چک نمبر 58 شمالی، سرگودھا سے ہمارے پیارے ساتھی فیصل ندیم بھٹی عرض گزار ہیں۔ ماہ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2، یکم مئی کو ملا۔ ٹائٹل میں لڑکی زلفیں بکھیرے کسی سوچ میں گم دکھائی دی۔ اشتہارات کو دیکھتے ہوئے منزہ سہام مرزا کے اداریے پر پہنچا۔ بارش کا پہلا قطرہ۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور میں پُر امید ہوں کہ انشاء اللہ جلد ہی مکمل طور پر ملک پاکستان سے دہشت گردی کا خاتمہ ہو جائے گا اور پورے ملک میں امن کی فضا قائم ہوگی۔ احوال میں سب سے پہلے سید ملازم شیرازی کا خط پڑھا جو کہ اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ براجمان تھے۔ قندیلہ صنم خان، قاسم خان، نبیل جاوید کے تبصرے بہترین تھے۔ خالد یوسفی، مجید احمد جائی، ممتاز احمد، عزیز مئے کو سلام۔ کنزہ ملک امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس خوشی میں ملتان کے سوہن حلوے سے منہ میٹھا کرانا تو بنتا ہے ناں۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ اسماء اعوان کی کہانی لائف بوائے، مس

ملیحہ واہ جی واہ، لائف بوائے شیمپو کا تو کمال ہے۔ اقبال بانو، اک دیا جلتا ہے، انگاروں پہ رقص، ریاض حسین شاہد، اناڑی، اقبال چنہ، حیران کر دینے والی کہانیاں ہیں۔ پرفیکٹ لائف، نسیم سحر واقعی پرفیکٹ کہانی ہے۔ عشق عالی نسب، طاہرہ اشفاق، سفر لمحوں کا، نادیہ ملک، انجانے میں، فرزانہ نگہت کی شاندار کہانیاں ثابت ہوئیں۔ خانہ باد عشق میں عورت کی مکاری نے سب کچھ بدل ڈالا۔ ایم اے راحت کا زرد لومڑی، انتقام کی پہلی قسط آغاز میں ہی دلچسپی کا سامان پیدا کر رہی ہے۔ بکا ؤ مال، ندیم عباس میواتی، کرن شبیر، منظر پس منظر کی زبردست کہانی رہی۔ اعجاز احمد فگرال کی بھوک۔ کھوٹ ارم ناز کی بھی بہت خوب رہیں۔ کاشی چوہان کا ناول، زہر عشق کی قسط نمبر 15 کاشی بھیا ناول دلچسپی سے مزین ہے اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے آپ کے ناول کا۔ مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک میں ممتاز احمد کی غزل بہت پسند آئیں۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت وسلام۔

☆: پیارے فیصل! خوش رہو پرچے سے تمہاری محبت تمہاری باقاعدہ حاضری سے ظاہر ہے۔ تمہاری کہانی بھی بس بہت جلد شائع ہونے والی ہے۔

✉: خان پور سے سپاہی محمد عاصم لعل احمدانی کی احوال میں پہلی بار آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ جناب میں پہلی بار احوال کا حصہ بن رہا ہوں اپنے پیارے کزن ایم یعقوب احمدانی کی اسٹوری فروری کے شمارے پڑھی جس کی تعریف بیان نہیں کر سکتا۔ بہت خوشی ہوئی پہلی ہی نظر میں پرچہ دل میں اتر گیا۔ سر ٹائم تھوڑا ملتا ہے، میں آرمی میں سپاہی کی پوسٹ پر ہوں کراچی میں ڈیوٹی ہے۔ ٹائم کم ہونے کی وجہ سے تھوڑا دور رہتا ہوں انشاء اللہ اب آپ کی محبت و پیار سے حاضر ہوتا رہوں گا۔ اس پرچے میں بھی لکھنے والے بہت محنت اور جوش سے لکھتے ہیں۔ اسٹوریاں اچھی ہوتی ہیں۔ سچی کہانیاں کی محفل میں اپنے پیارے کزن ایم یعقوب احمدانی کو سامنے دیکھ کر مجھے بھی آپ کی محفل میں حاضر ہونے کا شوق اس لیے آپ کے سامنے ہوں۔

☆: پیارے عاصم! خوش آمدید چلو بھلے سے کوئی بھی احوال میں لانے کا سبب بنا۔ مگر تم آئے تو......اب امید ہے کہ تم ہم سے دور نہ رہ سکو گے۔ اگلے ماہ تمہاری آمد کا انتظار رہے گا۔

✉: سلیمان شبیر، اکوال، تلہ گنگ سے دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد احوال میں شامل ہیں۔ لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے معذرت کہ کچھ مصروفیات کی وجہ سے حاضری نہیں دے سکا۔ ماہ مئی کا شمارہ یکم مئی کی صبح ملا۔ سب سے پہلے منزہ آنٹی کا ''بارش کا پہلا قطرہ'' پڑھا۔ اس کے بعد احوال میں سب لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ بہن سدرہ انور علی کی بیماری کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ اللہ پاک اپنا خصوصی فضل و کرم بہن سدرہ پر فرمائے اور انھیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ احوال میں سب کے تبصرے خوب تھے۔ اسماء اعوان، لائف بوائے۔ میں ایک منفرد کہانی لے کر آئیں۔ اس ماہ کی سب سے کمال اور بہترین کہانی 'اک دیا جلتا ہے' اقبال بانو کی تھی۔ کہانی نے شروع سے لے کر آخر تک اپنے حصار میں جکڑے رکھا اور سچ ہے کہ اللہ پاک انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ اس جہاں میں ہی دے دیتا ہے۔ 'انگاروں پہ رقص' ریاض حسین شاہد، 'اناڑی' اقبال چنہ، 'وہ سات دن' نوشابہ نوش 'پرفیکٹ لائف' نسیم سحر اچھی تحریریں تھیں۔ قانون خاموش ہے' سید ملازم حسین شیرازی نے ہمارے معاشرے کا ایک اور مکروہ چہرہ سب کے سامنے پیش کیا۔ ہمارے تمام وکلاء، جج صاحبان اور سیاستدان تعزیرات دیکھتے رہے۔ کاش

وہ قرآن وحدیث سے مدد لیتے تو کوئی اچھا فیصلہ ہوتا۔ 'بکاؤ مال' ندیم عباس میواتی کی تحریر بھی بہت اچھی تھی۔ اس کے علاوہ تمام تحریریں اچھی تھیں۔ نعمان اسحاق کا 'بادبان' پوری آب وتاب کے ساتھ چل رہا ہے۔ ایم اے راحت صاحب 'زرد لومڑی' کی شکل میں ایک اور شاہ کار لے کر آئے اور 'زہر عشق' ایک حاصل مطالعہ ناول ہے جتنی تعریف کریں اتنی ہی کم ہے۔ اللہ پاک باباجی کو جزائے خیر دیں۔ آمین۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش میں بھی سب کے انتخاب اچھے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اگلے ماہ تک اجازت۔ اللہ حافظ ادارے کی ترقی کے لیے دعاگو۔

☆: پیارے سلیمان! تم آئے تو دیکھو محفل میں بھی رونق ہوگئی۔ خدا تمہیں خوش رکھے اور آلام سے دوری دے۔

✉: کراچی سے ہماری پیاری عزیز لکھاری ساتھی منزل خان لکھتی ہیں۔ سلام کاشی بھیا اور ہر دلعزیز لکھاریوں غم اور خوشی زندگی کا حصہ ہیں۔ مگر بعض اوقات زیاں اتنا شدید ہوتا ہے کہ احساسات ساتھ دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ آج خامان سسٹرز یتیم ہوگئیں۔ میرے جان سے عزیز نانا جان ''خامان خان'' جنھیں میں پیار سے بابا کہہ کر پکارتی تھی۔ آٹھ ماہ کی شدید علالت کے بعد خالق حقیقی سے جاملے۔ اللہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور میری نانی کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے جو ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ چاروں والو بند ہیں مگر دونوں جہانوں کے مالک کے اشارے پر جی رہی ہیں۔ اللہ ان کے لواحقین کو صبر عطا فرمائے آمین۔

☆: پیاری منزل! تم نے اس مختصر سے نامے میں اتنے جامع انداز میں دکھ کی تفسیر بیان کی کہ آنکھیں نم ہوگئیں۔ خدا تم سب کو اس عظیم دکھ کو سہنے کی طاقت عطا فرمائے اور نانا جان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

✉: پاک پتن سے رانا شہزاد شاہین عرصے بعد احوال سے شریک ہیں۔ لکھتے ہیں۔ جناب میں پہلے بھی احوال میں حاضری دے چکا ہوں اور آج بھی کچھ مصروفیات سے وقت نکال کر حاضر ہوں امید ہے ویلکم کہیں گے۔ جناب ہر ماہ کا پرچہ اپنی مثال آپ ہوتا ہے اور ہر دوست بھائی، بہن کی قلم کا اثر ہوتا ہے جس سے پرچے سے دل لگی اور بڑھ جاتی ہے اور ہم دور نہیں جاسکتے کاشی صاحب یہ آپ کی محنت کا ثمر ہے اور سبھی لکھنے والوں کی محنت کا پھل ہے اور اپنے پیارے بھائی ایم یعقوب احمدانی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے پرچے میں آنے کی دعوت دے کر پیاری محفل کا فرد بنایا بہت بہت خوش وخرم رہو اور پرچہ ہر ماہ زبردست ہوتا ہے سبھی لکھنے والوں اور تیر نیم کش کی بہترین شاعری کو سلوٹ پیش ہے۔

☆: پیارے بھائی شہزاد! سلامت رہو! آپ کے تبصرے میں سب کچھ ہے سوائے تبصرے کے۔ امید ہے ہماری محبت اگلے ماہ آپ سے پرچے پر بھرپور تبصرہ بھی لکھوالے گی۔

✉: نزاہت افشاں مہورہ، فتح جنگ سے احوال میں شامل ہیں۔ لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی سلام عقیدت، طویل کہانی نمبر میرے سامنے ہے۔ 'بارش کا پہلا قطرہ' واہ کیا بات ہے، احوال میں ملازم حسین شیرازی، صفدر عباس اعوان، علی رضا، حنا بشریٰ، حسن نظامی، سعدیہ بخش، خالد یوسفی، مومنہ بتول، منزل آپی، صائمہ مجید سسٹر مبارک کہ آپ کا تبصرہ مجید بھائی سے جیت گیا ہے۔ مجید بھائی ہماری

بھابی جیت گئی ہیں آپ سے۔ ایم اے راحیل بہت خوب۔ سونیا خان تبصرہ شان دار تھا آپ کا۔ مریم ملک اور فیضان خورشید بہت بہت خوش آمدید اور دیدہ و دلِ فرشِ راہ کیے آپ کے لیے جناب۔ قندیلہ صنم بہن لکھیں حوصلہ افزائی تو بہت ہوگی نا جب آپ لکھیں گی۔ ڈھیر ساری دعائیں آپ کے لیے اور اپنی ایلڈر سسٹر فرح انیس کے لیے ویسے فرح آپی آپ کا یوں غائب ہونا ہمیں بالکل اچھا نہیں لگتا۔ کاش کاشی جی غیر حاضری پر جرمانہ شروع کر دیں۔ کہانیوں میں 'اک دیا جلتا ہے' وہ سات دن' سفر لمحوں کا' بکا ڈمال' وہ سب کی سنتا ہے' بہترین کہانیاں تھیں مگر بہت ہی ٹاپ اور سبق آموز کہانی تھی کرن شبیر آپی کی۔ ہمارے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ جب ہم مسلمان ہی اپنی عزتوں کو روند رہے ہیں تو پھر ہم میں کیوں اور کیسے کوئی محمد بن قاسم، محمود غزنوی یا صلاح الدین ایوبی پیدا ہوگا؟ محلے کی بیٹی بھی عمدہ تحریر تھی۔ کیسے کیسے لوگ اچھی کہانی تھی۔ کاشی بھائی پیپر ختم ہو گئے۔ اب کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا مگر کالج والے بھی جان نہیں چھوڑتے نا۔ آخر میں یہ سب کو سلام اور ہاں اس ماہ کو عظیم شاعر مومن خان مومن کو دنیا سے رخصت ہوئے 164 سال بیت گئے۔ ان کے لیے اور 10 جون کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا 131 واں یوم پیدائش ہوگا۔ اردو ادب کے اِن عظیم اساتذہ کے لیے فاتحہ کی درخواست ہے۔

☆: بہت عزیز نزاہت! انشاء اللہ خدا تمہیں بہت اچھے نمبروں سے کامیاب کرے گا۔ تمہاری محبت کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں۔ جلد کچھ لکھو ورنہ ہم بھی جان نہیں چھوڑیں گے پیارے۔

✉: خوشاب سے محمد کاشف کمال کو بھی ایم یعقوب کی محبت کھینچ لائی ہے۔ پہلی بار احوال کا حصہ بنتے ہوئے عرض گزار ہیں۔ سر میں نے آپ کے شمارے میں میرے پیارے دوست ایم یعقوب احمدانی صاحب کی اسٹوری پڑھی جو دل کو سکون دے گئی اور دوستوں سے احتیاط سے رہنے کا سبق دے گئی اور باقی سبھی اسٹوریاں بہت اچھی تھیں۔ یوسف لغاری، فرح انیس، ایم اے راحت، اسماء اعوان اور ممتاز احمد صاحب نے اچھا لکھا سبھی کو مبارک باد قبول ہو۔ میں نیا ہوں غلطیاں معاف کرنا۔ اللہ سبھی دوستوں کو محبت وتندرستی دے اور ہر حال میں اچھا رکھے۔ نیک دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

☆: بھائی کاشف! سب سے پہلے تو خوش آمدید۔ یعقوب کی محبت میں تم آ ہی گئے تو پلیز یہ محبت ہمیں ہر ماہ دکھانا۔

✉: اسلام آباد سے یہ آمد ہے ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور کی لکھتی ہیں۔ مئی کی جلتی چلچلاتی دھوپ میں...... ٹھنڈک کا احساس لیے سچی کہانیاں ملا۔ اُف! دل مسرور ہو گیا۔ سرورق پر قیامت ڈھاتی ماڈل...... واہ کیا بات ہے۔ احوال جو کھولتے ہیں تو جیسے اک ہجوم ہے۔ سب ایک ہی فکر میں ہیں کہ ایڈیٹر صاحب کو اپنی بے پناہ محبت سچی کہانیوں سے بتا دی جائے۔ آیئے اب کہانیوں کی طرف۔ میں سمجھتی ہوں کہ جتنا سچ سچی کہانیاں میں پڑھنے کو ملتا ہے شاید ہی کہیں اور ملے یہاں پر خوابوں کو چھوڑ، حقیقتوں کو لکھا جاتا ہے اور واقعی خواب تو سراب ہوتے ہیں کیوں نہ حقیقت کو ہی قبول کیا جائے۔ اقبال چنہ کی لکھی سچ بیانی، اناڑی اچھی لگی۔ یہ پہلی کہانی پڑھی جس میں موبائل کا زبردست استعمال بتایا گیا ہے۔ ورنہ آج تک موبائل کے خلاف ہی پڑھتے آئے ہم۔ وہ سات دن نوشابہ نوش گڈ! بہت اچھی اسٹوری تھی۔ اس لڑکی کی آپ نے اتنی تعریفیں کیں کہ بارہا مجھے گمان گزرا کہ تعریف کرنے والا کوئی لڑکا تو نہیں۔ معاشرے کا کڑوا سچ سات دنوں میں سمٹ گیا۔ پرفیکٹ لائف نسیم سحر کے قلم سے آزاد

جولائی 2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کررہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کریں۔

نام:____________________

مکمل پتا:____________________

____

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جولائی 2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کریں۔

عنوان کہانی:__________ تعداد صفحات:__________

نام:____________________

مکمل پتا:____________________

____

فون/سیل نمبر:____________________

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جولائی 2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان:__________ مصنف:__________

دوم، عنوان:__________ مصنف:__________

سوم، عنوان:__________ مصنف:__________

نام:__________ شہر:__________

ہونے والے لفظ اثر چھوڑ گئے اور شکریہ کہانی کے آخر میں سب خوش رہنے لگے۔ اینڈ اچھا لگا۔ طاہرہ اشفاق کمال کرتی ہیں آپ' حد کردی قسم سے۔ کیا خوب لکھا۔ ہائیڈ پارک میں گئی تو کچھ اداس ہوگئی، میں جو نہیں تھی وہاں خیر! محمد دیان خان آپ کی تحریر انوکھا اسکول پڑھ کر مسکراہٹ آئی ہونٹوں پر۔ فرح عالم واہ کیا بات ہے۔ ظالم لوگ ہیں واقعی دنیا والے۔ تیر نیم کش دیکھا تو میں یہ یہاں بھی نہیں۔ اُف! نہیں...... کانوں پر ہاتھ رکھ کر شیم آراء کی طرح چیخ مارنے کو جی چاہا۔ پھر سوچا شاید نظر کا قصور ہے۔ پھر پڑھا...... میں واقعی نہیں تو...... ایڈیٹر صاحب بس رہنے دیں آپ...... کچھ نہیں کہتی میں۔ ویسے آپ ہیں اچھے۔ اسٹوری لگانے کا تھینکس۔ بہت سارا پیار سچی کہانیاں کو بہت ساری دعائیں کراچی کے لیے۔ تو ملتے ہیں رمضان میں۔ چلیں میری طرف سے رمضان کی سب کو بہت زیادہ مبارک باد۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔

☆: پیاری عظمیٰ! سلامت رہو۔ سچی میں تمہارا تبصرہ بہت محظوظ کرتا ہے۔ تبصرہ زبردست رہا۔ مستقل آمد کا شکریہ۔ قسم سے۔

✉: بٹ گرام سے ہمارے پیارے ساتھی کاشف عبید کا برقی نامہ موصول ہوا ہے۔ لکھتے ہیں۔ اس بار شمارہ تاخیر سے موصول ہوا۔ 9 مئی کو امتحانات سے فارغ ہوئے اب ذرا شمارے پر تبصرہ ہو جائے۔ سرورق دیدہ زیب تھا۔ دو ماہ پہلے کراچی آیا تھا۔ آپ کا کراچی بہت اچھا لگا۔ اس شمارے میں مجھے ایم اے راحت صاحب کی زرد لومڑی بہت شاندار لگی۔ آپ کی زہرِ عشق کے کیا کہنے۔ ہائی ٹی کی تصویریں بہت پسند آئیں۔ طویل کہانی نمبر ون کی طرح، طویل کہانی نمبر ٹو بھی بہت خوب صورت لگا۔ بادبان اچھا جا رہا ہے۔ جبکہ محمود شام کے بھارت میں بلیک لسٹ کی تو کیا تعریف کریں۔ کمال لکھاری ہیں آپ۔ تیر نیم کش، ہائیڈ پارک اور مسئلہ یہ ہے زبردست مستقل سلسلے ہیں۔ آخر میں میری طرف سے آپ سب کو رمضان مبارک۔

☆: پیارے کاشف! تبصرہ لکھ کر تو تم نے کمال کر دیا۔ بہت شاندار تبصرہ کیا تم نے۔ جیتے رہو۔ پلیز خط ذرا جلدی بھیجا کرو۔ ای میل کرنا ہو تو بھی دیر کیوں؟؟

✉: کنزیٰ ملک' قاسم پور کالونی' ملتان سے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ احوال کی رونق میں اضافہ کر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں ماہ مئی 2016 بہت جلد مل گیا۔ سرورق اعلیٰ اور پیارا تھا۔ بکھرے بالوں والی حسینہ بہت پیاری لگ رہی تھی اور مدہوشی میں کن انکھیوں سے کسی کو تک رہی تھی۔ واہ بھائی۔ یہ لڑکیاں بھی کیا سے کیا کھوجتی پھرتی ہیں۔ نئے خواب، نئی اُمنگیں۔ اداریہ میں منزہ سہام نے ''بارش کا پہلا قطرہ'' میں بہترین الفاظ کا چناؤ کیا اور عمدہ موضوع کی طرف توجہ دلائی۔ احوال میں کاشی بھیاء کی باتیں دل کو چھوتی ہیں۔ جانے اتنی پیاری پیاری باتیں کیسے کر لیتے ہیں یقیناً گو، شکر ڈال کر لیتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سلامتی کے ساتھ سلامت رکھے آمین۔ سید ملازم حسین شیرازی کو مبارک باد۔ ان کا خط بھی عمدہ ہے اور اُن کی کہانی بھی زبردست تھی۔ اِس کے علاوہ تمام احوالی مسکرا رہے تھے۔ چند لڈو کھا رہے تھے تو کئی دُعائیں کر رہے تھے۔ ہماری پیاری پیاری لکھاری سدرہ انور علی بیمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جلد از جلد تندرست فرمائے۔ کافی ماہ ہو گئے ہیں مجید احمد جائی کی کہانی پڑھنے کو نہیں ملی۔ کوئی بتا سکتا ہے وہ کہاں گم ہیں۔ کہانیوں میں دو، تین کہانیوں کے علاوہ سبھی کہانیاں اچھی

تھیں۔ جیسے بھوک' اناڑی' قانون خاموش ہے' وغیرہ زرد لومڑی' ہاہاہا۔ زرد لومڑی...... واہ کتنا پیارا نام ہے اور پہلی قسط ہی کمال ہے۔ زہر عشق نے اپنا جادو برقرار رکھا ہوا ہے۔ سفرنامہ بھی ٹھیک جا رہا ہے اور تمام مستقل سلسلے کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ لو جی! امی بازار سے آ گئی ہیں۔ مجھے اجازت ورنہ مفت کی مار پڑے گی۔ بائے بائے۔

☆: اچھی کنزہ! خدا تمہارے تبصرے کی شوخی برقرار رکھیں مجید بھائی کی کہانی بھی جلد پڑھنے کو ملے گی فی الحال انتظار۔ پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

✉: یہ احوال میں آمد ہے ہماری پیاری بھابی صائمہ مجید کی ملتان شریف سے لکھتی ہیں۔ ماہ مئی کا سچی کہانیاں 30 اپریل کو ملا۔ ٹائٹل اچھے، بکھرے بالوں والی دوشیزہ کو خوشگوار موڈ میں دکھایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اہل مسلم کو خوشگوار زندگی گزارنے کی توفیق دے آمین۔ اداریے میں منزہ سہام نے ''بارش کا پہلا قطرہ'' زبردست لکھا۔ احوال کی محفل ہنستے مسکراتے کاشی بھیا سے خوب سجتی ہے۔ سید ملازم حسین شیرازی سرفہرست رہے اور ان کی کہانی ''قانون خاموش ہے'' عمدہ کاوش ہے۔ مبارک باد۔ محفل میں سبھی کے خطوط زبردست تھے۔ جنہوں نے مجھے یاد رکھا اُن کے لئے ڈھیروں دُعائیں۔ اللہ تعالیٰ سلامت رکھے۔ انسانیت سے پیار محبت رکھنے کی ہمت اور توفیق دے آمین۔ کاشی بھیا اس بار پھر ''نظم'' غائب...... کیوں جی! سدرہ انور علی کی بیماری کا جان کر دل سے دُعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے۔ جس نے صبر کی لاٹھی کو تھام لیا وہ کامیاب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی دے اور کبھی نہ دے کر آزماتا ہے۔ یہ تکلیفیں، پریشانیاں کچھ بھی نہیں کر سکتیں بندہ صبر و شکر والا ہو تو۔ ان ڈاکٹروں، حکیموں، پیروں کی باتوں پہ نہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ سے رابطہ رکھیں۔ وہ بندے کو مایوس کبھی بھی نہیں کرتے۔ ہم دُعا کرتے ہیں کہ مسٹر پروفیکٹ کی بہن اور ہماری جان صحت اور سلامتی کے ساتھ ہنستی مسکراتی رہے آمین۔ کہانیوں کی دُنیا نرالی رہی۔ طویل کہانی نمبر میں کہانیاں خاصے کی تھیں۔ قانون خاموش ہے، کتنی محبت باقی ہے، کھوٹ، بھوک، یکاؤ مال، منظر، پس منظر، ایک تصویر کہانی، انگاروں پہ رقص، اِک دیا جلتا ہے، لائف بوائے، اناڑی، وہ سات دن، سفر لحوں کا، انجانے میں، اچھی کہانیاں تھیں۔ زرد لومڑی، کی پہلی کڑی زبردست رہی اور زہر عشق نے میٹھا میٹھا زہر دے کر قارئین کو نشے میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسے نشے میں ہیروئن کا بھلا کیا کام۔ قاری کہانی میں کھو سا جاتا ہے۔ مستقل سلسلے بھی اچھے جا رہے ہیں۔ اب اجازت دیں کہیں قینچی حرکت میں آ جائے اور ہم بے موت مر جائیں۔

☆: پیاری صائمہ جی! آپ کی آمد' آپ کی پرچے سے محبت کا ثبوت ہے۔ جس طرح آپ ہم سے محبت کرتی ہیں۔ اسی طرح ہم آپ خدا سے دعا گو رہتے ہیں کہ وہ آپ کی ہر مراد پوری کرے آمین۔

✉: احوال بس سمٹ ہی رہا تھا کہ ہمارے بہت پیارے ساتھی مجید احمد جائی' ملتان کا برقی نامہ موصول ہوا۔ عرض کرتے ہیں۔ ماہ مئی 2016 کا سچی کہانیاں حسن ابدال سے خریدا۔ سرورق روایتی انداز میں خوبصورت ہے۔ اداریہ ''بارش کا پہلا قطرہ'' خوبصورت لکھا گیا ہے۔ ہمیں دُشمن کی چالوں کو سمجھنا چاہیے۔ احوال کی محفل میں کاشی بھائی سے ملاقات ہوئی اور سید ملازم حسین شیرازی کو کرسی صدارت پر ہنستے مسکراتے دیکھا۔ آگے چل کر یہ سُن کر ششدر رہ گئے کہ پیاری بہن سدرہ انور علی بیمار

ہیں۔ اُن کے خط میں یہ لکھا گیا ہے کہ ہر طرف ڈاکٹروں، پروفیسروں نے جواب دے دیا ہے۔ میری بہن ایسی بات نہیں، میں آپ کے سامنے زندہ مثالِ حیات ہوں۔ مجھے بھی اِسی طرح مایوس کیا گیا تھا لیکن ابھی بھی اِس دُنیا میں اللہ والے ہیں جن کے دَم سے یہ دُنیا آباد ہے۔ میں مشورہ دوں گا کہ میرے مسیحا ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا سے رابطہ کریں۔ اِس کے علاوہ احوال کی محفل رنگ برنگ احوال سے خوب سجی ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے مجھ ناچیز کو یاد رکھا۔ اُن کے لیے بہت سی دُعائیں۔ چند لوگوں کی کمی شدت اختیار کر گئی۔ مہربانی کر کے واپس لوٹ آئیں۔ کہانیوں کی محفل میں گئے تو پلیٹ فارم کہانی نہ پا کر دل بجھ سا گیا۔ جانے کیا مجبوری رہی ہوگی کہ پلیٹ فارم کی کہانی شائع نہ ہوئی۔ (پورا پلیٹ فارم نمبر جو دے دیا) بکاؤ مال، کھوٹ، بھوک، کتنی محبت باقی ہے، قانون خاموش ہے، وہ سات دن، اناڑی، بہترین تحریریں رہیں اور زرد لومڑی کا آغاز اچھا رہا۔ بادبان اچھا چل رہا ہے۔ سفر نامہ بہت سے راز اُگل رہا ہے۔ زہرِ عشق نے اپنے عشق میں گرفتار کیا ہوا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے جب شروع ہوئی اور آج پندرہ اقساط اختتام پذیر ہوئیں۔ میں اِس حق میں ہوں کم از کم اِس کو پانچ سال سے زیادہ چلنا چاہیے۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، اچھے رہے اور طویل کہانی نمبر دلوں پہ راج کر گیا۔ میں سچی کہانیاں کی ٹیم کو داد دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ بھی کا حامی و ناصر رہے۔

☆: پیارے مجید! اللہ سدرہ کو شفائے کلی اور صحت دے۔ آپ کا پیغام سدرہ تک پہنچ گیا۔ تبصرے کا شکریہ۔

ساتھیو! اب تک کی ہماری آپ سے ملاقات اختتام کو پہنچی۔ جب یہ پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو رمضان المبارک کی رحمتوں بھری ساعتیں ہم پر سایہ فگن ہوں گی۔ میری جانب سے آپ سب کو رمضان کی بہت بہت مبارک باد۔ اور ہاں اپنی دعاؤں میں ہم سب کو بھی یاد رکھیے گا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ الوداع کہنے سے پہلے آپ سب کی بصارتوں کی نذر ایک تازہ ترین نظم......

اوکسی ڈی نیشن

باہمی ملاقاتیں
سرسری سی رستوں میں
کتنی خوب صورت ہیں
یوں لگے کہ برسوں سے
رابطے مسلسل ہیں
زندگی کی سانسوں میں
باہمی ملاقاتیں
اوکسی ڈی نیشن ہیں
زندہ رہنے کو یارو!
خود سے ملنے کو یارو!
بس ملا کرو سب سے

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

لائف بوائے... یقین، محبت جگائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

گو بات اتنی بڑی تو نہ تھی جتنی کر لی گئی تھی مگر کیا کیا جائے کہ ہمیشہ رائی کا ہی پہاڑ بنتا ہے۔ سحر جانتی تھی کہ عباد طبیعت کا شروع سے لاپروا' شوخ اور دل پھینک ٹائپ مرد ہے مگر......

وہ جلدی جلدی اپنے کپڑے جہازی سائز بیگ میں ٹھونس رہی تھی۔ غصہ اتنا تھا کہ جیسے سب کچھ بھسم کر دے گی۔

''پہلے سوچ لو اچھی طرح' اس کے بعد کوئی قدم اٹھانا۔'' باجی بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑیں۔

''بس باجی بیگم' میں روز روز کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی' میری برداشت کی حد جواب دے چکی ہے۔'' آنسو آپ ہی آپ رخسار بھگونے لگے تھے۔

''ارے' میاں تو لاکھ عیب کرتے پھرتے ہیں' ایسا کیا کر دیا عباد نے؟'' بھائی کی محبت میں کیسے نہ بولتیں۔

''یعنی کہ میں اب آپ کو سب کچھ بتا کر پھر سے اپنا دکھڑا بیان کروں، پھر سے اپنی جمع کی ہوئی ہمتیں کھو دوں؟''

اس کے ہاتھ رک گئے اور آنکھیں یک ٹک باجی بیگم کو دیکھنے لگیں۔

''دیکھو نہ تم غیر ہو نہ وہ کہیں اور سے آیا ہوا ہے۔ میں تم دونوں کو خوب سمجھتی ہوں' تم کو پسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تم معاملہ فہم ہو اور بی بی سب سے اہم وجہ تو تم بھی خوب جانتی ہو۔

تمہارے لائف بوائے شیمپو نے جانے کیا جادو کیا کہ تمہارے ریشمی بالوں سے ہی وہ بندھ گیا اور تمہاری عباد سے متعلق شکایت جائز ہے۔

تم غلط نہیں ہو مگر یہ بتاؤ' اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے یا نہیں؟''

باجی بیگم نے جیسے اسے کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔

''محبت......

وہ بھلا کیسے جھوٹ بولتی؟ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ ان پانچ ماہ میں عباد نے جی بھر کر اس پر محبت لٹائی تھی۔ وہ تو خود پر رشک کرتی تھی کہ اسے اتنا چاہنے والا ہم سفر ملا ہے' کتنا خیال رکھتا ہے وہ اس کا مگر عورت جس سے محبت کرتی ہے' اس کی مکمل توجہ چاہتی ہے' وہ ہر ہر طرح سے اسے صرف اپنا دیکھنے کی متمنی ہوتی ہے۔

نکاح کے تین بول بلا شرکتِ غیرے اسے اس کا کل اثاثہ بنا دیتے ہیں۔ پرائی ہوا کے چھونے پر بھی بیوی شاکی ہو جاتی ہے اور وہ کوئی پرائی ہوا نہیں بلکہ جیتی جاگتی خوبصورت ماہ لقائیں ہوتی تھیں۔

اس کے لیے اس وقت زمین میں گڑ جانے کا موقع ہوتا تھا جب بھی وہ بالکل دوسے ایک ہو کر کسی تفریحی مقام یا کسی فوڈ پوائنٹ پر جاتے تھے اور عباد...... اس کی نظروں کی پروا کیے بغیر' خوبصورت چہروں کے پیچھے پیچھے تعاقب کرتی اس کی نظریں......

کتنی ہی بار وہ روٹھ کر اٹھ جاتی' چلنے لگتی' سانسوں کی گھٹن' دھڑ دھڑ کرتے دل کے بھانبھڑ اور بھڑک جاتے' کتنی ہی دور وہ چلتی چلی جاتی' ایک' دو' تین' چار اور پانچ منٹ بعد' وہ دوڑ کر آتا اور اسے منانے لگتا۔

''یار' کیوں چلی آئیں؟''

''آپ خود سے پوچھیں۔''

''میں نے ایسا کیا کیا؟'' معصومیت کی حد ہوتی۔

''بس میں ہی باؤلی ہوں' سب کچھ سہہ سکتی ہوں مگر......'' وہ رو دیتی۔

''دیکھو پلیز' بتاؤ تو سہی' ہوا کیا ہے؟ تمہیں معلوم ہے' رونے سے تم اور حسین ہو جاتی ہو۔''

وہ سینے پر ہاتھ باندھے کہتا۔

''اس کو کیوں دیکھ رہے تھے؟''

''کس کو؟'' کچھ کچھ سمجھ میں آتا تو مسکرانے لگتا۔

''وہی جس نے بلیک گلاسز لگائے ہوئے تھے۔'' نم آنکھیں شکوہ کناں ہوتیں۔

''ارے' اتنی سی بات پر...... بھلا تم سے زیادہ حسین تھی وہ...... اس کے بال میری لائف بوائے شیمپو بے بی سے زیادہ سلکی اور چمکدار تھے۔ تم بھی نا' چلو بابا' غلطی ہوگئی' معاف کردو۔''

وہ کہتا اور پھر سے نئی غلطی واپسی سے پہلے پہلے پھر سے ہو جاتی۔

یہ وہ شکایت تھی جو میاں بیوی کے درمیان کی بات ہوتی ہے۔ وہ بھلا کس سے اور کیسے کہتی؟ مگر ان پانچ ماہ میں وہ کوئی پانچ سو بار یہ حرکت کر چکا تھا۔

اس نے باہر جانا ہی چھوڑ دیا۔ وہ لاکھ کہتا۔

''یار' چلو کوئی پکچر دیکھ آتے ہیں۔''

مگر جو صورت حال 'تھری ایڈیٹس' والے تھیٹر میں بن گئی تھی' وہ نہیں چاہتی تھی دوبارہ بنے۔

موصوف فلم کی کرینہ کو چھوڑ کسی اور پتلی کمر پر فریفتہ ہو گئے تھے جیسے وہ ایڈیٹ تو خالی خولی فلم ہی دیکھنے گئی تھی حالانکہ اس سے پہلے Rio کے دوران بھی وہ نیلا طوطا خود کو سمجھتی رہی تھی' اس کے بعد اس نے یہ تفریح بھی چھوڑ دی تھی۔

گھر میں کوئی تھا نہیں' لے دے کے باجی بیگم' اس کا پورا سسرال تھیں۔

اسے پسند بھی انہوں نے ہی کیا تھا عباد کے لیے۔

اُسے ہمیشہ سے لمبے چمکدار بالوں والی

لڑکیاں پسند تھیں۔ تھا تو وہ نظر باز مگر لڑکیوں کے لانبے بال اُس کی کمزوری تھے۔ اُسے شیمپو کے اشتہارات بہت اچھے لگتے تھے خاص طور پر لائف بوائے شیمپو کے اشتہارات کا تو وہ دیوانہ تھا۔ اسے اتفاق کہیے کہ سحر سے باجی بیگم شروع ہی سے اٹیچڈ تھیں۔

اور اِسے سوئے اتفاق کہیے کہ سحر کے بالوں کی خوبصورتی کا راز بھی لائف بوائے شیمپو ہی تھا۔

وہ بچپن سے اپنے گھر میں لائف بوائے شیمپو ہی کا استعمال دیکھتی چلی آ رہی تھی اور لائف بوائے شیمپو کے استعمال سے اُس کے گھر کی خواتین کے بال مضبوط، توانا اور لانبے تھے۔

سو عباد کے لیے سحر کو جھٹ سے آپا بیگم نے مانگ لیا۔

وہ بھی انہیں ہمیشہ سے بڑی بہن ہی کا درجہ دیتی آئی تھی۔

اب حد ہو گئی تھی، عباد کی نظروں کے تیر کسی اور پر پڑتے تھے مگر چھلنی اس کا سینہ ہو گیا تھا۔ ساری محبت اس نظر بازی کی خاک میں مل گئی تھی۔ وہ اس غلطی کو سرے سے غلطی ہی نہیں مانتا تھا۔

''دیکھو سحر، یہ گھر، گھروندے ریت کے نہیں ہوتے، یہ تو اعتبار کے رشتے ہوتے ہیں جن کی مضبوطی کے لیے انہیں اعتبار کا گارا درکار ہوتا ہے۔

ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔ عباد لاکھ نظر باز سہی مگر میں حلفیہ اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ وہ دل میں کسی کو نہیں رکھ سکتا سوائے تمہارے۔ تم یقین کرو گی؟ میرے ہاں آ کر جو تمہارے گن گانا شروع کرتا ہے کہ جو تمہارے لائف بوائے شیمپو والے بالوں کی طومار باندھتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے برا لگنے لگتا ہے کہ شاید مجھ سے غلطی ہو گئی۔ کوئی نند، بھابھی کی تعریف پسند کرے گی جبکہ نند بھی اکلوتی؟''

باجی بیگم نے رسان سے سمجھایا۔

''تم کچھ عرصہ اور دو واسے، ایک دو بچے ہو جائیں تو خود ہی اس کے یہ چونچلے ختم ہو جائیں گے۔ چلو شاباش، یہ گھر تمہارا ہے، کس کے حوالے کر کے جا رہی ہو؟''

باجی بیگم کے آنسو پونچھنے پر وہ ان کی بات کچھ کچھ سمجھی تھی۔ آج اس نے باجی بیگم کو بلا کر عباد کے بارے میں جو دل میں شکوے تھے، بدگمانیاں تھیں، گوش گزار کر دی تھیں۔ کچھ دیر بعد باجی بیگم اسے منا کر اپنے ہاں چلی گئی تھیں اور وہ کچن میں چولہا جلا کر اپنا دل پھونکنے لگی تھی۔

.......•.......•.......•

اپنی پندار کی کرچیاں
چن سکوں گی
شکستہ اڑانوں کے
ٹوٹے ہوئے
پر سمیٹوں گی
تجھ کو بدن کی اجازت سے
رخصت کروں گی
کبھی اپنے بارے میں
اتنی خبر ہی نہ رکھی تھی
ورنہ بچھڑنے کی یہ رسم
کب کی ادا ہو چکی ہوتی
مرا حوصلہ
اپنے دل پر بہت قبل ہی
منکشف ہو گیا ہوتا
لیکن...... یہاں
خود سے ملنے کی فرصت کسے تھی

اور پھر اس نے سمجھوتے کی سل اپنے سینے پر رکھ لی جس کے نتیجے میں پہلے اس کے ہونٹ مسکرانا بھولے اور پھر ایک خاموش احتجاج اس کے اندر اترتا چلا گیا۔

عباد کو وہ کبھی کبھی الوہی لمحات میں پتھر کی سی سل لگا کرتی۔ وہ اپنی محبت سے لاکھ اس مورتی میں حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتا مگر......

جب جذبات مر جاتے ہیں تو زندہ لاشیں وجود میں آ کر تکمیل پا جاتی ہیں اور یہ لاشیں صرف روبوٹ بن جایا کرتی ہیں۔

تمام فنکشن ان کے اندر موجود ہوتے ہیں لیکن دل نام کا عضو اپنی بیٹری صحیح طرح چارج نہیں کر پاتا اور اسی کے سبب سے دل جذبات والی لہریں دماغ تک پہنچنے نہیں دیتا اور یوں ایک نیا نروس سسٹم تمام افعال انجام دینے میں متحرک ہو جاتا ہے۔

وہ بھی اسی نئے اندرونی نظام کے تحت جینے لگی تھی، بالکل روبوٹ کی طرح سے۔

اچانک ہی اب اس کے اندر کا یہ نیا سسٹم ٹوٹنے پھوٹنے لگا تھا۔ اس کے اندر ایک اور دنیا اپنا مقام بنانے لگی تھی۔ تبدیلیاں واضح اشارہ تھیں کہ خدا نے اس کے قدموں تلے جنت رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

.......•.......•.......•

آج وہ ایک عرصے بعد جی اٹھی تھی۔ عباد کی محبت اس کی روح میں پنجے گاڑ چکی تھی اور ایسی پائیدار محبت نے اسے واپس پتھر سے انسان بنایا تھا۔

اس نے اِس خبر کے ملتے ہی اُس دن بہت محبت سے بلیک جارجٹ کی ساڑی پہنی اور ہلکا پھلکا سا میک اپ کیا تھا اور بالوں کو لائف بوائے شیمپو سے خوب اچھی طرح واش کر کے عباد کی پسند کے مطابق کھلے چھوڑ دیا تھا۔ عباد کی فیورٹ ڈش بھی بڑے دل سے تیار کی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر سجاوٹ کے انتظامات دیکھ کر وہ پلٹی ہی تھی کہ اس کی سماعتوں میں موبائل کی وائبریٹنگ ارتعاش پیدا کرنے لگی۔ وہ ان ارتعاش کی لہروں کی مدد سے موبائل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر عباد کا موبائل پڑا تھا جو اتفاقاً جیب سے پھسل کر گرا ہوگا۔ اس نے نادانستگی میں 'کی پیڈ' ایکٹو کیا تو کسی کا میسج تھا اور میسج کے ساتھ بھیجنے والی کی تصویر بھی آ گئی تھی جسے یقیناً خود save کیا گیا تھا۔ اس حسینہ کا نام حرا تھا۔

اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ خون میں ابال بھی اٹھنے لگا تھا۔ سختی سے اس نے msg پڑھنے کے لیے بٹن پش کیے تو inbox کی جگہ outbox کے میسج آ گئے۔ حرا کے نام کے ساتھ کوئی آٹھ' دس لگاتار send msg کیے گئے تھے۔

پہلے میسج میں لکھا تھا۔

'سوری یار' ایک کپ چائے صرف تمہارے ساتھ۔ جہاں تم کہو۔'

دوسرے میں لکھا تھا۔

'فرینڈ ہونا' اس لیے بتا رہا ہوں' ایک بہت پیاری بیوی کا شوہر ہوں اور اُس کے بالوں سے اٹھتی لائف بوائے شیمپو کی خوشبو کا دیوانہ ہوں میں...... واؤ کیا زبردست پرسنالٹی بنا دی ہے۔ اِس لائف بوائے شیمپو نے میری لائف، میری وائف کی۔

تیسرے میں۔ 'میری بیوی مجھ پہ بہت بھروسہ کرتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے' میں نے کبھی اس کے بھروسے پر آنچ آنے نہیں دی۔ آئی لو

اونلی مائی وائف۔“

اس نے اتنا پڑھ کر موبائل واپس وہیں رکھ دیا۔

•.......•.......•

بیل کی آواز پر وہ دروازے کی سمت آئی۔ عباد معمول کے جوش و جذبے سے اس کا سامنا کر رہا تھا۔ آج اسے یہ سب اچھا لگ رہا تھا' بالکل سچا' کہیں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ اس کا حسن آج واقعی دو آتشہ سا لگ رہا تھا۔ رہی سہی کسر جو میک اپ کے باوجود رہ گئی تھی' وہ کچھ دیر پہلے رونے کی وجہ سے آنکھوں میں گلابی پن نے پوری کر دی تھی۔

”کیا میں آج اپنے ہی گھر میں آیا ہوں؟“ عباد نے اس کے جوش و خروش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”کھانا لگا دیا ہے' آپ فریش بھی ہو گئے ہیں۔ چلیے' ڈائننگ ٹیبل پر' میں آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے جیسے اسے کچھ بھی کہنے سے روکا تھا۔

”جو حکم سرکار......“ وہ محبت سے کہتا' ڈائننگ ٹیبل تک پہنچ گیا۔

سحر نے کھانا سرو کیا اور اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔

ابھی عباد نے ایک نوالہ ہی لیا تھا کہ اس کے موبائل کی مخصوص وائبریٹنگ نے اپنی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی۔

”اوہ نو...... یہ یہاں رہ گیا تھا؟ میں تو سمجھا' شاید کہیں باہر گر گیا ہے' سارا دن پریشان رہا۔“ اس نے موبائل اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

”کس کی کال آ رہی تھی؟“

تفتیش شروع ہو گئی تھی۔

”ارے یار' msg تھے۔“ وہ جھنجلا کر کھانے کی جانب متوجہ ہوا۔

”لگاتار...... اتنے ڈھیر سارے میسج؟“

”بھئی' اب تو سب ایک ہی میسج کو دس بار کر دیتے ہیں۔“

”آپ پہلے msg پڑھ لیں' کیا پتا بہت اہم msg ہوں۔“

عباد نے جھنجلاتے ہوئے میسج پڑھے۔ مسلسل ایک ہی میسج کی تکرار اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر رہی تھی۔

”پاپا جی!

ناجانے کیوں' ہمیں تم پر بڑا بھروسہ ہے

خیال رکھنا کہ قائم یہ اعتبار رہے

آیندہ آپ کی نظر بازی بالکل برداشت نہیں کروں گی۔

آئی لو یو پاپا جی......!“

اس نے بڑھ کر سحر کو تھام لیا۔

”پرامس' بالکل نہیں آج کے بعد' صرف ان نظروں کی قید میں' عمر قید کی سزا آج سے۔“ یکدم وہ الگ ہو کر کچھ لے کر آیا تھا۔

”ارے جان وہ تمہارے لیے' پاپا جی' کا ایک چھوٹا سا گفٹ......“

”کیا لے آئے پاپا جی......!“ وہ مسکرائی۔

”تم سے بڑھ کر خدا کا کوئی تحفہ ہے کیا۔“ عباد نے ایک ساتھ لائف بوائے شیمپو کی کئی بوتلیں اُس کے ہاتھ میں دے دیں۔

سحر نے اُس کے کاندھے سے سر ٹکا دیا اور عباد اس کے لائف ٹائم خوبصورت بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جو لائف بوائے شیمپو ہی کی مرہونِ منت تھے۔

محبت اور اعتبار نے نئے رشتے کو جنم دے دیا تھا جو واقعی کل سے زیادہ پائیدار تھا۔

☆☆......☆☆

پلیٹ فارم سے جڑی وہ کہانیاں جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیں گی

اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ دس یادگار ترین بیتیاں

اشارہ





محمد سلیم اختر

اُس اسٹیشن کا قصہ عجب، جس کا ہر اسٹیشن ماسٹر نفسیاتی بیماری کا شکار ہو جاتا تھا

میڈیکل کالج میں، میں اور رباب کلاس فیلو تھے۔ رباب لاکھوں میں ایک تھی۔ حسن اور رعنائی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ مالی لحاظ سے بھی وہ سب سے بڑھ کر تھی۔ اس کا باپ وزارتِ مواصلات میں سیکریٹری تھا۔ کالج کے کئی لڑکے اس پر فدا تھے۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھتے تھے۔ مگر وہ کسی کو لفٹ ہی نہ کراتی تھی۔ کیونکہ وہ صرف مجھ پر مرتی تھی۔ اور میری محبت کا دم بھرتی تھی۔ کیونکہ میں مردانہ حسن



وجمال میں کوئی ثانی نہ رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے میں رباب کو لفٹ نہ کراتا تھا۔ اس نے اپنی چاہت اور محبت کا ہر جال مجھ پر پھینکا۔ مگر میں اس کے دام میں نہ پھنسا۔ رباب کی محبت سچی تھی۔ کوئی کھوٹ اس میں نہ تھی۔ میں اس کی چاہت کا معترف تھا۔ مگر میری توجہ اپنی پڑھائی پر تھی۔ میں محبت کو فضول چیز سمجھتا تھا۔ اور اس گرداب میں نہ الجھنا چاہتا تھا۔ چار سال کا عرصہ یوں ہی گزر گیا۔ ہم دونوں ڈاکٹر بن گئے۔ الوداعی پارٹی میں رُباب میرے پاس آئی اور بولی۔

''ڈاکٹر جواد! آج ہم جدا ہو رہے ہیں۔ میں تمھیں یہ بتارہی ہوں کہ میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی نہیں آئے گا۔ اور اگر میری محبت سچی ہوئی تو میں تمھیں حاصل کرلوں گی۔''

میں نے رُباب کی اس والہانہ محبت کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور یوں ہم جدا ہو گئے۔

☆☆☆

مجھے زیادہ عرصہ سروس کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرنا پڑا۔ ان ہی دنوں ایک بڑے شہر میں محکمہ ریلوے کے ایک بڑے اسپتال کا افتتاح ہوا۔ اور ساتھ ہی ڈاکٹرز کی بھرتی بھی شروع ہوگئی۔ میری خوش قسمتی کہ میرا انتخاب ہوگیا۔ اسپتال میں ڈیوٹی جوائن کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رباب کی تعیناتی بھی اسی اسپتال میں ہوئی ہے۔ وہ اپنے باپ کی سفارش پر منتخب ہوئی تھی۔ میں نے تو اسے اتفاق ہی جانا تھا۔ اسپتال میں رُباب سے آمنا سامنا ہوتا ہی رہتا تھا۔ وہ اب بھی میری محبت کا دم بھرتی تھی۔ وہ خوش تھی کہ ہم دونوں ایک ہی اسپتال میں کام کررہے ہیں۔ رباب اس اتفاق کو اپنی چاہت کی کامیابی قرار دیتی تھی۔ مگر میں اِس کو اُس کی ناکامی قرار دیتا تھا۔ کیونکہ میرے دل کے کسی گوشے میں اس کے لیے محبت کا چراغ روشن نہ تھا۔ اور نہ ہی روشن ہونا تھا۔ میں نے کسی بھی صورت رباب سے شادی نہیں کرنی تھی۔

اس اسپتال میں تین سال گزرنے کے بعد میری تبدیلی ایک پہاڑی علاقے کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے اسپتال میں کردی گئی۔ میں نے ڈیوٹی جوائن کرنے سے قبل ہی ایک ماہ کی چھٹی لے لی......

گرمیوں کے دن تھے۔ اس لیے میں چھٹیاں گزارنے کے لیے ایک پہاڑی تفریحی مقام پر چلا گیا۔ میں ایک ماہ مکمل آرام اور سکون سے گزارنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک اچھے اور صاف ستھرے ہوٹل میں ایک ماہ کے لیے کمرہ بک کرالیا اور پہاڑی علاقے کے ٹھنڈے موسم سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میں صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوکر ہوٹل سے نکلتا اور کرائے کی گاڑی میں سارا دن گھومتا رہتا۔ دوپہر کا کھانا میں باہر ہی کھاتا تھا اور شام ڈھلے ہوٹل لوٹ آتا۔ مجھے اکیلے ہی سیر کرنے میں مزہ آتا تھا۔ مجھے کسی ساتھی اور ہم سفر کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ میں شروع ہی سے تنہائی پسند تھا۔ اسکول اور کالج میں بھی میں نے کم ہی دوستیاں پالی تھیں۔ میں ہمیشہ اپنی پڑھائی میں مگن رہتا تھا اور ہر کلاس میں پوزیشن لیتا تھا۔ ایم بی بی ایس پاس کرکے میں نے گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ میڈیکل کالج اور ریلوے اسپتال میں رباب کے علاوہ کئی لیڈی ڈاکٹرز اور نرسوں نے میری طرف دوستی اور چاہت کا ہاتھ بڑھانا چاہا۔ لیکن میں نے ہر ایک کا ہاتھ جھٹک دیا۔ نہ جانے کیوں میرے دل کو کوئی لڑکی بھاتی ہی نہ تھی۔

میں اپنی دنیا میں خوش تھا۔ مگر میں مریضوں کے معاملے میں نہایت ہی سنجیدہ اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا تھا۔ بیمار اور نادار لوگوں کی خدمت کرکے مجھے روحانی سکون ملتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں میں شفا دے رکھی تھی۔ میری ہمدردی۔ دو پیار بھرے بول اور معمولی سی دوا مریض کو تندرست کردیتے تھے۔ مریض مجھ سے بہت خوش اور مطمئن رہتے تھے وہ لوگ مجھے دل سے دعا دیتے تھے اور ان کی یہی دعائیں میرا اثاثہ تھیں۔ اسی لیے مجھے کسی کی پروا نہ تھی۔ کیونکہ میں اپنے پیشے سے مخلص تھا۔ مجھے سیر کرنے اور فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میں انڈیا کی آرٹ فلمیں خصوصی طور پر دیکھا کرتا تھا۔

میں تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ دونوں بھائی شادی شدہ تھے۔ امی ابو اب مجھے بھی اس بندھن میں جکڑنا چاہتے تھے۔ مگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں ان کو ٹال رہا تھا۔ نہ جانے کیا وجہ تھی کہ مجھے شادی کرنے کی خواہش ہی نہ تھی اور نہ ہی کوئی لڑکی میرے من کو بھاتی تھی۔ امی ابو زیادہ زور دیتے تو میں ان کو کہتا کہ میں نے اپنے پیشے سے شادی کرلی ہے۔''

رُباب کی چاہت میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

ایک دن موقع پا کر اس نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا اور شادی کی پیشکش بھی کر ڈالی۔ مگر میں نے اس کی پیش کش ٹھکرا کر اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ اس روز وہ بہت روئی تھی۔ جس روز میں نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس نے اپنی اِس توہین کا بدلہ مجھ سے یوں لیا کہ اس نے اپنے باپ کو کہہ کر میرا تبادلہ اس دور دراز کے پہاڑی اور جنگلی علاقے کی ڈسپنسری میں کرادیا۔ میں نے اُس کی اِس کرم فرمائی پر سکھ کا سانس لیا تھا کہ اب میں اس جگہ سکون کی زندگی گزاروں گا۔ کیونکہ وہاں میں نے ہی تمام ڈسپنسری سنبھالنی تھی۔ میرے علاوہ وہاں کوئی اور ڈاکٹر نہ تھا۔ رباب نے شاید مجھے بطور سزا یہاں بھجوایا تھا۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ میں یہاں کتنا خوش اور پرسکون ہوں۔

☆☆☆

''کنگز ہوٹل'' جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بیضوی شکل کا دو منزلہ ہوٹل تھا۔ نیچے والی منزل میں ریسٹورنٹ تھا۔ جبکہ دوسری منزل میں تین رہائشی کمرے تھے۔ جو بیضوی طرز پر ہی بنائے گئے تھے۔ درمیان کا حصہ خالی تھا۔ اس میں ایک چھوٹا سا تالاب بنایا گیا تھا۔ جس کا پانی نہایت ہی شفاف اور نیلا تھا۔ اس میں رنگ برنگی خوبصورت مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ تالاب کے درمیان فوارہ تھا اور اس کے اردگرد رنگ برنگی لائٹس لگی تھیں۔ شام کو جب تمام لائٹس جلا کر فوارہ چلایا جاتا تو اس میں تیرتی مچھلیاں ایک مسحور کن نظارہ پیش کرتی تھیں۔ میں اکثر شام کو کمرے سے نکل کر بالکونی میں کھڑا ہو کر ان کا نظارہ کیا کرتا تھا اور بہت ہی لطف اندوز ہوتا۔

ایک شام میں حسبِ معمول جب مچھلیوں کا نظارہ کرنے کے لیے بالکونی میں آ کر کھڑا ہوا تو میری نظر سامنے والے کمرے کی بالکونی میں کھڑی ایک دوشیزہ پر پڑی۔ تو مجھے یوں لگا کہ میں برسوں صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد کسی نخلستان میں آ گیا ہوں۔ وہ مچھلیوں کو تیرتا دیکھنے میں محو تھی اور میں اس کے لافانی حسن اور رعنائی کو دیکھنے میں محو تھا۔ میں نے اس سے قبل اس جیسی لڑکی نہ دیکھی تھی۔ اس کے حسن نے چند لمحوں میں ہی مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ میں جو پتھر کا بت تھا چند لمحوں میں ہی موم کی طرح پگھل گیا۔ اس کا متناسب سیمیں وبدن اور لازوال حسن میرے من میں ہلچل مچا گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح مچھلیوں کو اور میں اسے دیکھتا رہوں۔ یوں ہی یہ شام رات میں ڈھل کر رہ جائے۔ مگر یہ تسلسل برقرار نہ رہا۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں تو مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا تو خود مسکراتی اور لجاتی ہوئی واپس کمرے میں لوٹ گئی۔ وہ میرے دل کا چین اور قرار بھی ساتھ ہی لے گئی۔ میں چند لمحے وہیں بالکونی میں کھڑا رہا کہ شاید وہ دوبارہ اپنا درشن کرانے آ جائے۔ مگر نہ آئی تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ مگر اب مجھے کسی پل بھی قرار نہ تھا۔ میں کھڑکی کے قریب کرسی رکھ کر بیٹھ گیا اور نظریں اس کے کمرے کی جانب لگا دیں۔ اس آس پر کہ شاید وہ دوبارہ بالکونی میں آ جائے۔ تمام رات بھی میں نے محبت کی اس آگ میں جلتے ہوئے گزار دی جو پہلی نظر میں ہی میرے من میں سما گئی تھی۔

اگلا دن میں نے کمرے میں ہی گزار دیا۔ کہیں جانے کو جی ہی نہ چاہ رہا تھا۔ بس ہر لمحہ میری نظریں اس کے کمرے کی طرف ہی لگی رہیں۔ مگر وہ نظر نہ آئی تو میں نے کمرے سے باہر نکل کر گیلری کا ایک چکر لگایا۔ مگر اس کا دیدار نہ ہوا۔

ہوٹل والوں کو معلوم تھا کہ میں ایک ڈاکٹر

ہوں۔ اور ان کا ایک مہینہ کا کسٹمر ہوں۔ اس لیے وہ میری بہت عزت کرتے تھے۔ میں کوئی بھی کام کہتا تو وہ منیجر فوراً ہی میرا مسئلہ حل کر دیتا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ میں اس سلسلہ میں اس سے بات کروں اور معلوم کروں کہ سامنے والے کمرے میں کون لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مگر پھر اس خیال کو ترک کر دیا کہ منیجر نہ جانے میرے بارے میں کیا رائے قائم کر لے۔

میں شام کو حسبِ معمول ہوٹل سے نکلا اور کشمیر پوائنٹ کی طرف گھومتا ہوا مال روڈ کی طرف نکل آیا۔ کچھ کھانے کا موڈ بھی نہ بن رہا تھا۔ میں گیارہ بجے ہوٹل واپس آیا تو اس وقت بارش شروع ہو گئی اور ہوا میں خنکی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ میں سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ اور جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔

رات دو بجے کا وقت ہوگا کہ کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں بے دلی سے اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ تو دیکھا باہر ہوٹل کا منیجر کھڑا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔

''کیوں خیریت تو ہے؟'' میں نے منیجر سے پوچھا۔

''ان کی دوست کو پیٹ میں شدید درد ہے۔ باہر بارش بہت تیز ہے۔ اس وقت انھیں کہیں لے جانا مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اگر آپ ان کا چیک اپ کر کے کوئی دوا دے دیں تو مہربانی ہوگی۔''

''ہاں۔ ہاں۔ ضرور'' یہ کہہ کر میں مڑا اور کمرے سے ایمرجنسی بکس اٹھا کر ان کے ساتھ چل پڑا۔ جب میں اس لڑکی کے ہمراہ اس کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ میرے سامنے وہی حسینہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ جس کو میں ایک نظر دیکھ کر ہی اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ مختصر الفاظ میں اس کی تکلیف سنی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے گردے میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے فوری طور پر اسے دو انجکشن لگائے تو اس کا درد کافی حد تک کم ہو گیا۔ میں کچھ دیر کے لیے وہاں ٹھہر گیا۔ جب اسے مکمل آرام آ گیا تو پھر وہ سو گئی۔ تو میں واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

میں نہایت ہی مسرور تھا کہ میں نے ایک تو اپنا فرض نبھایا ہے، دوسرا یہ کہ اس کا قریب سے دیدار بھی ہو گیا ہے۔ جس کے لیے میں کئی گھنٹوں سے بے چین و بے قرار تھا۔ اس کا نام نادیہ تھا اور ساتھ اس کی دوست نائلہ تھی۔ وہ دونوں بھی سیر کرنے کی غرض سے وہاں آئی ہوئی تھیں۔

صبح جوں ہی میں اٹھا تو نائلہ میرے کمرے میں آ گئی۔ اس نے مجھے دعوت دی کہ آج میں ناشتا ان کے ہمراہ کروں۔ میں انکار نہ کر سکا۔

میں تیار ہو کر جب ہوٹل کے فیملی کیبن میں پہنچا تو نادیہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے تشکر کے جذبات نمایاں تھے۔ پھر بھی اس نے زبان سے میرا شکریہ ادا کیا۔ تو میں نے جواب میں یہی کہا کہ یہ تو میرا فرض تھا۔ پھر اس نے میری فیس اور ادویات کی رقم دینے کی بات کی تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ آپ میرے فرض اور خلوص کا مذاق اڑا رہی ہیں۔

وہ خاموش ہو گئی۔ ناشتا کرنے کے دوران ہی ہم نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ نادیہ حسن اور رعنائی میں لاکھوں میں ایک تھی۔ اس کی ہرنی سی بڑی بڑی آنکھیں، گلاب کی ادھ کھلی کلی کی پنکھڑیوں سے تراشے ہوئے لب۔ ستواں ناک جس میں پڑی نازک سی لونگ کا لشکارا میرے دل پر بجلیاں گرانے لگا۔ جب میں نے اس سے اپنا مکمل تعارف کرایا اور بتایا کہ اب میری تبدیلی تاراگڑھ کی ڈسپنسری میں ہو گئی ہے۔ تو وہ بہت خوش ہوئی کہنے لگی۔

''میں بھی اسی علاقے کی رہنے والی ہوں۔ میرے والد ریلوے میں ملازم ہیں۔ ان دنوں وہ ریلوے کراسنگ کے اس پار واقع گارڈ روم کے انچارج ہیں۔ ابو اکثر بیمار رہتے ہیں۔ انھیں کوئی نفسیاتی اور دماغی عارضہ لاحق ہے۔ انھیں ڈر ہے کہ کہیں میڈیکل بورڈ انھیں ملازمت سے فارغ ہی نہ کر دے۔''

''تم فکر نہ کرو نادیہ! میں پیچیدہ اور نفسیاتی امراض کے مریضوں میں خصوصی دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں تمہارے والد سے ملوں گا۔ ان کا علاج کروں گا اور انشاء اللہ وہ صحت یاب ہو جائیں گے۔''

نادیہ میری باتیں سن کر مطمئن سی ہو گئی اور کہنے لگی۔

''میں بھی اپنا علاج آپ ہی سے کراؤں گی۔ مجھے گردے کا درد اکثر بہت شدت سے ہوتا ہے۔''

☆☆☆

دو دن بعد ان دونوں نے واپس جانا تھا۔ ان دو دنوں میں۔ میں اور نادیہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ان دو دنوں میں جب بھی میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی پراسراریت محسوس کرتا۔ کبھی اس کی آنکھوں کا رنگ نیلا ہوتا۔ کبھی سنہری اور کبھی سیاہ۔ میں اس کو قطعی نہ سمجھ پایا تھا۔ وہ جب بھی مجھ سے جدا ہو کر اپنے کمرے کی طرف جاتی تو وہ اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ''V'' کا نشان بناتی اور اپنے کمرے میں داخل ہو جاتی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ڈیوٹی جوائن کرتے ہی میں اس کے باپ کا علاج شروع کر دوں گا اور جب وہ تندرست ہو جائے گا تو میں اس سے نادیہ کا ہاتھ مانگوں گا۔

☆☆☆

اگلی صبح نادیہ اور نائلہ کی واپسی تھی۔ میں شام کو ان کو خدا حافظ کہہ کر ان کے کمرے سے نکلا تو تب بھی نادیہ نے ''V'' کا اشارہ دیا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں صبح ان کو اپنی گاڑی میں ویگن اسٹینڈ پر چھوڑ آؤں گا۔ صبح ہوئی تو میں تیار ہو کر ریسٹوران میں آ گیا اور ان کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر گزر گئی مگر وہ نہ آئیں۔ تو میں ان کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ خالی پڑا تھا۔ وہ دونوں وہاں موجود نہ تھیں۔ ان کا سامان بھی نہ تھا۔ میں فوراً نیچے آیا اور منیجر سے پوچھا کہ وہ دونوں خواتین کس وقت ہوٹل چھوڑ کر گئی ہیں۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو گئی ہیں۔'' منیجر نے جواب میں مجھے حیران کر دیا۔

''کتنی دیر ہو گئی؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''پندرہ منٹ گزرے ہوں گے۔'' منیجر نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو ایک گھنٹے سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔'' یہ کہہ کر میں ہوٹل سے باہر نکلا اور گاڑی لے کر ویگن اسٹینڈ تک جا پہنچا۔ مگر وہاں تو ان کا نام و نشان نہ تھا۔ میں نے اڈے والوں سے ان کا حلیہ وغیرہ بتا کر پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ایسی کوئی پسنجر ویگن، ضلع ہیڈ کوارٹر کی طرف نہیں گئی میری الجھن اور پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا کہ وہ مجھ سے ملے بغیر کیوں اور کہاں چلی گئی ہیں۔ میں نے ان کو کافی تلاش کیا۔ مگر مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہ چلا۔

تھک ہار کر میں واپس ہوٹل لوٹ آیا اور ان کے بارے میں دیر تک سوچتا رہا۔ کہ وہ کہاں آ گئیں۔

☆☆☆

میری چھٹی ختم ہوئی تو میں واپس اپنے شہر آیا اور پھر وہاں سے بذریعہ ٹرین تارا گڑھ روانہ ہو گیا۔ ریل گاڑی جوں ہی تارا گڑھ کے علاقے میں داخل ہوئی تو میں دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ تارا گڑھ ریلوے اسٹیشن پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ تارا گڑھ پہنچنے کے لیے ٹرین کو چار مختلف سرنگوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک سرنگ سے گزرنے کا دورانیہ تو ایک منٹ ہی ہوتا ہے۔ مگر گھپ اندھیرا ہونے کی وجہ سے مسافر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ میں اس دوران بھی دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ اور پیچھے جاتے ہوئے درختوں اور پہاڑی سلسلوں کا نظارہ کرتا رہا۔ تارا گڑھ سے پہلے ایک بڑی اونچائی آتی ہے کہ دیو ہیکل انجن کے لیے بھی اس سے آگے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اونچائی کے بعد اترائی آتی ہے جہاں پر تارا گڑھ کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ اسٹیشن کے دونوں طرف ہی تارا گڑھ قصبہ کی آبادی ہے۔ اس اسٹیشن کا شمار چھوٹے اسٹیشنوں میں ہوتا ہے۔ اس

لیے ہر ٹرین وہاں نہیں ٹھہرتی ہے۔ صرف پسنجر ٹرین اور خیبر میل وغیرہ وہاں رکتی ہیں۔ ٹرین کی آمد کے وقت اسٹیشن پر چہل پہل ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد ویرانی چھا جاتی ہے۔ اسٹیشن کے دونوں جانب دو دو سرنگیں ہیں جو یقیناً پاکستان بننے سے پہلے انگریزوں کے دور میں بنائی گئی تھیں۔ میرا خاص مریض یعنی نادیہ کا باپ سب سے طویل اور آخری سرنگ کا نگران تھا اور پھر اس سے کچھ میری منزل تھی۔

انجن بلندی کو سر کرنے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا۔ اس کی چھک چھک نہایت خوفناک انداز میں پرسکون وادی کو ہلا رہی تھی اور فضا میں سیاہ دھوئیں کا ایک دبیز بادل کسی اژدھے کی مانند جنم لے رہا تھا۔ گاڑی تین سرنگوں کی بھول بھلیوں سے گزر کر چوتھی سرنگ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تینوں سرنگوں کے نگران شام کی دھند میں لالٹین ہلاتے بہت پیچھے رہ گئے تھے اور اب چوتھی سرنگ کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ میں اپنے مریض کا جائزہ چلتی گاڑی ہی سے لینا چاہتا تھا۔ نفسیاتی مریضوں کی حرکات وسکنات ان کی لاعلمی میں دیکھی جائیں تو بعض اوقات مرض کی تشخیص میں آسانی ہوجاتی ہے۔

میں نے انجن سے آگے پٹری کے ساتھ ساتھ نظر دوڑائی تو دور ایک ننھی سی روشنی حرکت کرتی دکھائی دی۔ یقیناً اس لالٹین کا مالک ہی نادیہ کا باپ ہوگا۔ لحہ بہ لحہ لالٹین قریب آتی گئی اور پھر لالٹین والے کا ہیولہ بھی نظر آنے لگا۔ گاڑی شاید زبردست چڑھائی اور سامنے آتی ہوئی سرنگ کی وجہ سے آہستہ ہوگئی تھی۔ میں دروازے میں چوکس ہو کر کھڑا ہوگیا اور اس کی حرکات وسکنات۔ چہرے کے تاثرات اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ وہ پٹری کے بالکل ساتھ بنے ہوئے پختہ چبوتری پر ذرا پیچھے کھڑا لالٹین ہلا رہا تھا۔ قریب آنے پر میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پچاس سال کے لگ بھگ ایک صحت مند انسان تھا۔ جسم کچھ فربہی مائل تھا۔ ایک بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ وہ گاڑی کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ اس کی آنکھیں سرنگ کے دھانے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ لالٹین والا ہاتھ نشینی انداز میں ہلا رہا تھا پھر میرا ڈبہ اس کے قریب سے ہوتا ہوا گزر گیا۔ اب میں نے گردن موڑ کر دیکھنا شروع کیا تاکہ اس کے چہرے کے تاثرات واضح طور پر پڑھ سکوں۔ چہرے مہرے سے وہ خاصا مُدبر نظر آرہا تھا لیکن حواس باختگی کے آثار نمایاں تھے۔ اچانک میری نظر سب سے آخر ٹریلر پر پڑی جو گارڈ کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ گارڈ سفید وردی پہنے جنگلا تھامے قدرے باہر لٹک رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ وہ شاید چلا کر لالٹین والے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ جوں ہی اس کا ٹریلر لالٹین والے کے پاس سے گزرنے لگا۔ اس نے وہ گٹھڑی پختہ چبوترے پر دے ماری اور ٹریلر سے مزید باہر کی طرف لٹک کر اسے کچھ کہنے لگا۔ میں نے لالٹین والے کی طرف دیکھا اس کی نظریں ابھی تک سرنگ کی طرف ہی لگی تھیں۔ اس کے چہرے پر سخت گھبراہٹ کے آثار تھے۔ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور گارڈ کی سربریدہ لاش سنگلاخ زمین پر جا گری۔ سربریدہ اس لیے کہ گارڈ کا سر سگنل نما آہنی کھمبے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ میں حواس بحال کر کے گاڑی کی زنجیر کھینچتا۔ میرا ڈبہ سرنگ کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔ اس کے فوراً بعد تاراگڑھ کا اسٹیشن تھا۔ ٹرین رک گئی۔ میں پلیٹ فارم پر اترا۔ اور اسٹیشن پر اس کی باقاعدہ رپورٹ درج کرائی اور بوجھل قدموں سے ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

اگلا تمام دن سامان قرینے سے رکھنے اور سفر کی تھکان اتارنے میں گزر گیا۔ شام کی چائے پینے کے بعد میں یوں ہی سیر کی غرض سے باہر نکلا۔ پلیٹ فارم پر آیا۔ وہاں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم سے ہوتا ہوا میں سرنگ کی طرف چلنے لگا۔ کھلی فضا میں گرمی کم محسوس ہو رہی تھی۔ میں تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا سرنگ میں داخل ہوگیا۔ سرنگ خاص تاریک اور قوس کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ اندر جا بجا ابابیلوں اور

چمگادڑوں کے گھونسلے بنے ہوئے تھے اور ان کے فضلے کی بو نے ایک تعفن پیدا کر رکھا تھا۔ میں اس بُو سے نجات حاصل کرنے کے لیے تقریباً بھاگتا ہوا جوں ہی سرنگ کے دوسرے سرے پر نمودار ہوا۔ تو سرنگ کا نگران اپنی بینچ پر سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایک نفرت انگیز چیخ اُبھری اور وہ مخالف سمت میں بھاگ نکلا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کا تعاقب شروع کر دیا اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ ایک بوڑھا فربہ اور خوف زدہ شخص ایک نوجوان سے کب تک مقابلہ کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس بوڑھے کو جالیا۔ وہ میری گرفت میں آنے کے باوجود مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں گوشت پوست کا انسان نہیں کوئی ہوائی مخلوق ہوں۔

''تت۔ تت۔ تم؟'' شدید گھبراہٹ اور خوف سے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں ہلدی کی بارش ہو رہی تھی۔

''ہاں۔ بڑے میاں۔ میں آپ ہی کے محکمے کا ڈاکٹر ہوں۔ اور کل ہی یہاں پہنچا ہوں۔ آج یوں ہی سیر کرتے ہوئے اِدھر آ نکلا ہوں۔''

میں نے ایک ہی سانس میں اپنا تعارف کرا دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اسے جلد از جلد مطمئن نہ کیا تو کہیں میری گرفت میں ہی اس کی حرکتِ قلب بند نہ ہو جائے۔

بوڑھے نے ایک گہری سانس اپنے پھیپھڑوں میں اتاری۔ بے یقینی اور بے بسی سے میری طرف دیکھا اور اپنا جسم میرے بازوؤں میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں نے اسے سہارا دیا اور پھر ہم دونوں واپس کیبن کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ میں قریب پہنچ کر اسے کیبن کے اندر لے گیا۔ ایسا کرتے ہوئے بوڑھے نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرا رہے تھے۔ اپنے مختصر سے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ایک چارپائی پر گر کر ہانپنے لگا۔ میں قریب ہی پڑی ہوئی ایک خستہ حال کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ میز پر نہایت صاف دُھلا ہوا میز پوش، دو ٹرنک ایک طرف مٹی کے تیل کا چمکتا ہوا چولہا۔ گلاس، صراحی اور کتابوں کی ایک اوسط درجہ کی الماری۔ میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا وہ آنکھیں موندے، گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ مریض کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرلوں۔ میں کتابوں کے ریک کی طرف متوجہ ہوا۔ مریض کی ذہنی روش اور کسی خاص موضوع پر کتابوں کا انتخاب بھی اس کی نفسیاتی الجھنوں کو آشکار کر سکتا ہے۔ نفسیاتی مریض عموماً ایڈونچر، مہماتی، جاسوسی اور پُراسرار قسم کی کہانیاں یا پھر ظلم وتشدد اور جنسی لذت کے حامل ناولوں کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس بوڑھے نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کی الماری میں جہاں دانش کی یادوں کی بارات، قائداعظم کی سوانح، قاسم کی غلامی، خلافت اور ملوکیت، دشتِ فعار، دستِ سنگ اور بانگِ درا جیسی بلند پایہ مذہبی، ادبی اور شعوری کاوشات کا ذخیرہ تھا۔ جو اس کے صاف اور سلجھے ہوئے ذہن کی عکاسی کر رہا تھا۔ کمرے میں کہیں کہیں بے ترتیبی یا ایسی افراتفری کا نشان تک نہ تھا جو اس کے کسی ذہنی الجھاؤ کی چغلی کھا سکے۔ میں نے نادیہ کے بوڑھے باپ کی طرف دیکھا۔ اب وہ کافی سنبھل چکا تھا اور وہ چور نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''بڑے میاں! اب طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے نہایت نرم اور شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' بوڑھے نے بے دلی سے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ سراسیمگی کی پرچھائیاں اب بھی اس کے زرد چہرے پر ناچ رہی تھیں۔ میں کرسی سے اٹھا۔ میرے حرکت کرتے ہی وہ ایک دم چوکنا ہو گیا اور ایک بار تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اُٹھ کر مجھ پر حملہ ہی نہ کر دے۔ لیکن میں اطمینان اور آہستہ سے چلتا ہوا صراحی تک گیا۔ گلاس میں پانی انڈیلا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اٹھا کر پینے کا اشارہ کیا۔ بوڑھا جیسے جنم

جنم کا پیاسا تھا۔ ایک ہی سانس میں سارا گلاس چڑھا گیا میرے دل میں لاتعداد سوال سر اٹھا رہے تھے۔ لیکن ایک ماہر ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے فرض کی مکمل نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ میں نے نہایت شائستگی سے اس کی نبض کی رفتار اور دل کی دھڑکن کا جائزہ لیا۔ دونوں باقاعدگی سے چل رہی تھیں۔

''اچھا بڑے میاں! اب میں چلتا ہوں۔ کل مزاج پرسی کے لیے پھر حاضر ہوں گا۔ اگر طبیعت پھر ناساز ہو جائے تو بلا تکلف مجھے ڈاک بنگلے سے یا پھر ڈسپنسری سے بُلوا لیجیے گا۔''

میں نے اس جملے کی ادائیگی میں اپنائیت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔

تجربہ شاہد ہے کہ نفسیاتی مریضوں کا اعتماد حاصل کرنا بعض اوقات معالج کے تمام مسائل حل کر دیتا ہے۔ گارڈ کے کمرے سے نکلتے ہی مجھے سرنگ کے اس تعفن کے خیال سے متلی سی آنے لگی جس میں سے گزر کر مجھے واپس ڈاک بنگلے پر پہنچنا تھا۔

اگلے روز میں نے ڈسپنسری کا چارج سنبھال لیا اور مریضوں کی خدمت میں مگن ہو گیا۔ اگلی چند ملاقاتوں نے بوڑھے کو ایک کھلی کتاب بنا دیا۔ میں نے اس سے ابھی تک نادیہ اور اس سے ملاقات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جب مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے تو پھر نادیہ کے بارے میں بات کروں گا۔ جوں جوں اس کی کتاب کے صفحات الٹتے گئے وہ ایک ناقابلِ حل قصہ بنتا گیا۔

☆☆☆

نادیہ کے باپ کا نام گلزار علی تھا۔ تھا تو وہ مہاجر۔ مگر وہ ذہنی طور پر جنم جنم کا پاکستانی تھا۔ دل میں اسلامی اتحاد اور یگانگت کا درد رکھتا تھا۔ غالب سے اقبال۔ اور میرا امن سے میرا جی تک بڑے متوازن اور رواں انداز میں تبصرہ کر سکتا تھا۔ اس کی عالمی سیاست پر بھی گہری نظر تھی۔ جن بھوتوں، تعویذ گنڈوں، پیروں فقیروں اور بدروحوں وغیرہ کے متعلق بھی اُس کا ذہن صاف اور رائے بے لاگ تھی۔ اس پس منظر کے ساتھ جب میں نے اس کی ناقابلِ یقین داستان سنی تو اس کی ذہنی الجھن یا کسی نفسیاتی مرض کا سراغ لانا جوئے شیر لانے کے برابر دکھائی دیا بلکہ سچ تو پوچھیے تو اس کی کہانی نے خود مجھے بھی بوکھلا دیا تھا۔

☆☆☆

گلزار علی کے بیان کے مطابق ایک روز مسافر گاڑی کو گزارنے کے لیے جوں ہی وہ جھنڈی پکڑ کر پختہ چبوترے کی طرف آیا تو اچانک سرنگ کے دہانے پر ایک شخص نمودار ہوا۔ اور وہاں ہی کھڑے کھڑے اس نے گلزار علی کی سمت دایاں ہاتھ اٹھایا۔ اس کے ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ پھر گلزار علی نے دیکھا کہ اس نے درمیانی اور شہادت کی انگلیوں کو 'V' کی شکل بنا کر بلند کیا اور ہوا میں لہرانے لگا۔ گلزار علی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ اس کی طرف بڑھا تاکہ اس کے قریب جا کر اس سے اس اشارے کی وضاحت طلب کرے۔ لیکن جوں جوں گلزار علی آگے بڑھتا گیا۔ وہ شخص قدم بہ قدم پیچھے ہٹتا گیا اور آخر کار سرنگ کے پرتعفن اندھیرے میں گم ہو گیا۔ گلزار علی ابھی اسے تلاش کر ہی رہا تھا کہ ریل کی چھک چھک۔ چھکا چھک سنائی دی۔ وہ فوراً مڑا اور دوڑتا ہوا اپنی جگہ پر پہنچا اور جھنڈی ہلا کر ریل کو سب اچھا کا اشارہ دینے لگا۔

ریل آئی اور بھاگتی ہوئی سرنگ میں داخل ہو گئی۔ وہ بمشکل سرنگ سے نکلی ہو گی کہ گلزار علی کو مسافروں کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ غیر ارادی طور پر بھاگتا ہوا سرنگ میں داخل ہو گیا اور جب وہ پلیٹ فارم والے سرے کی طرف نکلا تو جو منظر اس نے دیکھا۔ اس نے اسے ساکت کر دیا۔ سامنے پٹڑی پر دو عورتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ وہ دونوں ماں بیٹی تھیں ان دونوں کا دھڑ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ بیٹی شاید نوبیاہتا تھی اور بہتا ہوا لہو اس کے سہاگ کے جوڑے کو مزید سرخ بنا رہا تھا۔ گاڑی سامنے تارا گڑھ کے پلیٹ فارم پر رک چکی تھی اور لوگ بھاگتے ہوئے ان بدنصیب ماں بیٹی کی خودکشی کا نظارہ کرنے آ رہے تھے۔ گلزار علی بھی وہ منظر دیکھ کر

خوف زدہ ہوگیا کہ اس کی آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا مگر آواز اس کا ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اس کے ذہن میں جو بات چپک کر رہ گئی تھی۔ وہ نوجوان لڑکی کی لاش کے ساتھ ساتھ اس پراسرار شخص کی تصویر اور اشارہ تھا جو اس نے انگلیوں کی مدد سے بنایا اور کیا تھا۔

اس دن کے بعد آج تک چھ ماہ گزر چکے تھے اور ان چھ مہینوں میں وہ پراسرار شخص تین بار سرنگ کے دہانے پر نمودار ہوا۔ تینوں مرتبہ ہی گلزار علی نے اسے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کا اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے اشارے کے فوراً بعد سرنگ سے ذرا پیچھے یا پلیٹ فارم سے پہلے ایک نہ ایک جان حادثاتی طور پر ضائع ہوگئی تھی اور میری آمد والے روز تو بے چارے گلزار علی کا ایک رشتہ دار گارڈ ہلاک ہوگیا تھا۔ اس روز بھی گلزار علی اس پُراسرار شخص کی طرف متوجہ ہوا اور گارڈ اسے دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑے پکڑانے کے لیے اس قدر باہر لٹک گیا تھا کہ اس کا سر چبوترے کے کھمبے سے ٹکرا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز کسی بھی پُراسرار شخص کو سرنگ کے دہانے پر انگلیاں لہراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی سرنگ کے اندر یا اس سے آگے کوئی انسان نظر آیا تھا۔ لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ کیونکہ نفسیاتی مریضوں کو ایسے خیالی پیکر عالم بیداری میں دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ سوچنے کی بات صرف یہ تھی کہ یہ خیالی پیکر حادثے سے پہلے کیوں نمودار ہوتا ہے۔

''میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ شاید گلزار علی کی چھٹی حِس ضرورت سے زیادہ بیدار ہے اور یہ سب اس کی کرشمہ سازی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے رہ رہ کر احساس ہوتا تھا کہ گلزار علی اب تک اس داستان کی کوئی نہ کوئی کڑی مجھ سے چھپا رہا ہے۔ میری مسلسل کرید پر جب وہ کڑی واضح ہوئی تو مجھ پر اتنی زبردست بوکھلاہٹ کا حملہ ہوا کہ اگر میں اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی کرتا تو یقیناً ناکام رہتا۔ گلزار علی کے بیان کے مطابق اس پراسرار ہستی کی شکل ہوبہو مجھ سے ملتی تھی۔

''خدا کی قسم ڈاکٹر صاحب! میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے دائیں گال پر اتنا ہی بڑا سیاہ تل ہے۔'' اس نے میرے دائیں گال پر ایک تل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے دن آپ کو سرنگ سے نکل کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر ہی میں خوف سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔''

کسی اور کے لیے ہو تو ہو۔ کم از کم ڈاکٹر جو نفسیات کا ماہر بھی ہو۔ اُس کے لیے یہ بات قطعاً قابل فخر نہ تھی کہ وہ کسی مریض کے لاشعور میں کوئی شیطانی روپ دھار کر ایک منحوس کردار ادا کرتا پھرے۔ اب تک تو میں اس معاملے کو معمول کا ایک کیس سمجھ کر نمٹا رہا تھا۔ لیکن اس انکشاف کے بعد میں نے اسے اپنے لیے ایک چیلنج کے طور پر قبول کرلیا۔ میں نے ایک بار پھر گلزار علی سے اس کے خاندانی حالات اور پیدائش سے لے کر اب تک کے واقعات پوری تفصیل سے سنے۔ تو مجھے ایک اور حیران کن انکشاف کا سامنا کرنا پڑا۔ نادیہ اس کی بیٹی تھی۔ مگر وہ دو سال قبل کسی پراسرار بیماری میں مبتلا ہوکر مرگئی تھی۔ تو پھر وہ نادیہ کون تھی جو مجھے پہاڑی مقام کے ہوٹل میں ملی تھی۔ جس نے مجھ سے محبت کا اقرار کیا تھا۔ اور اپنے باپ کے علاج کے لیے کہا تھا۔ میں تو چکرا کر رہ گیا کہ یہ سب کیا ہے؟

میں نے گلزار علی سے نادیہ کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اور اس کی باتوں کا باریکی کے ساتھ تجزیہ کیا اور مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اپنے وسیع تجربے کے باوجود مجھے ایک بھی ایسا نفسیاتی نکتہ نہ مل سکا جسے پکڑ کر میں اس کی الجھی ہوئی ڈوری سلجھا سکوں۔

سرنگ کے دہانے پر ہم شکل شخص کا نمودار ہوکر ہاتھ کی دو انگلیوں کا اشارہ کرنا۔ اور نادیہ کا پہاڑی مقام کے ہوٹل میں آخری بار مجھے اسی طرح دو انگلیوں کو V کی شکل بنا کر الوداع کہنا۔ یہ کیسی مماثلت تھی؟ ناقابلِ یقین اور پُراسرار۔

☆☆☆

گلزار علی سے میں نے وہاں سے گزرنے والی تمام گاڑیوں کے اوقات معلوم کیے۔ آخری حربے

کے طور پر میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ میں تمام گاڑیوں کے آمدورفت کے وقت میں گلزار علی کے ساتھ موجود رہوں۔ اور اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لوں بلکہ اگر وہ میرا ہمزاد سامنے آئے تو اس سے بھی دو دو ہاتھ کر سکوں۔ میں ڈسپنسری کو تو بھول ہی گیا اور اسی کام میں لگ گیا۔ اگلے اکیس دن اسی ڈیوٹی میں گزر گئے۔ گلزار علی کبھی کبھی ہنس کر کہتا۔

''صاحب جی! آپ ڈاکٹری سے زیادہ بہتر گارڈ کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔''

میں اُس کے اِس جملے میں چھپے ہوئے طنز کو برداشت کر جاتا۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ پیشہ...... خدا خدا کر کے اکیسویں روز ہماری محنت رنگ لائی۔ شام کا جھٹپٹا تھا۔ شہر سے مسافر گاڑی کی آمد تھی۔ ہوا کا ایک آدھ جھونکا۔ چھک چھک چھکا چھک کی آواز اڑاتا ہوا معدوم ہو جاتا۔ گلزار علی نے لالٹین جلائی اور پختہ چبوترے کی طرف چلنے لگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ اپنے مخصوص چبوترے پر کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے دو تین قدم آگے سرنگ کی جانب ٹھہر گیا اور شہر کی سمت نظریں جما دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد پٹڑی پر دیوہیکل انجن نمودار ہوا۔ اس کی چمنی سے گاڑھا کثیف دھواں اور شکم سے نہایت خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ جیسے وہ بلندی کو سر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے پوری وادی میں زلزلہ آ گیا ہے۔ پُراسرار ماحول اور ملگجے اجالے میں گلزار علی کی ہلتی ہوئی لالٹین کی روشنی سایوں سے دست وگریبان تھا۔ اچانک میری نگاہ گلزار علی پر پڑی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی ہوئی تھیں اور لالٹین والا ہاتھ انداز میں ہل رہا تھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں۔ میں نے سرنگ کے دہانے کی طرف دیکھا لیکن وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح ویرانی آج بھی رقص کر رہی تھی یا پھر چند ابابیلیں تھیں جو شاید انجن کے بے ہنگم شور سے گھبرا کر سرنگ کے دہانے پر پھڑپھڑا رہی تھیں۔

''گلزار علی...... گلزار علی۔'' میں نے قریب آتی ہوئی ریل کے شور میں اسے پکارا۔ لیکن وہ تو جیسے پتھر کا بُت بن چکا تھا۔ جس پر کوئی آواز اثر نہیں کرتی۔ آخر میں نے قدم بڑھا کر اسے شانوں سے پکڑا اور جھنجوڑ ڈالا۔ ''گلزار علی...... گلزار علی۔''

''وہ دیکھو ڈاکٹر! وہ اشارہ کر رہا ہے۔ ایک عجیب وغریب اشارہ۔''

اس کے اَدھ کھلے منہ سے ایک عجیب آواز نکلی۔ لیکن آنکھیں بدستور سرنگ کے دہانے پر جمی رہیں۔ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نا غم، نا خوشی، نا مذاق، نا اداکاری، نا حقیقت۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک لاش کے پاس کھڑا ہوں۔ ایسی لاش جس کا صرف ایک لالٹین والا بازو زندہ ہے۔ میں نے اپنی عملی زندگی میں بے شمار مریضوں کو نفسیاتی دورے پڑتے دیکھے ہیں۔ لیکن تارا گڑھ کی آخری سرنگ کے اس بوڑھے گارڈ کا دورہ میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ مریض کا نفسیاتی دورہ معالج کے لیے ایک سنہرا موقع ہوتا ہے۔ اگر وہ اس وقت زیر غور وفکر سے کام تو مرض کی تہہ تک پہنچنا خاصا آسان ہو جاتا ہے۔ بعض مریضوں کے نفسیاتی دوروں کو جلد از جلد ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کیس میں ایسا کرنا مناسب نہ تھا۔ میں پورے دورے کی مدت میں بڑے صبر وتحمل سے گلزار علی کی حرکات وسکنات دیکھنا اور اس کی تمام بے سروپا باتیں سننا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کے شعور میں چھپی ہوئی الجھن کا تجزیہ کر سکوں۔

''عجیب وغریب اشارہ؟ کیا آج وہ کوئی نیا اشارہ کر رہا ہے؟'' میں نے کافی بلند آواز میں پوچھا۔ قریب آتی ہوئی ریل کا انجن جیسے نزدیک آ کر ہانپنے لگا تھا۔

''ہاں ڈاکٹر! وہ آج ڈیڑھ انگلی کا اشارہ دے رہا تھا۔''

''ڈیڑھ انگلی کا اشارہ۔ کیا مطلب؟''

''ہاں...... ہاں...... وہ دیکھو بالکل تم جیسا آدمی۔ درمیانی انگلی کھڑی ہے اور شہادت کی انگلی کو

درمیان سے خم دیے دائیں ہاتھ کی مٹھی ہوا میں لہرا رہا ہے۔

میں نے دیکھا گلزار علی اس مدہوشی کے عالم میں لالٹین ہلا ہلا کر ریل کو سب اچھا کا سگنل دے رہا ہے یہ اس کے مرض کا ایک قابل غور پہلو تھا۔ میں نے ریل کی طرف دیکھا۔ وہ تقریباً آدھے فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ پٹری بالکل صاف تھی اور دونوں طرف دُور دُور تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دے رہا تھا۔ سرنگ والے اس طرف اگلے چند ثانیوں میں کسی حادثے کا کوئی امکان نہ تھا۔ لہٰذا میں اطمینان سے دوبارہ اپنے مریض کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"گلزار علی! ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ وہ شخص۔"

"وہ دیکھو ڈاکٹر۔ سرنگ کی دیوار کے ساتھ وہ۔ وہ سرنگ کی بل کھاتی ہوئی دیوار کے ساتھ اب وہ آہستہ آہستہ پیچھے کھسک رہا ہے۔"

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔ کیا اب بھی وہ کوئی اشارہ دے رہا ہے؟"

"ہاں ڈاکٹر۔ ڈیڑھ انگلی کا اشارہ۔ دیکھو اب وہ کچھ اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔"

میں نے دیکھا گلزار علی پلیٹ فارم کے کنارے لگے ہوئے کھمبے کو پکڑ کر اسے دیکھنے کے لیے پٹری کی طرف جھکا ہوا ہے۔ اچانک وہ زیادہ لٹک گیا۔ اور پورے زور سے چیخا۔

"دیکھو ڈاکٹر! اب وہ پھر سامنے آ گیا ہے۔"

میں فوراً سرنگ کی طرف گھوما۔ اور چند ثانیے سرنگ کے اندھیرے میں اس پراسرار شخص کی تلاش میں نظریں گھماتا رہا۔ یکایک سرنگ سے پانچ ابابیلیں پھڑ پھڑاتی ہوئی برآمد ہوئیں۔ میں بے اختیار ہنس پڑا اور بولا۔

"یہ ہے وہ آدمی کیوں گلزار علی؟" میں نے اس جملے کا ردعمل مریض کے چہرے پر دیکھنے کے لیے اپنی ایڑیوں پر گھومنے ہی والا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں ایک زبردست دھما کہ سنائی دیا اور اس کے فوراً بعد یوں محسوس ہوا کہ جیسے گوشت کے گرم گرم لوتھڑے میری گردن سے چپک گئے ہوں،

ابھی میں بمشکل پیچھے گھوما ہی تھا کہ گلزار علی کی سرکٹی لاش پورے زور سے مجھ پر آن گری۔ اس کا سر پٹری کی طرف بہت زیادہ جھک جانے کی وجہ سے پہلے ڈبے کے کونے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا تھا۔ میں اس اچانک بوجھ کو برداشت کرنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ لہٰذا اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا اور گلزار علی کے مردم جسم سمیت چبوترے سے نیچے پٹری کے کنارے جاگرا۔ ریل ایک مشینی آرے کی طرح چلتی رہی اور میں بے ہوشی کے اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

اس حادثے کے آٹھ دن بعد میں ہوش میں آیا تو میں راولپنڈی کے ریلوے اسپتال کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے چیف میڈیکل آفیسر اور ڈاکٹر رباب کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ ان کے چہروں پر تشویش کی گہری پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

''سر! کیا سرنگ والے حادثے میں گلزار علی کے ساتھ کوئی اور جان بھی ضائع ہوئی تھی؟'' میں نے اپنی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''نہیں صرف گلزار علی ہی ہلاک ہوا تھا۔'' چیف میڈیکل آفیسر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈاکٹر رباب کی آنکھیں بھی برسنے لگیں۔ ان دونوں کی آواز رندھ گئی۔ میں سمجھا کہ ان کو گلزار علی کی موت کا دکھ ہوا ہے۔

''تو پھر ڈیڑھ انگلی کے اشارے کا کیا مطلب تھا؟'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

اتنے میں میرے والدین اور بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے کہنیاں ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ درد کی شدید لہر میرے بدن میں بجلی کی طرح کوندی اور ایک دلخراش چیخ میرے ہونٹوں سے نکل کر کمرے میں پھیل گئی۔ پراسرار اشارے کا مطلب مجھ پر پوری طرح واضح ہو چکا تھا۔

میری دونوں ٹانگیں ریل کے پہیوں تلے کٹ کر میرے جسم سے الگ ہو چکی تھیں۔ اور بغیر ٹانگوں کا آدمی۔ آدھا ہی تو ہوتا ہے۔ ادھورا اور نامکمل انسان۔ ریلوے اسپتال کے بستر پر میں دو ماہ لیٹا رہا۔ اس دوران میں...... میں نے گزشتہ دو ماہ قبل پیش آنے والے تلخ لیکن حیرت انگیز واقعات کا کافی حد تک تجزیہ کرنے کے بعد انہیں نفسیات کے کسی نہ کسی خانے میں فٹ کر ہی لیا تھا۔ لیکن دو ماہ بعد ایک ایسی خبر سننے میں آئی۔ جس نے میرے سارے تجزیے۔ نفسیاتی فلسفے کے علم کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔

☆☆☆

میرے خیال میں علم نفسیات کی لاج رکھنے کے لیے مجھے ایک بار پھر تاراگڑھ کے مقام پر جانا پڑے گا۔ وہ خبر کچھ یوں تھی۔ کہ تاراگڑھ کی سرنگ کے نئے انچارج امیر حسین کی آنکھوں کے سامنے ایک شخص نے ریل کے نیچے آ کر خودکشی کر لی تھی۔ لیکن اس حادثے سے قبل امیر حسین نے ایک پراسرار شخص اور ایک عورت کو سرنگ کے دہانے پر نمودار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دونوں اپنی ایک ایک انگلی لہرا کر اس سے 'V' کا نشان بنا رہے تھے۔ اس پراسرار شخص کے دائیں گال پر ایک سیاہ تل تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں جڑوں سے کٹی ہوئی تھیں اور وہ اس عورت کے ساتھ بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا سرنگ کے اندھیرے سے روشنی میں آیا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ وہ عورت گلزار علی کی بیٹی نادیہ تھی۔

مگر میں اب تاراگڑھ کیسے جاتا۔ معذور جو تھا۔ پھر بھی میں نے ضد کی۔ مگر مجھے رُباب نے دوبارہ تاراگڑھ نہیں جانے دیا کیونکہ اب وہ میری بیوی ہے۔ اس کی محبت سچی تھی کہ اب بھی وہ مجھے بے حد پیار کرتی ہے۔ میری زندگی اب اس کی محتاج ہے۔ وہ مجھے محبت بھری مسکراہٹ سے دیکھتی ہے تو میں اپنے ادھورے ہونے کے احساس کو بھول جاتا ہوں۔

☆☆☆

درمیان سے خم دیے دائیں ہاتھ کی مٹھی ہوا میں لہرا رہا ہے۔

میں نے دیکھا گلزار علی اس مدہوشی کے عالم میں لالٹین ہلا ہلا کر ریل کو سب اچھا کا سگنل دے رہا ہے یہ اس کے مرض کا ایک قابل غور پہلو تھا۔ میں نے ریل کی طرف دیکھا۔ وہ تقریباً آدھے فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ پٹری بالکل صاف تھی اور دونوں طرف دُور دُور تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دے رہا تھا۔ سرنگ والے اس طرف اگلے چند ثانیوں میں کسی حادثے کا کوئی امکان نہ تھا۔ لہٰذا میں اطمینان سے دوبارہ اپنے مریض کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''گلزار علی! ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ وہ شخص۔''

''وہ دیکھو ڈاکٹر۔ سرنگ کی دیوار کے ساتھ وہ۔ وہ سرنگ کی بل کھاتی ہوئی دیوار کے ساتھ اب وہ آہستہ آہستہ پیچھے کھسک رہا ہے۔''

''مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا۔ کیا اب بھی وہ کوئی اشارہ دے رہا ہے؟''

''ہاں ڈاکٹر۔ ڈیڑھ انگلی کا اشارہ۔ دیکھو اب وہ کچھ اوجھل ہوتا جارہا ہے۔''

میں نے دیکھا گلزار علی پلیٹ فارم کے کنارے لگے ہوئے کھمبے کو پکڑ کر اسے دیکھنے کے لیے پٹری کی طرف جھکا ہوا ہے۔ اچانک وہ زیادہ لٹک گیا۔ اور پورے زور سے چیخا۔

''دیکھو ڈاکٹر! اب وہ پھر سامنے آگیا ہے۔''

میں فوراً سرنگ کی طرف گھوما۔ اور چند ثانیے سرنگ کے اندھیرے میں اس پراسرار شخص کی تلاش میں نظریں گھماتا رہا۔ یکایک سرنگ سے پانچ ابابیلیں پھڑپھڑاتی ہوئی برآمد ہوئیں۔ میں بے اختیار ہنس پڑا اور بولا۔

''یہ ہے وہ آدمی کیوں گلزار علی؟'' میں نے اس جملے کا ردعمل مریض کے چہرے پر دیکھنے کے لیے اپنی ایڑیوں پر گھومنے ہی والا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں ایک زبردست دھماکہ سنائی دیا اور اس کے فوراً بعد یوں محسوس ہوا کہ جیسے گوشت کے گرم گرم لوتھڑے میری گردن سے چپک گئے ہوں،

پکوڑے گرم......



ممتاز احمد

اُس نوجوان کا قصہ عبرت، جس کے در پر قسمت مہربان ہونے ہی والی تھی کہ......

میرا نام ظہیر ہے۔ اللہ نے اچھی شکل وصورت سے نوازا ہے۔ لمبا قد گورا رنگ، کلین شیو ایک جاذب نظر شخصیت کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ میں صنف مخالف کے لیے کشش رکھتا تھا۔ گھر میں مالی تنگی کی وجہ سے حالات بدحالی کا شکار تھے۔ واحد کمانے والے والد صاحب تھے جو کہ ایک بس کے کنڈیکٹر تھے۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکلتے اور رات گئے واپس لوٹتے۔ میرے علاوہ دو بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ سب سے بڑی بہن تھی اُس کے بعد میرا نمبر تھا۔ والدہ صاحبہ نے ایک سلائی مشین رکھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار محلے سے یا اردگرد کے علاقے سے سلائی کے لیے کپڑے آجاتے تو اماں بھی گھر بیٹھے چار پیسے کما لیتی تھیں۔ بڑی بہن فرخندہ ایف اے کر کے گھر داری میں اور اماں کا ہاتھ بٹانے میں مصروف رہتی۔ میں نے گرتے پڑتے گریجویشن کر لیا تو زور وشور سے نوکری کی تلاش شروع کر دی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات بغیر سفارش اور رشوت کے مجھ جیسے فقرے اور کنگلے کو نوکری کیسے ملتی۔

بالآخر کافی سر توڑ کوشش اور بھاگ دوڑ کے بعد مجھے ایک انشورنس کمپنی میں بطور انشورنس ایجنٹ کی جاب تو مل گئی مگر جب تنخواہ کی بات ہوئی تو کہا گیا کہ جتنی انشورنس پالیسیاں سیل کرو گے تو ہر پالیسی کے عوض معقول کمیشن دیا جائے گا۔ جتنی زیادہ پالیسیاں فروخت کرو گے اتنا ہی زیادہ کمیشن بنے گا۔ چاروناچار میں نے یہ جاب قبول کر لی۔

پہلا پورا مہینہ ٹریننگ دی جاتی رہی کہ کمپنی کی کیا کیا پالیسیاں ہیں اور کتنا پریمیم ہے۔ کسٹمر کو کس طرح پالیسی لینے کے لیے قائل کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ٹریننگ کے اختتام پر مختلف بروشرز، پالیسیوں کے تعارف کے کاغذات دیے گئے ساتھ ہی ہدایات جاری کی گئیں کہ روزانہ شیو بنانی ہے، پینٹ، شرٹ، ٹائی میں ملبوس رہنا ہے۔ جوتے پالش ہوں۔ الغرض اِدھر اُدھر سے کچھ قرض مانگ تانگ کر کچھ پتلون شرٹس اور جوتے خریدے اور ایک چھوٹے سے بیگ کے ساتھ کلائنٹس کی تلاش میں سارا دن مختلف دفاتر، مارکیٹس اور دکانوں کے چکر لگاتا رہتا۔

ایک ماہ کی خجل خواری کے بعد بڑی مشکل سے ایک کسٹمر بیمہ پالیسی خریدنے پر آمادہ ہوا چنانچہ اُس کے عوض جو کمیشن ملی وہ قرض ادا کرنے میں پوری ہوگئی اس کے بعد چھ ماہ کی مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد



بمشکل تین یا چار پالیسیاں بیچنے میں کامیاب ہو سکا۔

اب یہ ہونے لگا کہ لوگ مجھ سے دور بھاگنے لگے کہ یہ لیچڑ انشورنس ایجنٹ ہمارا دماغ کھائے گا مگر میں اپنی جگہ پر مجبور تھا۔

ایک روز بہت بڑی مارکیٹ میں مختلف شاپس پر جاکر باری باری دکانداروں کے پاس جاکر بیمہ پالیسی کے فوائد بیان کرنے لگا تو اکثر نے میری باتیں سنی ان سنی کر دیں لیکن ایک بہت بڑے جنرل اسٹور کے مالک نے تھوڑی سی توجہ سے میری باتیں سنیں پھر وہ مجھ سے جان چھڑانے کے لیے کہنے لگا کہ دو چار دن کے بعد پھر کسی وقت آؤں وہ غور وخوض کے بعد بتائے گا اور کہا کہ آنے سے پہلے فون کر کے آؤں تو اُس نے مجھے اپنا موبائل نمبر بتایا جو کہ میں نے اپنے معمولی اور سستے سے سیل میں محفوظ کر لیا۔

چند روز گزرے تو میں نے اُس کے دیے ہوئے نمبر پر کال ملائی۔ چوتھی یا پانچویں بیل پر کسی نے کال اٹینڈ کی میں نے السلام علیکم کہا تو ایک نسوانی آواز میں سلام کا جواب ملا اور مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کون ہوں اور کس سے بات کرنی ہے؟“

میں نے اپنا نام اور تعارف کے بعد بتایا کہ طارق صاحب سے بات کرنی ہے۔ اس پر وہ لڑکی یا خاتون کہنے لگی یہ تو اس کا اپنا ذاتی نمبر ہے۔ آپ نے شاید غلط نمبر ملایا ہے۔“ میں نے بتایا کہ چند روز پہلے طارق صاحب سے اُن کے فلاں جنرل اسٹور پر ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے یہی نمبر دیا تھا۔ مگر لڑکی نے سختی سے انکار کیا کہ میرے نمبر سے کسی طارق نامی آدمی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آپ نے درست نمبر Save نہ کیا ہو۔ چنانچہ اس نے سوری کہہ کر کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ کال تو ختم ہو چکی تھی مگر میں اُس لڑکی کی آواز میں کھو سا گیا، کیونکہ اُس کی آواز مجھے بہت بھلی لگی۔ میرا بہت دل کر رہا تھا کہ دوبارہ اُسے کال کروں اور اُس کی آواز سنتا رہوں مگر مجھ میں کال کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ مبادا کہیں وہ میری بے عزتی ہی نہ کر دے۔ شام تک اُس کی کھنکتی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔

رات کو سونے کے لیے لیٹا تو اس نمبر پر ایک

اچھا سا فارورڈ SMS بھیج دیا۔ اسی طرح ہر صبح کو گڈ مارننگ کا میسج، کبھی کوئی اچھی سی شاعری اور رات کو گڈ نائٹ کا میسج بھیج دیتا۔ کوئی چار پانچ دن کے بعد اُسی نمبر سے مجھے بھی میسج آنے لگے۔ ابتدائی تعارف کے بعد ہماری میسج پر بات ہونے لگی دن کو کبھی کبھی کال پر بھی بات ہوجاتی اور یہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہوگیا۔

اُس نے اپنا نام ماروشہ بتایا۔ وہ جہلم کی رہنے والی تھی۔ اُس نے اپنی عمر 32 سال بتائی۔ اس کا چار سال کا ایک بیٹا تھا۔ وہ جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ اس کے خاوند کی دو سال پہلے موت واقع ہوگئی تھی۔ خاندانی دشمنی کے نتیجے میں اس کا قتل ہوگیا تھا۔ ماروشہ اپنے بیٹے کے ساتھ تنہا رہتی تھی اس کے مرحوم خاوند کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جہاں مختلف پراڈکٹس تیار ہوتی تھیں۔ اس کے ملازم سارا انتظام سنبھالتے تھے۔ وہ تنہائی کا شکار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ روزانہ تین سے چار گھنٹے ہماری کال پر بات ہوتی۔ ڈیڑھ دو ماہ کے بعد اُس نے ملاقات کرنے کا کہا تو میں فوراً تیار ہوگیا۔

دو روز کے بعد اُس نے مجھے جہلم بلایا چنانچہ اگلے روز اپنے ایک دوست سے کچھ پیسے لیے اور گھر والوں سے بہانا بنایا کہ آفس کے کام کے سلسلے میں جہلم جانا ہے۔

اگلے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق میں خوب بن ٹھن کے دس بجے والی ٹرین کے ذریعے دوپہر ایک بجے جہلم پہنچ گیا۔

مجھے بہت بے چینی سی ہورہی تھی اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اُس نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر لینے آنا تھا۔ جیسے ہی ریلوے اسٹیشن سے باہر آیا وہ بتائی ہوئی مقررہ جگہ پر میری منتظر کھڑی تھی۔ میری نگاہ جب اُس پر پڑی تو اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ماروشہ کا رنگ گندمی، نین نقش تیکھے سیاہ گھنیری زلفیں، سڈول جسم ہر عضو پُرکشش تھا۔ اُس نے اپنی عمر بتیس سال بتائی تھی مگر وہ پچیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس کا چار سالہ بیٹا آیان بھی اس کے ساتھ تھا۔

سلام دعا کے بعد ماروشہ نے ایک رکشہ والے کو بلایا اور ایک مشہور ریسٹورنٹ کی طرف چلنے کو کہا۔ پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد ہم ایک شاندار ریستوران پہنچے۔

اُس نے ایک مہنگے لنچ کا آرڈر لکھوایا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ لنچ بہت پرتکلف تھا۔ بہترین اور پرسکون ماحول میں ہم نے کھانا کھایا اور خوب باتیں کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں میں نے ماروشہ سے کہا کہ معاف کرنا پہلی ملاقات ہے مگر میں آپ کے لیے کوئی تحفہ نہیں لا سکا۔ کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ غریب لڑکا ہوں۔ آپ کے شایان شان تحفہ لینے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ تھوڑا ناراض ہوئی اور کہنے لگی۔

”ظہیر تمہاری دوستی میرے لیے سب سے بڑا تحفہ ہے اور اتنی بڑی بات یہ ہے کہ صرف میری خاطر تم مجھ سے ملنے کے لیے اتنی دور سے آئے ہو۔“ میں جب بھی اُس سے بات کرتا تو اسے آپ کہہ کر مخاطب کرتا اُس نے منع کیا کہ آپ جناب کے القاب استعمال نہ کیا کرو سیدھا سیدھا تم کہہ کر بلایا کرو۔ میں نے کہا آپ مجھ سے گیارہ سال بڑی ہیں۔ اس پر وہ بولی کہ دوستی میں عمر کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بڑا چھوٹا نہیں دیکھا جاتا۔ دوستی تو بس دوستی ہوتی ہے۔“

باتیں کرتے کرتے تین گھنٹے گزر گئے اور ہمیں پتا ہی نہ چلا بوقت رخصت ماروشہ نے مجھے ایک نیو ڈبہ پیک موبائل اور نقد پانچ ہزار روپے دینے چاہے تو میں نے انکار کردیا۔ اُس کے بہت اصرار کرنے اور دوستی ختم کرنے کی دھمکی دی تو میں وہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ مگر اندر سے مجھے بہت شرم آرہی تھی کہ ایک لڑکی سے نیا موبائل اور پانچ ہزار روپے لے رہا ہوں مگر اُس کے مجبور کرنے پر بادل نخواستہ دونوں لینے پڑے۔

ماروشہ نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ مجھے الوداع کیا اور میں شام والی ٹرین پر واپس اپنے

شہر آنے کے لیے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ماروشہ سے روزانہ کال پر خوب لمبی باتیں ہوتیں۔ میں نے اُسے اپنے تمام مکمل حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ میری سوچ یہ تھی کہ دوستی ایک مقدس رشتہ ہے اور جسے دوست کہہ دیا جائے تو اُس سے کسی قسم کا جھوٹ نہیں بولنا چاہیے کیونکہ جس رشتے کی بنیاد جھوٹ پر ہو وہ کبھی بھی پائیدار اور دیرپا نہیں ہوتا یہی وجہ تھی کہ میں اپنی ہر بات ماروشہ سے شیئر کر لیتا اور ہمیشہ اُس سے سچ بولتا۔

اگلے چار ماہ میں ہماری تین اور ملاقاتیں ہو چکی تھی اور ہر بار ماروشہ نے مجھے جہلم بلایا اُسی ریستوران میں ہماری ملاقات ہوتی جس میں پہلی بار کھانا کھایا تھا۔ مجھے کئی بار سوچ آتی کہ ماروشہ نے تو بتایا تھا کہ وہ تنہا رہتی ہے مگر اُس نے ایک بار بھی اپنے گھر نہیں بلایا اور نہ ہی گھر کا ایڈریس وغیرہ بتایا۔ ایک دو بار اُس سے اس بات کا ذکر کرنے لگا تھا مگر خاموش رہا کہ کہیں وہ بُرا ہی نہ مان جائے دوسرا یہ نہ سوچے کہ گھر پر ملاقات کا کیوں کہہ رہا ہوں۔

پچھلے کچھ دنوں سے میں ایک کلائنٹ کے ہاں چکر لگا رہا تھا کہ وہ کوئی بیمہ پالیسی لے لے۔ وہ بار بار مجھے چکر لگوا رہا تھا مگر ابھی تک اس نے نہ تو فائنل ہاں کی اور نہ ہی پالیسی کے کاغذات وغیرہ پر دستخط کر کے دیے تھے وہ روزانہ یہی کہتا کہ کل آ جاؤ، کبھی کہتا پرسوں آ جاؤ۔ جب آخری بار اُس سے ملا تو میں نے اُس سے یہی کہا کہ جناب آپ مجھے اپنا حتمی فیصلہ بتا دیں کہ اگر آپ نے پالیسی نہیں لینی تو کھل کر بتا دیں تاکہ میں بار بار چکر نہ لگاؤں۔ میری یہ بات سن کر وہ برہم ہو گیا اور پالیسی کے کاغذات میرے منہ پر مارے ساتھ بُرا بھلا کہا اور بے عزتی کر کے مجھے نکال دیا۔

غصہ تو مجھے بہت آیا مگر بمشکل ضبط کیا۔ اپنی بے عزتی پر میرا خون کھول اُٹھا تھا بس اپنی غربت اور بے بسی کی وجہ سے برداشت کر گیا۔ میری طبیعت بہت اپ سیٹ ہوئی اسی اثناء میں ماروشہ کی کال آ گئی۔ میں صحیح طرح سے اُس سے بات نہ کر سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ اُس کی کال آئی تو اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو میں نے سارا ماجرا بیان کر دیا جسے سن کر وہ کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ پھر کہنے لگی کہ اگر مناسب سمجھو تو میرے ساتھ کام کرو۔ میں تمہیں معقول تنخواہ بھی دوں گی۔ تمہیں کبھی اپنا ملازم نہیں سمجھوں گی۔ ہماری دوستی اِسی طرح رہے گی۔

میں پہلے ہی تنگ آیا ہوا تھا تو فوراً ہاں کر دی اور اگلے روز انشورنس کمپنی میں جا کر اپنا استعفیٰ لکھ کر دے دیا۔ چند دن کے بعد ماروشہ نے مجھے جہلم بلایا اور اُسی ریستوران میں ہماری ملاقات ہوئی۔

ماروشہ نے مجھے کام کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ہماری فیکٹری میں مختلف مصنوعات تیار ہوتی ہیں جنھیں پارسل کی شکل میں مختلف شہروں میں پہنچانا ہے۔ میرا کام یہ ہوگا کہ وہ کارٹن ریلوے ٹرین کے ذریعے متعلقہ شہروں میں پہنچانے ہیں۔ کارٹن وصول کرنے والا ریلوے اسٹیشن پر خود آ کر لے جائے گا اور پے منٹ وغیرہ وہ ڈائریکٹ ماروشہ کے اکاؤنٹ میں بھیج دے گا۔ میرا کام صرف اتنا ہوگا کہ باحفاظت کارٹن متعلقہ شخص تک پہنچانا ہوں گے۔

اب میری ڈیوٹی سامان کے کارٹن پہنچانے کی شروع ہو گئی۔ مجھے جہلم کے ریلوے اسٹیشن پر کارٹن مل جاتے جنھیں ٹرین کی بریک (Luggage Bogj) میں رکھوا دیا جاتا کبھی لاہور، کبھی راولپنڈی، کبھی ملتان الغرض مختلف شہروں میں جاتا۔ کارٹن پلیٹ فارم پر اُتروا کر انتظار کرتا جب مطلوبہ بندہ آ جاتا تو کارٹن اُس کے حوالے کر کے وصولی کے کاغذات پر دستخط کروا کر واپس آ جاتا۔ مجھے آنے جانے اور دیگر سفری خرچ کے لیے الگ سے پیسے دیے جاتے جبکہ بیس ہزار روپے تنخواہ دی جاتی جس کی وجہ سے گھر کے مالی حالات میں کچھ بہتری آنے لگی۔ ماروشہ سے فون پر بات ہوتی رہتی مگر اب بات کا دورانیہ کم ہونے لگا تھا جس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ اب وہ فیکٹری کے معاملات خود دیکھتی ہے جس کی

وجہ سے اب وہ مصروف رہتی ہے۔

مجھے سامان کے کارٹن دوسرے شہروں میں پہنچاتے چھ ماہ ہوگئے تھے۔ اب مجھے نہیں علم کہ اُن میں کون سی مصنوعات ہوتی ہیں۔ دوسرا میں نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ مجھے آم کھانے سے غرض تھی پیڑ گننے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمام معاملات خوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔ مجھے بہت معقول معاوضہ تنخواہ اور سفری اخراجات کی مد میں مل رہا تھا۔ جب پیٹ بھر کے روٹی کھانے کو ملی اچھا لباس میسر ہوگیا' کچھ آسودگی نصیب ہوئی تو میرے دل ودماغ میں کچھ کچھ فتور آنے لگا۔ ماروشہ کے خوب صورت سراپے پرُکشش جسم پر اب میرا جی للچانے لگا تھا۔ مجھے اکثر سوچ آتی کہ کاش ماروشہ مجھ سے شادی کرلے۔ اگر وہ مجھ سے بارہ سال بڑی ہے تو کیا ہوا امیر کبیر بیوہ ہے۔ اس کی دولت تو مل جائے گی۔

پھر یہ سوچ آتی کہ اگر وہ مجھ سے شادی نہیں کرتی تو کم از کم میری قربت سے اپنی زندگی کو تو پرُلطف بناسکتی ہے۔ چونکہ میں جوان لڑکا تھا تو اِس قسم کے شیطانی خیالات میرے ذہن میں گردش کرتے رہتے دوسرا میرے دو تین دوست تھے جو میرے ہم جماعت بھی رہے تھے اور محلے دار بھی تھے' وہ میرے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر مجھے اُلٹے سیدھے مشورے دیتے رہتے اور جوش دلاتے رہتے کہ ظہیر یار سونے کی چڑیا ہاتھ سے نہ نکلنے دینا۔''

میرے اِن دوستوں میں ایک لڑکا ثقلین بھی تھا۔ وہ ردی والے سے پرانے جاسوسی ٹائپ رسالے خرید کر پڑھتا رہتا اور خود ساختہ شرلاک ہومز یا جیمز بانڈ ٹائپ چیز بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ڈرایا کہ تم نے آج تک ماروشہ کا گھر اور فیکٹری تک نہیں دیکھی۔ اُس کا اَتا پتا تک معلوم نہیں، دوسرا یہ کہ تمھیں کیا معلوم کہ ان کارٹنز میں کیا چیزیں ہوتی ہیں؟ اُن میں اسلحہ یا منشیات بھی ہوسکتی ہیں۔ کل کلاں کو اگر وہ کارٹن پکڑے گئے تو سارا الزام تم پر آئے گا اور تمھیں لمبی جیل بھی ہوسکتی ہے۔ تو بہتر یہی ہے کہ اُس کا کھوج لگاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔''

بات تو اس کی دل کو لگتی تھی اب سوال یہ تھا کہ ماروشہ کی اصلیت کیسے معلوم کی جائے اس کا سراغ کیسے لگایا جائے۔ اس کا حل ثقلین نے یہ بتایا کہ آئندہ جب بھی ماروشہ سے ملاقات کا پروگرام بنے تو ثقلین میرے ساتھ جائے گا اور چھپ کر ماروشہ کا پیچھا کرے گا اس طرح پتا چل جائے گا کہ وہ کہاں رہتی ہے اور اس کی فیکٹری کدھر ہے اور کون کون سی مصنوعات ہوتی ہیں۔

☆☆☆

چند روز گزرے تو ماروشہ نے ملاقات کا عندیہ دے دیا اگلے روز میں اور ثقلین جہلم پہنچ گئے۔ وہاں جاکر ثقلین مجھ سے الگ ہوگیا۔ حسب معمول ہماری ملاقات اُسی ریستوران میں ہوئی۔ دو گھنٹے کے بعد وہ اپنے گھر چلی گئی اور میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھ گیا۔ اب جیسے ہی ماروشہ ریسٹورنٹ سے نکلی تو اُس نے ایک رکشہ کروایا اور وہ رکشہ اندرون شہر چل پڑا۔ دوسرے رکشہ میں ثقلین اُس کا پیچھا کرنے لگا۔ میرا مسلسل ثقلین کے ساتھ موبائل پر رابطہ تھا آخر بیس منٹ کی مسافت کے بعد ایک پوش علاقے میں ماروشہ نے رکشہ رکوایا اسے کرایہ دے کر فارغ کیا اور بڑے خوب صورت گھر میں داخل ہوگئی۔

ثقلین نے اس علاقے محلے اور مکان کا نمبر یاد کرلیا اور واپس ریلوے اسٹیشن آگیا۔ آج کے دن ہمیں بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ ماروشہ کا گھر ڈھونڈ لیا فیکٹری کہاں تھی اس میں کیا مصنوعات تیار ہوتی ہیں اِس کا حل یہ نکالا کہ دو روز بعد جو کارٹن لاہور پہنچانے تھے میں کسی نہ کسی طرح ان کو کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ کارٹن گتے کا بنا ہوتا تھا اور اُسے پیلے رنگ کی ٹیپ سے بند کیا ہوتا تھا۔ میں نے اُسی رنگ کی ٹیپ کا ایک نیا رول خرید لیا تھا تاکہ کارٹن کو کھولنے کے بعد چیک کرکے نئی ٹیپ سے بند کردوں گا۔

دو روز کے بعد میں اور ثقلین جہلم ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ لاہور جانے والی ٹرین نے ایک گھنٹے کے بعد آنا تھا مگر مصنوعات کے کارٹن پلیٹ فارم پر آ چکے تھے۔ بارہ کارٹن تھے جو کہ فیکٹری کا ملازم میرے حوالے کر کے چلا گیا ابھی ٹرین کے آنے میں دیر تھی تو ہم دونوں نے بہانے سے ایک کارٹن کو اٹھایا اور پلیٹ فارم کی ایک جانب جو کہ بالکل سنسان تھا وہاں لے جا کر اسے کھولا تو ہمیں شدید حیرت ہوئی کیونکہ اس میں نہ تو اسلحہ تھا اور نہ ہی کسی قسم کی منشیات وغیرہ تھیں۔ اس میں خواتین کے زیر جامہ پہننے والے لباس مطلب انڈر گارمنٹس تھے۔ ہم نے اچھی طرح سے سارے کارٹن کی اچھی طرح تلاشی لی مگر اس میں کوئی بھی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہ ہوئی۔ ہم نے کارٹن کو بند کر کے دوبارہ نئی ٹیپ سے اچھی طرح پیک کر دیا۔ اب مجھے تسلی ہو گئی تھی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ کارٹن لاہور پہنچا کر میں اپنے شہر واپس آ گیا۔ اب اگلہ مرحلہ یہ تھا کہ ماروشہ کو شادی کے لیے کیسے رضا مند کروں۔ اگر وہ شادی کرنے پر آمادہ نہ ہو تو کم از کم مجھے رات کو اپنے گھر تو بلا سکتی ہے۔

مجھے میرے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اب تک کے حالات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے مگر چونکہ وہ ایک خالصتاً مشرقی گھریلو لڑکی ہے تو کوئی بھی عورت فطری شرم وحیا کی وجہ سے خود پہل نہیں کرتی۔ پیار محبت کا اظہار ہمیشہ پہلے لڑکا کرتا ہے اور اگلی پیش قدمی بھی لڑکے کو ہی کرنا ہوتی ہے۔ تو اب تمہیں ہی خود ہمت کرنا ہو گی وہ ابھی جوان ہے تو بہت جلد پگھل جائے گی بس دیر تمہاری طرف سے ہے۔ بس اب تم جلد از جلد دلیری دکھا کر اپنا گوہرِ مقصود حاصل کر لو۔

اب میں منصوبہ بندی کرنے لگا کہ کس طرح اگلا مرحلہ طے کروں چونکہ ہماری ملاقات ہمیشہ ریستوران میں ہوتی تھی تو وہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ یکدم میرے ذہن میں ایک خیال آیا وہ یہ کہ کیوں نہ اُس کے گھر پہنچ جاؤں اور اُس سے کہوں گا کہ ماروشہ تمہارے پیار میں مجبور ہو کر تمہیں سرپرائز دینے تمہارے گھر آ گیا ہوں۔ اس کے گھر کھل کر اظہار محبت کر دوں گا۔

آنے والے چند دنوں میں سامان کے کارٹن نہیں پہنچانے تھے میں فارغ تھا تو اگلے ہی دن میں شام کو جہلم پہنچ گیا۔ ماروشہ کے لیے ایک پرفیوم خریدا اور کچھ گلاب کے تازہ پھول لیے۔ ثقلین کے بتائے ہوئے ماروشہ کے ایڈریس کے مطابق اس کے گھر کے مین گیٹ پر کھڑا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ڈور بیل بجائی تو چند منٹوں کے بعد ایک پکی عمر کی خاتون نے گیٹ کھولا۔ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا کہ کس سے ملنا ہے۔''

تو میں نے کہا کہ ماروشہ بی بی سے ملنا ہے۔ میں گیٹ پر ہی کھڑا رہا اس نے جا کر ماروشہ کو بتایا تو چند منٹوں کے بعد وہ خود گیٹ پر آ گئی۔ حیرانگی سے مجھے دیکھا اور پوچھا کہ ظہیر خیریت تو ہے نا؟''

میں نے کہا ہاں ہر طرح سے خیریت ہے کیا مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گی؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں آؤ اندر آ جاؤ۔'' اور مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور اُسی ملازمہ سے کہا کہ پہلے پانی لے کر آؤ اور اس کے بعد چائے لے کر آؤ۔

ماروشہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی اور یک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا ظہیر اس وقت کیسے آنا ہوا اور میرا گھر کیسے ڈھونڈا؟''

تو میں نے بڑے رومانٹک انداز سے کہا کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ تمہارا گھر ڈھونڈنا کون سا مشکل ہے۔

وہ کہنے لگی کہ وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہارا اس وقت بغیر اطلاع کے اچانک شام کے وقت آنا مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔

اب تم آ ہی گئے ہو تو یہ بات نہیں ہے۔ ویسے بہتر ہوتا کہ تم پہلے فون پر بتا دیتے۔ Any how خیر کوئی بات نہیں۔''

اتنے میں چائے آ گئی ملازمہ کپ میرے آگے رکھ کر چلی گئی۔ ماروشہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا پیسوں کی ضرورت ہے؟

میں نے جواب دیا کہ نہیں ماروشہ کسی چیز یا پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو بس صرف تمھیں ملنے، تمہاری خاطر آیا ہوں۔''

'' کیا مطلب؟ '' یہ کہہ کر ماروشہ کھڑی ہوگئی۔ میں بھی کھڑا ہوگیا اور ماروشہ کے قریب چلا گیا اور کہا ماروشہ وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر آیا ہوں۔ میں نہ...... وہ تم سے...... بہت پیار کرتا ہوں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ تمہارے عشق میں میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔''

ماروشہ کہنے لگی۔'' تم ہوش میں تو ہو؟ کیا کہہ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔'' ہاں ماروشہ ہوش میں ہوں۔ خدا کی قسم تمھیں بہت پیار کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے ماروشہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی اور حرکت کرتا ماروشہ نے خود کو ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ کیا اور دو زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر مارے اور کہا۔

'' ابھی اور اسی وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ آخر تم گندی نالی کے گندے کیڑے ہی نکلے ناں۔ دفع ہو جاؤ اور آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔''

ماروشہ کا چہرہ غصہ سے لال سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی بہتری اور خیریت اسی میں جانی کہ فوراً یہاں سے چلتا بنوں۔ کہیں ماروشہ اپنے ملازموں کو بلا کر میری ہڈی پسلی ایک نہ کروا دے۔

میں جب وہاں سے چلنے لگا تو ماروشہ نے میرا پرفیوم اٹھا کر زور سے فرش پر پھینکا جو ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اگلے لمحے میں مین گیٹ پر تھا اور ندامت، شرمندگی اور بے عزتی کے احساس کے ساتھ رات گئے اپنے گھر لوٹا۔

اگلے دن میں نے ماروشہ کو بہت کالز کیں مگر اس نے میری کوئی کال اٹینڈ نہ کی بلکہ ہر کال کاٹ دیتی بہت سارے میسج بھی بھیجے مگر کوئی جواب نہ ملا۔

دو دن بعد میں نے اپنے دوست کے موبائل سے کال کی تو ماروشہ نے اٹینڈ کر لی کیونکہ وہ نیا نمبر تھا۔ میں نے ماروشہ کو اللہ کا واسطہ دے کر کہا پلیز صرف دو منٹ میری بات سن لو ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔ تو اس نے کہا جو بھی کہنا ہے دو منٹ کے اندر اندر بولو۔

میں نے گڑگڑا کر اپنی حرکت کی معافی مانگی اور کہا کہ بے شک مجھ سے کبھی بات نہ کرنا بس ایک بار مجھے معاف کر دو۔ میں شیطان کے بہکاوے میں بہک گیا تھا اور تمھیں غلط سمجھا تو پلیز مجھے معاف کر دو۔

ماروشہ نے ایک لمبی سانس لی اور کہا۔ دیکھو مسٹر ظہیر میں نے تمھیں ایک غریب اور ضرورت مند لڑکا سمجھ کر تمھیں کام پر لگایا۔ حالانکہ وہ کارٹن میں ٹرک، کارگو یا ریلوے کے پارسل کے ذریعے بھی بھجوا سکتی تھی بلکہ بھجواتی رہی ہوں مگر تمھیں اس کام پر اس لیے لگایا کہ تمہاری عزت نفس بھی مجروح نہ ہو اور تمہاری مالی مدد بھی ہوتی رہے۔ تم نے اپنے دوست کے ذریعے میرا پیچھا کروایا جس رکشہ میں تمہارے دوست نے میرا پیچھا کیا وہ رکشے والا میرے بیٹے کو اسکول کے لیے گھر سے لے کر جاتا ہے اور گھر چھوڑتا ہے تو اس نے مجھے بتایا مگر میں خاموش رہی تم سے گلہ تو دور کی بات ذکر تک نہیں کیا۔ پھر تم نے کارٹن کھول کر اس کی تلاشی لی۔ یہ بات بھی میرے ملازم نے بتائی جو دور سے تمھیں تلاشی لیتے دیکھتا رہا۔ میں اس وجہ سے چپ رہی کہ تمہارا شک دور ہو گیا کیونکہ میں نے تمھیں کبھی نہیں بتایا تھا کہ ان کارٹنز میں کیا ہوتا ہے۔ اب تمھیں بتاتی بھی کیا کیونکہ مجھے شرم آتی تھی۔ تمھیں یقیناً یہ شک ہوگا کہ ان میں کوئی اسلحہ یا منشیات نہ ہو۔ چلو تم نے کارٹن کھول کر تسلی کر لی تم حق بجانب تھے۔ اسی لیے میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ میری فیکٹری میں یہی اشیاء تیار ہوتی ہیں اور سب کی سب عورتیں

میری فیکٹری میں کام کرتی ہیں صرف باہر کے کاموں کے لیے کچھ مرد ملازم رکھے ہیں تو فیکٹری میں تمہارے کرنے کا کوئی کام نہ تھا تو خالصتاً تمہاری مدد کرنے کے لیے تمہارے ذمے کارٹن پہنچانے کا کام ذمے لگا۔ تم سے دوستی کی کیونکہ تم اچھے لڑکے لگے تھے اور دل میں تمہیں چھوٹے بھائی کا درجہ دیا تھا۔ مگر مجھے شرم آرہی ہے کہ تم نے میرے بارے میں گندی سوچیں سوچ کر انتہائی گری ہوئی حرکت کی۔ مجھے کسی نامحرم نے آج تک چھوا نہیں مگر یہ ذلیل اور گھٹیا اخلاق سے گری ہوئی حرکت تم نے کی۔ باقی میرے مرحوم شوہر کے حصے کی جائداد سے مجھے لاکھوں روپے اسی ماہ ملنے والے ہیں جن سے میں نے ایک جوتے بنانے والا کارخانہ لگانا ہے اور اس کا کام شروع کروادیا ہے جو کہ انشاء اللہ چھ ماہ تک مکمل ہوجائے گا۔ میں تمہیں پرکھ رہی تھی کہ کتنے قابل اعتماد اور کس کردار کے مالک ہو کیونکہ میرا ارادہ یہ تھا کہ تمہیں اس کارخانے کا منیجر بناؤں گی۔ مگر تم نے میرے اعتماد، یقین کو ٹھیس پہنچائی اور اپنی حرکتوں سے اپنی اصلیت اور ذہنی گندگی دکھادی، جس کی وجہ سے تم میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر گئے ہو۔ اپنے گھر میں تم سے ملاقات کبھی اس لیے نہیں کی کہ میرے ملازم، ملازمہ اور محلے والے میرے کردار پر شک نہ کریں ہاں ریستوران میں ملاقات کا جواز بناسکتی تھی اگر کوئی دیکھ لیتا تو کہتی کاروباری معاملات کے سلسلہ میں وہاں تمہارے ساتھ بات چیت کرتی تھی۔ بہرحال میں تمہیں معاف کرتی ہوں مگر خبردار کبھی آئندہ مجھے کال یا میسج یا کبھی بھول کر بھی میرے گھر کی طرف آئے تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔'' اتنا کہہ کر ماروشہ نے کال ڈسکنیکٹ کردی۔

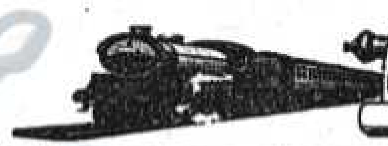
اس کے بعد کی داستان یہ ہے کہ بہت خاک چھانی مگر کہیں بھی کسی قسم کوئی ملازمت نہیں ملی۔ اب میں پچھلے چار سال سے اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پکوڑے بنا کر بیچتا ہوں۔ جی ہاں ایک گریجویٹ پکوڑے فروش پلیٹ فارم پر سارا دن ''پکوڑے گرم اے'' کی صدا لگاتا ہوں۔

☆☆☆

تیسری ٹرین بیتی

اسٹیشن کی وہ رات





محمد کاشف مغل

کندھ کوٹ کے اسٹیشن پر پیش آنے والا ایک عجیب قصہ ایک مسافر کی زبانی

میں فقط پانچ منٹ ہی دیر سے پہنچا تھا کہ ٹرین چھوٹ گئی۔ پر یہاں ایک گھنٹے کے بعد دوسری ٹرین کے آنے کا ٹائم تھا۔ سوچا انتظار ہی کر لیتا ہوں۔

یہ کندھ کوٹ کا ایک چھوٹا سا جنکشن تھا اندرون سندھ کا، رات تقریباً بارہ بج چکے تھے۔ چاند کی پہلی پہلی تاریخیں چل رہی تھیں۔ اندھیرا کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ آسمان پر تارے ٹمٹماتے نظر آ رہے تھے۔ آسمان تو بس تاروں نے گھیر رکھا تھا۔ اس رات کی وحشت سے چاندنی بھی خوف زدہ تھی۔ فضا میں سناٹا تھا۔ ٹرین بھی بس آنے ہی والی تھی۔ میں بینچ سے اُٹھ کر بیگ کاندھے پر لٹکائے کچھ قدم آگے بڑھا۔ پٹری کی طرف۔ لیکن پٹری پر دور دور تک ہلکی ہلکی چاند کی روشنی ہی نظر آ رہی تھی۔ دور دور تک ٹرین کا نام ونشان نہ تھا۔ تاریکی میں ڈوبے اس پلیٹ فارم پر میرے علاوہ کوئی شخص نہ تھا جس سے وجہ معلوم کی جائے۔ دفتر میں ایک شخص موجود تھا، میں دفتر کی جانب چل دیا دفتر کے قریب پہنچا ہی تھا کہ پلیٹ فارم کی لائٹ چلی گئی۔ دروازے پر دستک دی اور بولا۔

''بھائی صاحب ڈیڑھ بج گیا، ٹرین نہیں آئی، بھائی صاحب آدھا گھنٹہ اوپر ہو گیا۔'' کوئی جواب نہ ملا کچھ وقت کی خاموشی کے بعد کرسی گھسیٹنے کی آواز آئی دروازے کے کناروں سے جھانکنے کی کوشش کی تو مجھے ایک بوڑھا شخص کپکپاتے ہوئے ہاتھ میں لالٹین تھامے نظر آیا۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔ پھر بھی ہمت کرتے ہوئے ایک بار پھر دستک دی اور کہا۔

''بھائی صاحب کوئی ٹرین آئے گی یا نہیں؟ ٹائم تو بہت اوپر ہو گیا۔'' اندر سے آواز آئی۔

''نہیں آئے گی۔ اب ریل گاڑی۔'' آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

''نہیں آئے گی! بابا پچھلے اسٹیشن پر حادثہ ہوا ہے۔ کچھ پتا نہیں آئے گی یا نہیں۔''

اس کا جواب اور انداز دونوں ہی بہت پراسرار تھے۔ لیکن اس کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی میرے کانوں میں پڑی۔ جس نے مجھے مزید خوف زدہ کر دیا۔ میں نے پوچھا۔

''بابا سائیں! قریب میں کوئی مسافر خانہ ہے جہاں رات گزاری جا سکے۔''

اس نے میری بات سن کر طنزیہ لہجہ میں کہا۔

''ارے یہاں دور دور تک کہیں آبادی نہیں۔''

''رات گزار دوں۔ دیکھ اگر کوئی شہر تک لے

جائے ۔'' وہ یہ کہہ کر لالٹین ہاتھ میں پکڑے دور ہوتا چلا گیا۔

اب اس ٹھنڈی اور اندھیری رات میں کہاں جاؤں۔ پھر سوچا ہوسکتا ہے سڑک پر کوئی مدد کردے۔ کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے میں پلیٹ فارم سے اُتر کر سڑک کی طرف بڑھا۔ سڑک بھی کیا تھی ساری کی ساری جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی، بالکل سنسان بنا رہی تھی۔ خود کو مضبوط کرتے ہوئے میں سڑک کے درمیان کھڑا ہوگیا۔

دور سے ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہوئی اور میری طرف بڑھتی چلی آئی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا وہ ایک لالٹین تھی، گدھا گاڑی پر سوار ایک شخص جس کا چہرہ جھریوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک پرانے مفلر سے اس نے چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ داڑھی میں دھول جمی ہوئی



سڑک کو دیکھ کر تو ایسا لگتا تھا کہ شاید ہی کبھی کوئی یہاں سے گزرتا ہو۔ پھر بھی اس انجان سڑک پر میں کسی کا انتظار کرنے لگا۔

رات مزید اندھیری اور دہشت ناک ہوتی جارہی تھی۔ سڑک کے کنارے گھاس میں چھپے جگنو شاید میری مدد کرنا چاہتے تھے۔ چاندنی جھاڑیوں سے چھن کر سڑک پر عجیب وغریب قسم کے نقوش تھی۔ گھاس کے چند گٹھڑ گاڑی پر لادے ہوئی میرے پاس رکا مجھ سے اس نے پوچھا۔

''مسافر ہو۔'' میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''جی سائیں! ریل گاڑی صبح آئے گی۔ قریب میں کوئی مسافر خانہ ہے رات گزارنے کے لیے۔''

اس نے کہا۔ ''بیٹا آپ مسافر ہو ہمارے مہمان ہو۔ آؤ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ صبح میں تمہیں

اسٹیشن چھوڑ جاؤں گا۔ میرا گھر پاس میں ہی ہے۔''

اس اندھیری رات کا مقابلہ کھلے آسمان تلے مشکل تھا۔ ایک چھت کی ضرورت تھی۔ میں نے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں گاڑی میں سوار ہوگیا۔ ہم چل دیے۔ سارے راستے بابا اپنی ہی باتیں کرتا رہا پر میرے پلّے کچھ نہ پڑا۔ مجھے ٹرین کی ٹینشن کھائے جا رہی تھی۔ پتا نہیں کب تک، پٹری رواں ہوگی کہ وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ مجھے جھاڑیوں کے خوف سے ٹھنڈ لگنے لگی۔

''باباسائیں! میں نے ٹھٹھرتے ہوئے پکارا۔

''بس بیٹا پہنچنے والے ہیں۔ یہ ہی کوئی 20 منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک پرانے سے مٹی کے گھر کے پاس گدھا گاڑی رک گئی۔

''باباسائیں!'' میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

''لو بیٹا پہنچ گئے۔ یہ ہے ہمارا غریب خانہ اور تمہارا مسافر خانہ۔ آجاؤ جلدی سے نہیں تو تمھیں تو ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

ایک پرانا لکڑی کا دروازہ جس کے کنارے دیمک کی خوراک بن چکے تھے۔ زنگ آلودہ کنڈی بابا نے کھٹکائی۔ اور ہم انتظار کرنے لگے۔ اچانک کہیں دور سے پائل کھنکنے کی آواز آئی۔ اور پھر چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ دروازہ کھلا ایک لڑکی تھی مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا چہرہ دوپٹے سے چھپالیا۔

''باباسائیں! کون ہے یہ۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''چمکی بیٹا یہ مسافر ہے۔ رات یہیں ٹھہرے گا۔ کچھ کھانے کو ہے تو دے دو۔ اور اسے اوڑھنے کو بھی کچھ دے دینا۔ کہیں بیمار نہ ہوجائے۔ ٹھنڈ لگ گئی ہے۔'' چمکی شائستگی سے بولی۔

''جی، جی باباسائیں بالکل میں ابھی آئی۔''

چمکی کو دیکھتے ہی میں نے سوچا ٹرین اب بھی نہ آئے تو بھی فرق نہیں پڑتا۔ شاید میری منزل یہیں ہے۔ اس نے چاول کی بنی ہوئی دو روٹیاں اور کچھ سبزی کا سالن میرے سامنے لاکر رکھ دیا۔ لیکن کچھ بولی نہیں اور نظریں جھکائیں جو چولہے کے پاس جا بیٹھی۔ اس کا سایہ کچن سے باہر صحن میں پڑ رہا تھا۔ میں مسلسل اسے دیکھتا رہا اس کا سایہ لالٹین کے شعلے کے ساتھ ساتھ جھوم رہا تھا۔ لالٹین سے زیادہ رونق اس کے چہرے پر تھی جس نے سارے گھر کو روشن کر رکھا تھا۔ میں نے کہا۔

''پانی مل سکتا ہے۔'' یہ سن کر ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے میری طرف بڑھی۔ ان بڑی بڑی آنکھوں میں لالٹین کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''ماں ہے تمہاری۔'' کہنے لگی۔

''انتقال ہوگیا ان کا دو سال پہلے۔ میں اکیلی رہتی ہوں۔ باباسائیں کھیتی باڑی کرتے ہیں بس گزر بسر ہو ہی جاتا ہے۔''

اس کی طبیعت میں تنہائی اور اکیلا پن تھا، جس سے وہ ناخوش تھی اور شاید خود کو کوستی بھی ہو۔ میرا دل چاہا اس سے باتیں کرنے کو۔ میں نے اسے پاس بیٹھنے کو کہا۔ باباسائیں سو چکے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ٹھنڈ کی وجہ سے مجھے بخار ہو رہا ہے یا پھر اس کی موجودگی نے درجہ حرارت بڑھا رکھا تھا۔ میری آنکھیں نیند سے چُور چُور تھیں، پر دل و دماغ بغاوت پر اتر چکے تھے۔ جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس درد کی کرنٹ صرف مجھ پر نہ تھی بلکہ چمکی کو بھی درد کا احساس ہوگیا تھا۔

وہ جلدی سے گئی ایک پرانی سی رضائی لے کر آئی اور اس میں مجھے سمیٹ دیا اور میرے بالوں کو سہلانے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی نرمی نے مجھے مدہوش کر دیا تھا۔ پر میں جاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ رات اس درد میں بھی بڑی حسین و دلفریب بن چکی تھی۔ وہ ایک رات کی محبت تھی یا ہمدردی یا پھر چمکی کی تنہائی کا قرض جو میں پورا کرنے چلا تھا۔

اب وہ بخار ٹھنڈ اور خوف ختم ہو چکا تھا۔ بس ایسا سکون ملا جو ماضی میں کبھی نہ ملا تھا۔ اور نہ شاید کبھی ملنا تھا۔ میں اسی بستر میں سو گیا۔

☆☆☆

اچانک ایک زور دار آواز میرے کانوں پر پڑی میں ڈر کے جاگا وہ ٹرین کے وسل کی آواز تھی۔ میں فوراً اٹھا۔ میں بینچ پر سویا ہوا تھا۔ اٹھتے ہی میں دفتر کی طرف دوڑا اور جاتے ہی بابا سے پوچھا کہ قریب میں کوئی بستی ہے۔ وہ وہی تھا۔ وہ وہی تھا جس نے رات کو مجھے کڑوا جواب دیا تھا۔ میں جنکشن سے اسی راستے پر چل دیا۔ وہ وہی راستے تھے جن پر رات کو میں گزرا تھا۔ وہ رات کے لمحات میرے دل و دماغ میں گھر چکے تھے۔ مجھے کسی بھی صورت چمکی تک پہنچنا تھا۔ میں اس کی نزاکت، دن کے اجالے میں دیکھنا چاہتا تھا۔

مجھے وہ چاہیے تھی۔ ہاں بالکل وہ وہی راستے تھے۔ میں دوڑتے دوڑتے پہنچا دیکھا تو وہی پرانا گھر جھریوں والا دروازہ لیکن کنڈی پر تالا تھا۔ اور اس کے گرد مکڑیوں کے جالے...... ایسا لگتا تھا کسی انسانی ہاتھ نے تالے کو کبھی چھوا ہی نہ ہو۔

گزری رات میں بھلا۔ کیسے بھول سکتا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے دیوار پھلانگی اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر کا ماحول دیکھتے ہی میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ وہ وہی لالٹین تھی بس بجھنے ہی والی تھی وہی گلاس، وہی برتن، بچا ہوا سالن، بستر دھول مٹی سے آلودہ جیسے برسوں سے کسی نے جھاڑا ہی نہ ہو۔ اس مکان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہاں روحوں کا بسیرا ہے۔ کوئی انسان یہاں برسوں سے نہ بھٹکا ہوگا۔

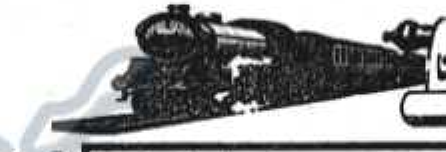
پھر کل رات جو ہوا وہ سب کیا تھا۔ اس شکستہ سامانی پر میں چکرا کر رہ گیا۔ واپسی کا سفر کس طرح طے ہوا یہ میں یا میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں کل رات کی میٹھی یادوں میں گم اسٹیشن کی اور چلتا چلا جا رہا تھا۔ ٹرین نے پھر سے وِسل دی تھی اور میرے قدم ریل کی طرف پڑتے گئے۔

جانے کتنے زمانے گزر گئے مگر 'وہ رات' میں کبھی نہ بھلا سکا۔ کون تھی چمکی...... کون تھا وہ بابا...... آج بھی یہ سوال میرے دماغ میں درد بن کر اٹھتے ہیں۔ مگر...... شاید اس سوال کا کوئی جواب مجھے اس زندگی میں نہ ملے گا۔

☆☆☆

انتظار





ملک این اے کاوش اعوان

اُس شخص کی بِپتا' جسے بیوی اور بیٹی کے انتظار نے پلیٹ فارم پہ ہمیشہ کے لیے ساکت کردیا

زندگی کے تیرہ برس برق رفتاری سے بیت گئے۔سلانوالی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لگے برگد کے درخت کے نیچے پڑے پرانے بینچ پر وہ شخص آج بھی نگاہوں میں کسی کے انتظار کی پرچھائیاں لیے بیٹھا تھا۔اس کی شہد رنگ آنکھوں میں آج بھی یقین کی پرچھائیاں سایا فگن تھیں۔آنکھوں میں انتظار کے دیے جلائے وہ آج بھی اپنی بیوی کا منتظر تھا۔اس کی نگاہیں پلیٹ فارم پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں تھوڑی ہی دیر بعد سرگودھا سے آنے والی ٹرین کا بتایا گیا تھا۔

آج مارچ کی 23 تاریخ تھی۔اس کی بیوی نے اسے یہی کہا تھا کہ اگر اس کی غلط فہمی دور ہوگئی تو وہ 23 مارچ کو ہی لوٹے گی۔جس دن اس کی بیوی اسے چھوڑ کر اپنی بیٹی کے ہمراہ گئی تھی۔اس دن بھی 23 مارچ ہی تھا۔ایک چھوٹی سی غلط فہمی نے ان کے درمیان اتنی دراڑیں پیدا کردی تھیں کہ آج تیرہ برس بیتنے والے تھے لیکن شاید اس کی بیوی کی غلط فہمی ابھی تک دور نہ ہو پائی تھی۔

اس کی بیوی زرمین چوہدری نے جاتے سے اس سے سختی سے کہا تھا کہ وہ نہ تو کبھی اس سے رابطہ کرے اور نہ ہی اس کے پیچھے آئے۔اگر اس نے ایسا کیا تو وہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھے گا۔بینچ پر براجمان شخص عاطف بگھیلا کا دل بھینچ کر مٹھی میں آگیا تھا۔اس دن اس نے اپنی بیٹی کو آخری بار پیار کیا تھا۔اس کی شہد رنگ آنکھوں سے آنسو ابر نیساں کی طرح برستے رہے تھے۔اپنی بیوی کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اس نے بہت سعی کی لیکن اس کی بیوی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ہر سال 23 مارچ کو وہ پلیٹ فارم پر آکر صبح سے رات گئے تک اپنی بیوی اور بیٹی کے لوٹ آنے کا انتظار کرتا رہتا لیکن شاید اس کی بیوی نے نہ آنے کی ٹھان لی تھی۔

ماضی کی کھڑکیاں وا ہوئیں تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے عاطف بگھیلا کو اپنی گرفت میں جکڑنا شروع کردیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر وہ ماضی کی تلخ و شیریں یادوں میں کھوتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

”رکشے والا......رکشے والا......کوئی ہے جس نے رکشے پہ جانا ہے؟“ عاطف بگھیلا زور زور سے مسافروں کو دیکھ کر چلا رہا تھا۔

گاڑی جیسے ہی پلیٹ فارم پر پہنچی سارے

رکشہ ڈرائیور بھی جمع ہو جاتے تھے۔ سب ادھر ادھر چلتے پھرتے آوازیں لگاتے دکھائی دیتے۔ عاطف بگھیلا گاڑی سے اترنے والے مسافروں کے پاس جا کر آوازیں لگائے جا رہا تھا۔ تبھی اچانک کسی نے اس کی پشت کی طرف سے اس کے داہنے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ لیکن اگلا منظر دیکھ کر وہ گنگ رہ گیا۔

اس کے سامنے سفید سوٹ میں ملبوس ایک نہایت ہی خوبرو دوشیزہ کھڑی تھی۔ اس کے لبوں پر جان لیوا مسکراہٹ جلوہ گر تھی۔ سفید لباس میں وہ کسی اپسرا سے کم دکھائی نہ دے رہی تھی۔ عاطف بگھیلا ٹکٹکی باندھے اسے گھورے جا رہا تھا۔

''ایکسکیوزمی......!'' دوشیزہ نے اپنا داہنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو عاطف بگھیلا چونک اٹھا۔

''یہ سامان اٹھاؤ اور جلدی چلو مجھے تو پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔''

عاطف بگھیلا نے سرعت سے دوشیزہ کے بیگ اٹھائے اور آگے آگے چل پڑا۔ پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اس نے دونوں بیگ رکشے کی چھت پر رسی سے باندھ دیے جبکہ دوشیزہ رکشے کی پچھلی نشست پر براجمان ہو گئی۔ عاطف بگھیلا نے زندگی میں ایسی خوبصورت دوشیزہ پہلے نہ دیکھی تھی۔ نجانے کیوں پہلی ہی نگاہ میں وہ اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ لڑکی کی ٹھاٹ باٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نہایت ہی اعلیٰ گھرانے کی لڑکی ہے۔

''کہاں جانا ہے آپ کو؟'' عاطف بگھیلا نے آئینے میں اس دوشیزہ کے حسن کا دیدار کرتے ہوئے پوچھا۔

''سلطان ٹاؤن۔'' دوشیزہ نے جواب دیا۔



''وہاں راجہ حنیف کا گھر ہے۔ اس کے گھر جانا ہے۔''

''راجہ حنیف کے گھر؟'' عاطف بگھیلا چونک اٹھا اور حیرت سے اسے گھورنے لگا پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''گستاخی کی معافی چاہتا ہوں میڈم لیکن کیا میں معلوم کرسکتا ہوں کہ آپ وہاں کس سلسلے میں جارہی ہیں؟'' عاطف بگھیلا نے پوچھا۔

''کیوں تمہیں اس سے کیا؟'' دوشیزہ نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

عاطف بگھیلا نے اس کا جواب سن کرنفی میں سر ہلایا اور رکشے کو اسٹارٹ کرکے اسٹیشن کے ایریا سے باہر لاکر فرقہ روڈ پر بھگاتا ہوا لے جانے لگا۔ جلد ہی اس نے پھاٹک کے قریب سے یوٹرن لے کر اندر کی طرف رکشہ موڑا اور پھر ایک گھر کے سامنے اس نے رکشہ روک دیا۔ اس وقت شام کے دھندلکوں نے آہستہ آہستہ سرکنا شروع کردیا تھا۔ سورج تقریباً غروب ہونے والا تھا۔ عاطف بگھیلا جلدی سے رکشے سے باہر نکلا اور اُس نے رکشے کی چھت پر بندھے بیگ اتارے اور نیچے زمین پر رکھ دیے۔ اتنی دیر میں وہ دوشیزہ بھی اتر چکی تھی۔ اس نے پرس سے ہزار کا نوٹ نکال کر اسے تھمایا۔ عاطف بگھیلا نے اسے پیسے بقایا واپس کرنے چاہے لیکن اس نے انکار کردیا۔

''رکیے ایک منٹ میں راجہ حنیف سے آپ کو ملوائے دیتا ہوں۔'' عاطف بگھیلا نے دوشیزہ کو مخاطب کیا۔

دوشیزہ نے پہلے اسے کھا جانے والی آنکھوں سے دیکھا پھر راجہ حنیف کے گھر کو دیکھ کر زیر لب مسکرائی اور گویا ہوئی۔ ''اوکے۔''

عاطف بگھیلا نے سرعت سے آگے بڑھ کر سامنے والا گیٹ زور سے بجایا دوسرے ہی لمحے ایک کرخت آواز عاطف بگھیلا سمیت اس لڑکی کی سماعت سے بھی ٹکرائی۔ دوشیزہ کی پیشانی پر حیرت کے مارے سلوٹیں عیاں ہوگئی تھیں۔

''کون ہے بے؟'' گیٹ کا چھوٹا پٹ کھولتے ہوئے اندر سے پوچھا گیا۔

''راجہ حنیف صاحب سے ملنے ایک میم آئی ہے۔'' عاطف بگھیلا نے بھی جواباً اونچی آواز میں کہا تو فوراً ہی چھوٹے پٹ سے ایک موٹی بھدی سانولے رنگ کی عورت نمودار ہوئی۔

''ہاں بول کیا کام ہے؟'' اس عورت نے کھا جانے والی آنکھوں سے اس دوشیزہ کو تکتے ہوئے پوچھا۔

''میرا نام زرمین چوہدری ہے۔'' دوشیزہ نے تھوک نگلتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

''ابے میں نے تجھ سے تیرا نام پوچھا ہے کیا؟'' موٹی بھدی عورت نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''کام بتا کیوں آئی ہے یہاں اور راجہ حنیف سے کیا کام ہے تجھے؟''

''ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔'' دوشیزہ نے بمشکل تمام کہا۔ ''انہی کے کہنے پر میں یہاں آئی ہوں اور سب کچھ لے کر گھر بار چھوڑ کر آئی ہوں۔ ہم دونوں نے اب شادی کرنی ہے۔''

''تیرا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا کیا؟'' موٹی بھدی عورت تقریباً چیخ کر بولی۔

اس کی آواز سن کر محلے کے کچھ گھروں سے لوگ باہر نکل آئے۔ اتنی دیر میں راجہ حنیف بھی اندر سے نمودار ہوا اور زرمین چوہدری کو دیکھ کر گنگ رہ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟''

راجہ حنیف کے سامنے آتے ساتھ ہی وہ موٹی بھدی عورت اس پر برس پڑی۔ راجہ حنیف کی حالت دیدنی تھی۔ وہ دوشیزہ سے آنکھیں ملانے کی تاب تک نہ لا رہا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہے؟'' راجہ حنیف نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''راجہ حنیف دیکھو میں ہوں زرمین چوہدری۔

"اس موٹی عورت کے بولنے سے پہلے ہی زرمین چوہدری بول اٹھی۔

"تمہارے کہنے پر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ گئی ہوں۔اب تم بھی اپنا وعدہ وفا کرو۔"

"کک......کون سا وعدہ؟" راجہ حنیف نے ناسمجھی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو زرمین چوہدری کو اپنے ہاتھ پاؤں پھولتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" زرمین چوہدری حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر بولی۔

"اے جا دفع ہو جا یہاں سے۔" موٹی بھدی عورت چلائی۔

"شرم حیا نام کی تو کوئی چیز بھی نہیں رہی آج کل کی لڑکیوں میں۔تجھے شرم نہیں آ رہی میرے خاوند کو ڈیل کر رہی ہے۔تُو جانتی ہے یہ پہلے سے تین بیٹیوں کا باپ ہے اور تُو (اُس نے راجہ حنیف کو مخاطب کرتے ہوئے) چل اندر ذرا۔"

اتنا کہہ کر دونوں اندر چلے گئے۔زرمین چوہدری کو لگا جیسے کسی نے اسے آسمان کی بلندیوں سے پکڑ کر زمین کی گہرائیوں میں پھینک دیا ہو۔اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے تھے۔محلے والوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔عاطف بگھیلا نے بنا کچھ سوچے سمجھے زرمین چوہدری کے بیگ اٹھا کر اپنے رکشے کی چھت پر دوبارہ باندھ دیے۔

"اندر بیٹھو زرمین چوہدری۔" عاطف بگھیلا نے الفت بھرے انداز میں کہا تو زرمین چوہدری ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اندر بیٹھ گئی۔

عاطف بگھیلا نے رکشہ ایک بار پھر وہاں سے نکالا اور فرقہ روڈ پر لے آیا۔

"کیا اب تم واپس جاؤ گی؟" عاطف بگھیلا نے پوچھا۔

"واپسی کے سارے راستے تو پہلے ہی بند کر آئی ہوں میں۔" زرمین چوہدری نے جواب دیا۔

"تم فکر مت کرو اگر مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو تو میرے ساتھ چلو میرے گھر۔" عاطف بگھیلا نے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے گھر میرے والدین اور ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔سب بہت اچھے ہیں۔فی الحال تم کافی افسردہ ہو میرے خیال میں تمہیں میری بات مان لینی چاہیے۔"

"سب کچھ ختم ہو گیا۔" زرمین چوہدری اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم
نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

"خاطر جمع رکھو کچھ نہیں ہوا ابھی۔" عاطف بگھیلا نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"شکر کرو تم بچ گئی ہو۔میں تو اسی وقت مضطرب ہو گیا تھا۔جب تم نے اس خبیث انسان کا نام لیا تھا۔یہ یہاں کا ایک نمبر کا بدمعاش اور کمینہ انسان ہے۔شکر بجا لاؤ کہ تمہاری عصمت محفوظ رہی۔پیسے کا پجاری ہے یہ۔سب کچھ کھا پی جاتا۔"

زرمین چوہدری کو زندگی میں اتنا افسوس نہیں ہوا تھا۔جتنا اسے آج اپنے ایک فیصلے سے ہو رہا تھا۔وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔اس کے والدین اور بھائی اس پر جان نچھاور کرتے تھے لیکن اس نے سب کی عزت داؤ پر لگا دی تھی۔نجانے ان پر کیا بیت رہی ہو گی۔اس کے چاؤ چونچلوں کے سامنے وہ لوگ سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔لیکن ایک بے وفا کی خاطر اس نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

جلد ہی وہ عاطف بگھیلا کے ساتھ اس کے گھر میں تھی۔عاطف بگھیلا کے گھر والے حقیقت میں بہت اچھے تھے۔انہوں نے اسے اچھی طرح سے سمجھایا بجھایا اور پھر عاطف بگھیلا کی ماں نے زرمین چوہدری سے اس کے گھر کا نمبر لے کر انہیں فون کر کے ساری بات سے آشنا کیا۔ایک گھنٹے کے اندر اندر زرمین چوہدری کے اپنے عاطف بگھیلا کے گھر میں تھے۔

عاطف بگھیلا کے والدین نے انہیں سمجھایا اور بتایا کہ اس عمر میں اکثر بچے غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ان

سے روگردانی کرنے کی بجائے درگزر سے کام لیا جائے تو نہ صرف عزت محفوظ رہتی ہے بلکہ بچے دوبارہ شرم کے مارے ایسا کوئی بھی کام کرنے کی نہیں سوچتے۔ زرمین چوہدری کے والدین نے عاطف بگھیلا اور اس کے والدین کا شکریہ ادا کیا اور زرمین چوہدری کو لے کر واپس چلے گئے۔

عاطف بگھیلا زرمین چوہدری کے پیار کی آگ میں جھلسنے لگا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے والدین سے کیا تو ایک بار پھر اس کی والدہ نے زرمین چوہدری کے گھر فون کیا تو سب نے بخوشی ان سے بات کی اور انہیں اپنے گھر مدعو کیا۔ عاطف بگھیلا کے والد، والدہ اور اس کی بہن ڈھیر ساری چیزوں کے ساتھ زرمین چوہدری کے گھر گئے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد عاطف بگھیلا کی ماں نے زرمین چوہدری کی ماں سے مدعا بیان کیا تو وہ خوشی سے پاگل ہوگئیں اور انہوں نے بتایا کہ زرمین چوہدری بھی یہی چاہتی ہے۔ یہی نہیں گھر کے باقی افراد کی بھی یہی خواہش ہے لیکن ہم لوگ بیٹی والے ہونے کی وجہ سے یہ خواہش زبان پر لانے سے کترا رہے تھے۔

یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات ہوگئی۔

زرمین چوہدری زیورات اور آنچل کے بوجھ سے لدی عاطف بگھیلا کے گھر میں اس کی زوجہ بن کر آگئی۔ عاطف بگھیلا کو اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی قسمت اتنی جلدی رنگ لائے گی۔ وہ رب کا شکر بجالاتے ہوئے نہیں تھک رہا تھا۔

☆......☆......☆

دن اپنی ہی رفتار سے گزرتے جارہے تھے۔ شادی کو ایک ماہ اور سات دن بیتے ہوں گے کہ زرمین چوہدری امید سے ہو۔ اس خوشی کے موقع پر زرمین چوہدری کے گھر والوں نے آکر اپنے منجھلے بیٹے عمیر چوہدری کے لیے عاطف بگھیلا کی بہن عفت رحمان کا ہاتھ مانگا۔ بھلا انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ فوراً سے بھی پیشتر ہاں کردی گئی۔

شادی کے دن رکھ دیے گئے اور ٹھیک ایک ماہ بعد عفت رحمان اپنے سسرال پہنچ گئی۔ دونوں گھرانوں کی خوشیاں دوبالا ہوگئی تھیں۔ عاطف بگھیلا کے سسرال والوں نے اسے رکشہ چلانے سے منع کردیا اور اسے گارمنٹس کا کاروبار کرادیا۔ یوں عاطف بگھیلا کے گھرانے کے حالات بھی بہتری کی طرف آنے لگ گئے۔ ہر شخص عاطف بگھیلا کی قسمت پر رشک کرنے لگ گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے عاطف بگھیلا کو ایک نہایت ہی خوبصورت بیٹی سے نوازا۔ دونوں گھرانوں میں ایک بار پھر خوشیاں پھیل گئیں۔ عاطف بگھیلا اور اس کے گھر والے تو بیٹی کی پیدائش پر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ ان لوگوں کے اندر جاہلانہ باتیں نہ تھیں بلکہ وہ بیٹی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت گردانتے تھے۔ بیٹی کی پیدائش کیا ہوئی عاطف بگھیلا نے گھر میں قرآن خوانی کروائی اور اپنے پیرومرشد کو بلوا کر ان سے اپنی بیٹی کو گھٹی دلوائی۔ پیرومرشد نے ہی اس کی بیٹی کا نام زینب رکھا۔

''تمہاری بیٹی بہت سلیقہ مند ثابت ہوگی عاطف۔'' پیر صاحب نے اسے آہستہ سے بتایا۔

''حالات کا مقابلہ کرنا۔ کچھ کٹھن حالات تمہای زندگی میں آئیں گے لیکن تمہاری یہ بیٹی ان حالات کو سدھارنے کی موجب بنے گی۔ بہت پیار دینا اپنی بیٹی کو۔ اس کی ہر خواہش کے سامنے سرتسلیم خم کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ کہ اس نے تمہیں بیٹی سے نوازا ہے۔ یہ اس کی رحمت ہے۔''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں پیر صاحب۔'' عاطف بگھیلا نے ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے ہوکر کہا۔

''انشاء اللہ میں آپ کی ہر بات کو ذہن نشین رکھوں گا اور اپنی بیٹی کی پرورش میں کوئی کمی نہیں کروں گا۔''

دن گزرتے رہے۔ ایک دن راجہ حنیف کی اہلیہ ان کے گھر آن ٹپکی۔ جسے دیکھ کر زرمین چوہدری کا پارہ ہائی ہوگیا لیکن گھر آئے مہمان کی خاطر تواضع کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اسے والدین اور سسرال

خیالات کی ندرت

ہماری پوری زندگی ریل کے ایک سفر کی مانند ہے کہ جس کا پہلا اسٹیشن ہماری پیدائش سے شروع ہوتا ہی اور زندگی کی آخری سانس پر اس سفر کا اختتام ہوتا ہے۔ ہمارا بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا اس سفر کے مین اسٹیشن ہیں اور ہر روز، ہر لمحہ ہماری زندگی کی ٹرین گھڑی کی ٹِک ٹک کے ساتھ گزرتی چلی جا رہی ہے۔ حالات وواقعات، خیر وشر کا تصادم، ضمیر کی آواز اور زندگی کے تمام کام کراماً کاتبین مسلسل قلم زد کیے جا رہے ہیں۔ ہماری زندگی کے آخری لمحے تک ہماری ''زندگی کی کتاب'' کتابِ زندگی تیار ہو جاتی ہے جو بلا کم وکاست بغیر کسی Personal Opinion کے حقائق پر مبنی Real Auto Biography ہوئی ہے جو روزِ محشر ہمارے ہاتھوں میں پکڑا دی جائے گی کہ اپنا عمل دیکھ لو!!! اب سوچنا یہ ہے کہ!! کیا آخری اسٹیشن پر سفرِ زندگی ختم ہو جاتا ؟؟ ہم سب جانتے ہیں کہ اس کے بعد ایک طرف تو عالم ارواح کی طرف ہماری روح کا سفر شروع ہوتا ہے تو جسم کا زمینی سفر شروع ہو جاتا ہے۔ منکر نکیر کے سوالات اور زمین کا رویہ ساتھ ہی قبر کے حالات کہ جس میں ہر لمحہ زندگی کے ماہ وسال میں کیے گئے اعمال کی جزا وسزا کی کیفیات سے گزرتا ہے اور روز محشر برپا ہونے تک ہمارا جسم ایک کربناک کیفیت میں رہتا ہے کہ اس روز تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ ملنا ہے۔ اپنے سفرِ آخرت کو بہتر بنانے کے لیے کہ جو آنکھ بند ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے اور روزِ قیامت اور اس کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنے والا ہے کہ موت کو بھی موت آجائے گی اور سوائے زندگی کے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا اور ہمیں اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ہم ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین۔ (تحفہ خیالات۔ نزہت ناز۔ کراچی)

میں ایک ہی بات سمجھائی گئی تھی کہ کبھی بھی مہمان کے ساتھ برا لہجہ یا رویہ نہ اپنانا کیونکہ گھر آیا مہمان اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔ راجہ حنیف کی بیوی نے اسے اکیلا دیکھا تو اس کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ مزید زرمین چوہدری کو کہا کہ۔ ''راجہ حنیف اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔ اس نے بتایا ہوتا کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہوتا۔ میں اپنے بُرے سلوک پر معذرت خواہ ہوں۔ وہ آج بھی تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ لیکن درمیان میں یہ لوگ آگئے۔ تم نہیں جانتیں تمہارا شوہر کتنا بڑا کمینہ ہے۔ کتنی ہی دوشیزاؤں کو دھوکہ دیتا ہے اس نے۔''

''تم بکواس کر رہی ہو؟'' زرمین چوہدری غصے سے بولی۔

''اچھا اپنے خاوند سے نعیمہ کا پوچھنا کہ اس نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟'' اتنا کہہ کر راجہ حنیف کی بیوی تو چلی گئی لیکن زرمین چوہدری کو شک کی چادر اوڑھا گئی۔

رات جب عاطف بگھیلا کام سے واپس آیا تو زرمین چوہدری بھڑک اٹھی اور پہلا سوال ہی نعیمہ کا کیا۔ نعیمہ کا نام سن کر عاطف بگھیلا ٹپٹا گیا۔

''آخر تم سے نعیمہ کا ذکر کس نے کیا؟'' عاطف بگھیلا نے پوچھا۔

''اس بات کو چھوڑ و اور یہ بتاؤ کہ تم نے نعیمہ اور نجانے کتنی اور دوشیزاؤں کو دھوکہ دیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟'' زرمین نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم میری بات......'' عاطف بگھیلا نے وضاحت کرنا چاہی لیکن زرمین چوہدری نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر انگلی لہراتے ہوئے اسے چپ کروا دیا۔

''جسٹ ہاں یا ناں۔'' زرمین چوہدری نے

بدستور اپنی بات پر ڈٹے رہتے ہوئے کہا۔
''نہیں۔'' عاطف بگھیلا نے دھیمے سے لہجے میں جواب دیا۔
''مجھے تم پر یقین نہیں رہا۔'' زرمین چوہدری نے کہا تو عاطف بگھیلا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ تمہاری حقیقت اتنی بھیانک ہوگی۔ یاد رکھنا میں کل اپنی بیٹی کو لے کر اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تو ہمیشہ کے لیے مجھے اور اپنی بیٹی کو کھو بیٹھو گے۔ جس دن مجھے یقین ہو گیا کہ تم سچے ہو اس دن میں لوٹ آؤں گی نہیں تو میں ساری زندگی وہیں گزار دوں گی۔''
زرمین چوہدری بات کرتے ہوئے رو پڑی تھی۔ عاطف بگھیلا نے اسے وضاحت کر دینی چاہی لیکن اس نے اسے چپ کروا دیا اور کہا کہ وہ کمرے سے باہر نکل جائے۔
دوسری صبح زرمین چوہدری اپنی بیٹی اور تھوڑا بہت سامان لے کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ گھر میں کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ ایک بار پھر دونوں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جمع تھے۔
''آج 23 مارچ ہے۔ میں جب بھی لوٹی 23 مارچ کو ہی لوٹوں گی۔ دعا کرنا میری یہ غلط فہمی جلد ہی دور ہو جائے۔''
اتنا کہہ کر زرمین چوہدری اپنی بیٹی اور سامان سنبھالتی ہوئی ٹرین میں سوار ہوگئی۔ کتنی ہی دیر تک عاطف بگھیلا ٹرین کو دور جاتے دیکھتا رہا اور پھر ایک طرف لگے بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے رکھے بینچ پر براجمان ہو گیا۔ دیر تک اس کی آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ زرمین چوہدری نے کتنی جلد بازی کی تھی۔ اسے اپنی صفائی تک پیش کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔

☆......☆......☆

وقت پر لگا کے اُڑ رہا تھا۔ آج تیرہ برس بعد جب ٹرین رکی زرمین چوہدری کے ساتھ اس کی جواں بیٹی بھی ٹرین سے اتری۔ ایک وقت تھا جب اس نے بیٹی کو اٹھایا ہوا تھا جبکہ آج اس کی بیٹی اس کے ساتھ ہی اتری تھی۔ زینب کا قد بھی تقریباً ماں کے شانوں برابر آ رہا تھا۔ دونوں کی متلاشی نگاہیں پلیٹ فارم پر ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔ تبھی زرمین چوہدری کو بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے رکھے بینچ پر براجمان عاطف بگھیلا دکھائی دیا۔ جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ خیالوں کی دنیا میں وہ اتنا کھویا ہوا تھا کہ اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ کوئی اس کے پاس کھڑا ہے۔
''بابا۔'' عاطف بگھیلا کی بیٹی نے اسے مخاطب کیا لیکن وہ اتنا کھویا ہوا تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا۔
عاطف بگھیلا اسی طرح یادوں کی یلغار میں پھنسا رہا۔ زرمین چوہدری کو اپنے مجازی خدا پہ بہت ترس آ رہا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا۔ غلط فہمی کی بنیاد پر کیا تھا۔ تیرہ برس ایک غلط فہمی کی بنیاد پر اس نے اپنے میکے میں گزار دیے اور اس کے کہنے کے مطابق ایک بار بھی عاطف بگھیلا ان کے پیچھے نہیں گیا تھا۔ لیکن ہر سال وہ باقاعدگی سے پلیٹ فارم پر برگد کے اس پرانے درخت کے نیچے رکھے بوسیدہ بینچ پر آکر بیٹھ جاتا تھا اور رات گئے تک زرمین اور زینب کے لوٹ آنے کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ رات کے آخری پہر جب آخری ٹرین بھی چلی جاتی تھی تو وہ شکستہ دل کے ساتھ چلتا ہوا واپس چلا جاتا تھا۔ اس کے والدین نے کتنی ہی بار اسے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو لینے نہ سہی اپنی بہن کے گھر ہی چلا جائے لیکن وہ نہ گیا کہ کہیں اس کی بیوی کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے۔ دوسری طرف زرمین چوہدری کے والدین نے بھی بہت زور لگایا کہ وہ غلط فہمیوں کی دیوار کو گرا کر واپس چلی جائے لیکن وہ متواتر بضد رہی کہ وہ کسی طور بھی اس شخص کے پاس نہیں جائے گی جس نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔
ایک شام جب وہ گھر کے لان میں براجمان تھی تو اسے پتا چلا کہ اس کے لیے کسی کا فون ہے۔ اس نے موبائل کان سے لگایا تو بولنے والے کی آواز پہچاننے میں اسے ایک منٹ بھی نہ لگا۔ وہ کوئی اور نہیں راجہ حنیف کی بیوی تھی۔ جس نے اسے

بتایا کہ وہ زندگی اور موت کے درمیان پنڈولم کی طرح لٹک کر رہ گئی ہے۔ مزید برآں جو کچھ بھی اس نے بتایا تھا وہ سب فرضی اور من گھڑت باتیں تھیں جو صرف اس لیے کہی گئیں کہ ان لوگوں سے عاطف بگھیلا کی خوشحالی برداشت نہ ہوتی تھی۔

زرمین چوہدری نے مزید کچھ سننا گوارہ نہ کیا اور موبائل زور سے پٹخ دیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس کا دل اسے پہلے دن سے ہی کہتا آ رہا تھا کہ عاطف بگھیلا ایسا نہیں ہو سکتا لیکن وہ دل کی ماننے کو تیار ہی کب تھی۔ آج جب اس کے سامنے حقیقت افشاں ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

اس نے جب اس بات کا اپنے گھر والوں سے اظہار کیا تو سب کے چہروں پر خوشی رقصاں تھی۔ سب اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوئے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ عاطف بگھیلا اس سے والہانہ محبت کرتا ہے اور وہ ضرور آج بھی اس کے انتظار میں پلیٹ فارم پر موجود ہو گا جہاں وقت اور حالات نے انہیں پہلی بار ملایا تھا اور اب دونوں ماں بیٹی عاطف بگھیلا کے سامنے کھڑی تھیں۔

جب عاطف بگھیلا نے اپنی بیٹی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو زرمین چوہدری آگے بڑھی اور اس نے عاطف بگھیلا کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا لیکن دوسرے ہی لمحے عاطف بگھیلا کا جسم ایک طرف لڑھک گیا۔

دیر...... بہت دیر ہو چکی تھی۔ غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ عاطف بگھیلا کی زندگی کا آفتاب بھی غروب ہو چکا تھا۔ تیرہ برس انتظار کرنے کے بعد آج اس کی ہر امید دم توڑ گئی تھی۔ آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی کبھی واپس نہیں آئے گی۔ کسی کو پتا بھی نہ چلا کہ پرسکون بیٹھا شخص ابدی نیند سو چکا ہے۔ غم سے نڈھال عاطف بگھیلا کو ہارٹ اٹیک ہوا جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور بیٹھے بیٹھے اپنے محبوب کی راہ تکتے تکتے دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

زرمین چوہدری اور اس کی بیٹی نے دھواں دھار رونا شروع کر دیا تھا مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

ایک چھوٹی سی غلط فہمی کی وجہ سے ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے کرتے آج زرمین چوہدری سب کچھ کھو چکی تھی۔ وہ تہی دست ہو چکی تھی لیکن اس سے زیادہ وہ اپنی بیٹی کی مجرم بن چکی تھی۔ جو ہمیشہ اپنے باپ کے پیار کے لیے ترستی چلی آ رہی تھی۔ ٹرین سے اترنے والے لوگوں کا جم غفیر جمع ہو چکا تھا۔ لیکن کوئی بھی مرنے والے شخص کی حقیقت سے آشنا نہ تھا کہ جس نے تیرہ برس اپنی بیوی اور بیٹی سے جدائی کی صورت میں مرغ بسمل کی طرح کاٹے تھے۔ ایک ایک پل جس کے لیے ماہی بے آب کی طرح بیتا تھا لیکن اس کی اس کیفیت کا کبھی اس کی بیوی نے نہیں سوچا تھا۔ ایک بے جا ضد اور غلط فہمی کی وجہ سے اس نے اپنے خاوند کی آنکھوں سے ہر خواب اور دل سے ہر خواہش چھین لی تھی اور اسی کشمکش میں آج عاطف بگھیلا اپنی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ زرمین چوہدری نہ صرف اپنی بیٹی کی مجرم تھی بلکہ اپنے مجازی خدا کی بھی مجرم بن چکی تھی۔ جس کے ساتھ اس نے اتنا ظلم کیا تھا کہ تیرہ برس میں ایک بار بھی اپنی بیٹی کو اس سے نہ ملنے دیا تھا لیکن باوجود اس کے عاطف بگھیلا نے اس کی بات کو سر آنکھوں پر رکھا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق ایک بار بھی وہ اس کے گھر نہیں گیا تھا۔

گاڑی جا چکی تھی۔ پلیٹ فارم سے لوگ آہستہ آہستہ سرکنا شروع ہو چکے تھے۔ مجمع میں سے ہی کسی نے فون کر کے ایمبولینس منگوالی تھی۔ عاطف بگھیلا کو ایمبولینس میں ڈال کر اس کے گھر پہنچا دیا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر لگے بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے رکھا بوسیدہ بینچ خالی رہ گیا تھا۔ دو چار دن بھی نہ بیتے ہوں کہ وہ بینچ بھی ٹوٹ گیا۔ شاید اس بینچ کو بھی عاطف بگھیلا کی عادت ہو گئی تھی۔ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکا اور......

☆☆☆

پانچویں ٹرین بیتی

انسان V/S حیوان





اعجاز احمد فکرال

پلیٹ فارم پر شروع ہونے والی ایک حیوانی محبت کی یادگار داستان، جسے انسان کا زہر کھا گیا

وسیم ڈیوٹی پر پانچ منٹ پہلے پہنچنے کی ہمیشہ کوشش کرتا۔ اس کو منہ اندھیرے سکھر ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتا دیکھ کر راستے میں بیٹھے ہوئے آوارہ کتے بھونکنا شروع کر دیتے۔ ایک دن آفس میں نہ جانے کہاں سے ایک پلا آ کر اس کی کرسی کے نزدیک بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں چاٹنا شروع کر دیئے۔ وسیم نے سوچا! شاید اس کو بھوک لگی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی وہ بھاگ کر قریبی سٹال سے دس روپے کا دودھ کا ڈبہ لے آیا اور کتے کو اسٹیشن سے باہر لے گیا۔ اس نے ڈبے کو کھول کر دو اینٹوں کے درمیان رکھ دیا تا کہ دودھ گرنے نہ پائے اور پلے کا پیٹ بھی بھر جائے۔ وہ پلا ڈبے سے چپ چپ کی آوازیں نکالتے ہوئے دودھ چاٹنے لگا۔

لم دھڑنگ لائن میں یونس نیلی یونیفارم میں ملبوس ڈیوٹی پر آ رہا تھا۔ اس نے پلے کو دودھ پیتا دیکھ کر ایک ٹانگ رسید کر دی اور دودھ گرا دیا۔ شاید یہ سوچ کر کہ آوارہ کتوں کو اسٹیشن کے نزدیک نہیں پھٹکنا چاہیے۔ پلے نے پاؤں اٹھا کر یونس کے آگے پیچھے چکر لگا کر بھونکنا شروع کر دیا۔

اب اس پلے کا روزانہ کا معمول بن گیا۔ وہ پلا دن میں جتنی بار یونس کو دیکھتا، دم ہلاتے ہوئے یونس کے آگے پیچھے چاؤں چاؤں شروع کر دیتا۔ آس پاس کھڑے ملازمین اور دوسرے مسافروں کی ہنسی نکل جاتی کہ اس پلے کو یونس کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ راہ چلتے لوگ یہ معاملہ دیکھ کر رک جاتے، ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔ پلے کو خلقت کے سامنے اپنے اوپر بھونکتا دیکھ کر یونس کے ماتھے کی تیوری بدل جاتی۔ آہستہ آہستہ یونس کو بھی اس پلے سے چڑ سی ہوگئی۔

کافی ضبط کرنے کے باوجود وسیم کی بھی ہنسی نکل جاتی۔ ایک دن وسیم کو ہنستا دیکھ کر یونس اس کے قریب آیا اور پوچھا، ''لوگ تو ہنستے ہیں مگر تم میرے اوپر کیوں ہنس رہے ہو؟''

وسیم نے جواب دیا، ''یونس اس پلے کو آپ کی یونیفارم سے محبت ہوگئی ہے، اس لئے آپ ہی پر بھونکتا ہے۔ میں اس کو دودھ پلاتا ہوں، میرے پاؤں چاٹتا ہے۔ بے زبان جانور محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ آپ بھی اس کی سیوا کریں تو یہ آپ پر بھونکنے کی بجائے پاؤں چاٹے گا۔''

یونس نے وسیم کا عاجزانہ جواب سن کر غصہ

تھوکنے کی بجائے جواب دیا، ”میں اس کا ایسا علاج کروں گا کہ ہمیشہ کے لیے بھونکنا بند کردے گا۔“

وسیم نے کہا، ”بھائی کوئی علاج ولاج نہ کرنا اس بے زبان جانور کا۔ یہ زمین صرف انسان ہی کی ملکیت نہیں۔ انسان کی طرح دوسری مخلوقات کو بھی زمین پر زندہ رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا انسان کو۔ اور انسان اشرف المخلوقات ہوکر کونسا کرہ ارض کو سنوار رہا ہے بلکہ انسان ہی ایسی بگڑی ہوئی مخلوق ہے اور اس قدر سرکش ہے کہ زمین کی ہر چیز کو روند رہا ہے اور نہ صرف جانوروں کی ہر نسل کو ختم کر رہا ہے بلکہ ہر چیز کو ختم کر رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہر جانور اور کیڑے مکوڑے ماضی کی تاریخ میں تصویریں بن کر رہ جائیں گے۔“

آخر وہی ہوا جس کا وسیم کو ڈر تھا۔ ایک دن یونس یونیفارم میں ملبوس گشت پر تھا کہ پلا اس کے آگے پیچھے دم ہلاتا ہوا بھونک رہا تھا۔ ایک ریل گاڑی ریلوے اسٹیشن کے اندر داخل ہوئی۔ جونہی ریلوے انجن یونس کے نزدیک پہنچا یونس نے پلے کو فٹ بال کی طرح زوردار ہٹ لگائی۔ پلا ہوا میں لہراتا ہوا انجن کے آگے جا گرا۔ ہزاروں ٹن کی ریل گاڑی اس کے اوپر سے گزر گئی۔

ایک قلی ہانپتا کانپتا ہوا وسیم کے پاس بھاگا ہوا آیا اور کہا، ”وسیم یونس نے پلے کو ٹھوکر مار کر چلتی ہوئی گاڑی کے آگے پھینک دیا ہے۔“

وسیم فوراً آفس سے باہر آیا اور پلیٹ فارم سے نیچے اتر کر گاڑی کے نیچے پلے کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ ایک جگہ بے سدھ پڑا تھا۔ وسیم نے اس کو ہلایا جلایا۔ ابھی سانسیں چل رہی تھیں۔ اگلی دونوں ٹانگیں کٹ چکی تھیں۔ خون بہہ رہا تھا۔ وسیم کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وسیم پلے کو اٹھا کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ کتے کو خون میں لت پت تڑپتا دیکھ کر آس پاس کھڑے لوگوں کو بھی یونس پر غصہ آ گیا۔

ایک بوڑھی عورت نے چیخ کر کہا، ”ظالم اس طرح جانور کو مارتے ہیں۔“



دوسری نے پریشانی کی حالت میں مڑ کر کہا، ''بے زبان جانور پر ظلم کرتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آئی۔''

ایک ٹوپی شخص نے بھی غصے کا اظہار کرتے کہا، ''تم سے کیا جائیداد مانگتا تھا جو تم نے اس معصوم کو چلتی گاڑی کے آگے پھینک دیا۔ بے زبان جانوروں سے ضد لگاتے ہو کچھ تو حیا کرو؟''

پلے کی چلتی سانسیں دیکھ کر وسیم فوراً اس کو قریبی ویٹرنری ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے کہا، ''بچ جائے گا۔'' اور اس کی لٹکی ہوئی اگلی دونوں ٹانگیں کاٹ کر پٹی کر دی۔'' وسیم نے پلے کو گھر لا کر تیمارداری شروع کر دی۔

کچھ دن بعد پلا ٹھیک ہو گیا۔ وسیم اس کو موتی کے نام سے پکارنے لگا۔ اب موتی چار کی بجائے دو ٹانگوں سے کام لینے لگا اور رینگنے کی بجائے کبھی کبھی انسانوں کی طرح کھڑا ہو کر چلتا۔ موتی جب دو ٹانگوں پر چلتا تو بہت دلچسپ اور عجیب معلوم ہوتا۔ لوگ موتی کو دیکھتے تو حیرت سے ان کی ہنسی کے فوارے چھوٹ جاتے۔ موتی کی حرکات وسکنات لوگوں کو اتنی اچھی لگنے لگیں کہ وہ ہر دلعزیز بن گیا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اس کو دور دراز سے دیکھنے کیلئے آنے لگے۔ بچے موتی سے خوف کھانے کی بجائے اس سے دوستی کرنے لگے۔

لوگ اس سے باتیں کرتے ہوئے کہتے، ''کھڑے ہو جاؤ تو وہ کھڑا ہو جاتا، کہتے گھومو تو وہ ٹانگوں پر کھڑا ہو کر گھوم جاتا، کہتے چلو تو دو ٹانگوں پر چل کر دکھاتا۔'' لوگ ہوا میں چیزیں پھینکتے تو وہ منہ میں پکڑ کر لاتا۔ موتی آوارہ کتوں کی بجائے نسلی کتا ثابت ہوا۔ وسیم کے گھر سارا دن تماشا لگا رہتا۔ مداریوں نے موتی کے منہ مانگے دام لگانے شروع کر دیے۔

موتی کی وسیم سے انسیت ناقابل فراموش محبت میں بدل گئی۔ وہ وسیم سے اتنا زیادہ گھل مل گیا کہ وسیم نے اس کے گلے میں پٹہ ڈال کر آفس لے جانا شروع کر دیا۔ وسیم صبح جاتے وقت موتی کو سائیکل کی ٹوکری میں بٹھا لیتا اور شام کو واپس لے آتا۔

وسیم نے موتی کو سکھا دیا کہ انسانوں پر نہیں بھونکنا۔ اب موتی یونس کو دیکھ کر منہ موڑ لیتا۔ موتی اسٹیشن پر بھی مسافروں کا مرکز نگاہ بن گیا۔ لوگ کرنسی نوٹ ہوا میں اچھالتے تو وہ اچھل کر پکڑ لیتا۔ مگر وسیم محنت کے بغیر اس قسم کی خیراتی رقم حاصل کرنے سے گریز کرتا رہا۔ موتی کی شہرت اور یونس کی بدنامی میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔

جونہی موتی کو ریل گاڑی کے انجن کے اسٹیشن کے اندر داخل ہونے کی آواز آتی وہ پلیٹ فارم پر ریلوے لائن سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچ جاتا۔ اور انجن قریب پہنچنے پر کھڑا ہو کر بھونکنا شروع کر دیتا۔ جب انجن اس کے پاس سے گزر جاتا تو خاموش ہو کر واپس آ جاتا۔

موتی بڑا ہو رہا تھا۔ اس کی کتیانہ حسیں تیز ہو رہی تھیں۔ رات کو شور سے چوکنا ہو جاتا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس کو چوری کرنے کی بھی کوششیں کیں۔ مگر موتی بھونک کر ان کے ارادے خاک میں ملا دیتا۔

آٹھ اکتوبر کے زلزلے میں گری عمارتوں کے ملبے سے زندہ انسانوں کو نکالنے کیلئے وسیم موتی کو بالا کوٹ لے گیا۔ موتی نے وسیم کی توقعات سے بڑھ کر کارگردگی دکھائی۔ وہ مردہ اور زندہ انسانوں کی بو سے آشنا ہو کر ملبے میں منہ مارنا شروع کر دیتا تھا۔ وہ پیٹ اور دونوں ٹانگوں سے رینگتا ہوا خطرناک عمارتوں کے ملبے میں گھس جاتا اور بھونک کر اندرونی صورتحال سے باخبر کر دیتا تھا۔

وسیم کے پیچھے لوگوں کا ایک جم غفیر تھا، جو عمارتوں کے ملبے کے نیچے اپنے عزیز واقارب کے زندہ جاننے کی خبریں سننے کیلئے منت سماجت کر رہے تھے۔

جونہی موتی کسی عمارت کے ملبے سے باہر آ کر صورتحال سے آگاہ کرتا۔ لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی اور وہ ملبے کو ہٹانے کیلئے کوششیں تیز کر دیتے۔

موتی ایک گھر کے ملبے میں رینگتا ہوا گھس گیا۔

جہاں ماں دم توڑ چکی تھی اور نوزائیدہ بچہ زندہ تھا۔ موتی اس نوزائیدہ بچے کے کپڑے کو منہ میں دبا کر گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ موتی نے ایک سکول کے ملبے میں چند بے ہوش بچوں کی بھی نشاندہی کی جن کو ریسکیو ٹیموں نے زندہ نکال لیا۔

موتی کئی خطرناک عمارتوں کے اندر گیا۔ جہاں انسان نہیں جا سکتے تھے۔ لوگ کئی دن تک موتی سے کام لیتے رہے اور زندہ افراد کو باہر نکالتے رہے۔ خطرناک جگہوں پر جانے سے موتی کا جسم زخموں سے بھر چکا تھا۔ وسیم تھک جاتا تھا مگر موتی نہیں تھکتا تھا۔ موتی نے دن رات جاگ کر کئی لوگوں کی جانیں بچائیں اور خطرات سے آگاہ کیا۔ زلزلے کی خطرناک جگہوں پر کام کر کے اور انسانوں کو زندہ بچا کر موتی نے انسان دوستی کا حق ادا کر دیا۔ موتی کے کارنامے دیکھ کر وسیم کو یونس کے کردار پر شک گزرنے لگا۔ لوگ پریشان بھی تھے۔ موتی پر ترس بھی کھا رہے تھے اور موتی کی ذہانت کی داد بھی دے رہے تھے۔ اس طرح موتی ایک معذور ہوتے ہوئے لوگوں کا ہیرو اور وسیم کیلئے سچا موتی بن گیا۔ دنیا کی ریسکیو ٹیموں نے موتی کے ساتھ فوٹو اتروائے اور کئی ٹیموں نے وسیم سے موتی کو خریدنے کی آفر کی۔ مگر وسیم کو موتی کی وفاداری پر ناز تھا۔

☆☆☆

چند دن بعد وسیم اور موتی واپس آ گئے۔ دونوں خراشوں اور زخموں سے چور تھے۔ محلے اور آفس میں سب نے موتی کا حال پوچھا۔ اس کی کارگردگی کو سراہا اور آوارہ لوگوں کے کرداروں پر افسوس کا اظہار کیا۔ یہ کہہ کر موتی ایک معذور جانور ہوتے ہوئے بھی اتنا زیادہ کارآمد ہے۔

اب وسیم موتی کو آرام کرنے کیلئے گھر ہی چھوڑ جاتا تھا۔ وہ انسان دوست جانور ہونے کی وجہ سے سب کا کہا مان لیتا تھا۔ اور کرتب دکھا کر لوگوں کو خوش کرتا رہتا تھا۔

آج صبح موتی نے وسیم کے ساتھ آفس جانے کی ضد کی۔ مگر وسیم نے نظرانداز کر دیا۔ شام کو وسیم واپس آیا تو موتی نے وسیم سے اٹھکیلیاں کرنے کی بجائے منہ موڑ لیا۔ موتی دروازے میں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وسیم نے اس کو راستے سے ہٹانا چاہا تو وہ اکڑ گیا۔ وسیم نے پیار کرنا چاہا تو اس نے چہرہ دور کر لیا۔

وسیم دروازے میں ہی بیٹھ گیا تو وہ بھی بیٹھ گیا۔ وسیم نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ کافی دیر بعد اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ پھر وہ رینگتا ہوا اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

اگلے دن وسیم اس کو سائیکل کی ٹوکری میں بٹھا کر ساتھ ڈیوٹی پر لے گیا اور قریب ہی ایک کونے میں باندھ دیا۔

صبح سے ریل گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ موتی انجنوں کے شور کو سن کر بھونکنا شروع کر دیتا تھا۔ ان انجنوں کے شور میں اس کا احتجاج دب جاتا تھا۔ وسیم اس کے بھونکنے سے تنگ آ چکا تھا۔ اچانک ایک گاڑی کی وسیم کو آواز آئی تو وسیم نے سوچا کیوں نہ اس کو کھول دوں۔ تا کہ موتی ایک بار جی بھر کر بھونک کر واپس آ جائے۔

وسیم نے بے خیالی میں اس کی زنجیر کھولنے کی بجائے اس کے گلے میں پڑا ہوا پٹہ کھول دیا۔ انجن قریب آتا ہوا دیکھ کر موتی نے بلند آواز میں بھونکنا شروع کر دیا۔ کافی دیر تک اس کے بھونکنے کی آوازیں نہ آئیں تو وسیم اس کو تلاش کرنے کیلئے آفس سے باہر آ گیا تا کہ اس کے گلے میں پٹہ ڈال دے۔ ایک جگہ چند لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وسیم اس طرف بڑھا۔ وسیم کا سچا موتی ہجوم کے درمیان میں تڑپ رہا تھا۔ موتی کو اس حالت میں دیکھ کر وسیم آبدیدہ ہو گیا۔

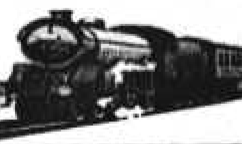
ایک قلی نے وسیم کو بتایا، ''یونس نے موتی کو زہر دے دیا ہے۔'' وسیم سر پکڑ کر وہیں بیٹھتا چلا گیا۔

جس طرح جانور کی وفاداری کا کوئی ثانی نہیں۔ اُس طرح انسان کے حسد کا بھی کوئی ثانی نہیں۔ آج وفاداری قربان ہو کر انسانیت کے نام پر دھبہ بن چکی تھی۔

☆☆......☆☆

چھٹی ٹرین بیتی

اور پٹڑی بدل گئی



عائشہ صدیقہ ضمیر

اُس شخص کی کہانی، جس کے جیون کی کچھ یادیں اس کا سرمایہ حیات بن گئی تھیں،

مگر جب زندگی کی ٹرین نے ٹرین میں پٹڑی بدلی تو......

ٹرین فضا میں مخصوص موسیقی بکھیرتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ چھک چھکا چھک۔ ذہن خواہ مخواہ اس کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ کمپارٹ منٹ کی ہر چیز ہل رہی تھی۔ بلکہ اس میں بیٹھے ہوئے مسافر بھی ہچکولے کھا رہے تھے۔ بعض ایسے ہل رہے تھے جیسے تلاوت کر رہے ہوں۔ اور باہر کا منظر بھی عجیب جادوئی لگ رہا تھا۔ درخت، جھاڑیاں، پہاڑ ہر چیز زمین کے گرد گھومتی نظر آ رہی تھی۔ جیسے تمام چیزیں گھوم گھوم کر واپس آ رہی ہوں۔

عاکف کھڑکی کے پاس بیٹھا یہ سب دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ ہر لمحہ بدلتا ہوا منظر بہت دلچسپ اور روح پرور تھا۔ دور تک پھیلے ہوئے سبز کھیت ان کی منڈیر پر جھاڑیاں پھلوں کے درخت، میدان میں آزادانہ چرتی ہوئی گائے، بکریاں، سفید اُون والی بھیڑیں اور ان کے چرواہے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھے آرام کر رہے تھے یا بانسری پر کوئی دھن بجا رہے تھے۔ کچے راستوں پر بیل گاڑی یا اونٹ گاڑی جس پر گنا یا چارا یا کوئی دوسری چیزیں لدی ہوئی تھی۔

یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں جو سرسبز شاداب کھیتوں اور باغوں کے درمیان بھلے لگ رہے تھے۔ کہیں کہیں اونچی نیچی پہاڑیاں ان پر جنگلی درخت اگے ہوئے تھے۔ ٹرین جب کسی بڑے درخت کے قریب سے گزرتی تو کسی بڑے پرندے کے پھڑپھڑانے کی سی آواز سنائی دیتی۔ اور تیزی سے گزرتے ہوئے اک انوکھے خوش گوار احساس کو جنم دے جاتی۔

عاکف کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے ریل کا سفر ہمیشہ اچھا لگتا۔ وہ سفر میں کبھی مطالعہ نہیں کرتا تھا۔ بلکہ چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہوتا۔ اس کی ذہنی کیفیت بھی ایسی ہی ہوتی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آنکھوں میں چمک سی آ جاتی۔

گاڑی کی رفتار ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اندر بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالی۔ کچھ برتھ پر سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اوپر کی برتھ پر بھی بعض لوگ لیٹے ہوئے تھے۔ دوسرے مسافر بھی اپنے مشاغل میں محو تھے۔ جیسے سامنے والی سیٹ پر دو باریش بزرگ سیاسی مذہبی گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے برابر والی سیٹ پر بچوں والی فیملی تھی۔ بچے جو شیلے اور نٹ کھٹ تھے۔ کبھی نیچے کبھی اوپر کبھی کھڑکی پر کبھی آپس میں کشتم پچھاڑم پھر رونا۔ الغرض انھیں چین نہ تھا۔ اپنی ان حرکتوں پر وہ بڑوں سے ڈانٹ بھی کھا رہے تھے۔

دوسری طرف ایک نوجوان میگزین پڑھ رہا تھا بلکہ اس کی اوٹ سے سامنے بیٹھی ہوئی خوب صورت لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جو بڑی بے نیازی سے بیٹھی باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ ساتھ میں کچھ کھاتی جا رہی تھی۔ اور بھی اسی طرح کچھ نہ کر رہے تھے۔ اس کے برابر میں اس کی بیوی افروز نیم وا آنکھیں کیے برتھ کی پشت پر سر لگائے ہوئے تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ قریب ہی اس کے دونوں بچے عدیل اور شازیہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ننھی شازیہ کو اس نے اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر باہر دیکھنے لگا۔ ٹرین پل کو عبور کر رہی تھی جو برساتی ندی پر تھا۔ اب اس کی موسیقی بدل گئی تھی۔ یعنی سر تال بدل گئے تھے۔ اور رفتار تیز ہوگئی تھی۔ تب ہی اوپر کی برتھ پر رکھا ہوا بیگ ہلتے ہلتے نیچے لیٹے ہوئے مسافر کی گود میں آ گرا۔ وہ چیخ کر کھڑا ہوگیا۔ ڈبے میں ہل چل مچ گئی۔

''اللہ خیر کرے۔'' عاکف کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ جب اصل صورت حال معلوم ہوئی سب ہنسنے لگے۔ بعض تو کچھ زیادہ ہی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ بے چارہ مسافر بھی کھسیا کر ہنسنے لگا۔ کیونکہ وہ بیگ اسی کا تھا۔ خیر سے اس میں کپڑے تھے ورنہ چوٹ ضرور آتی۔

''ابو یہ کس نے پھینکا؟'' عدیل نے پوچھا۔

''بیٹے کسی نے نہیں۔ آپ ہی ہلتے جلتے گر گیا۔''

''شازی تم ہوشیار رہنا کہیں تم پر نہ گر جائے۔''

''ہونہہ!'' عاکف مسکرایا۔ ''شازی کیوں تم پر گر گیا تو؟''

''جناب بڑا ہوں اچھل کر دور ہٹ جاؤں گا۔ یہ تو منی سی ہے۔''

اس کی بات پر وہ ہی نہیں آس پاس بیٹھے لوگ بھی ہنس دیے۔ افروز نے باسکٹ سے اورنج اور کیلے نکال کر بچوں کو دیے اور خود گنڈیریاں لیں عاکف نے بھی گنڈیریاں لے لیں۔

اب سورج ڈھل رہا تھا۔ سائے لانبے ہوگئے تھے۔ ریل پل سے کب کی گزر چکی تھی۔ اب کھیتوں



کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ کسان کھیتوں میں کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے کچے پکے مکانوں کے باہر مویشی بندھے ہوئے تھے۔ اور ٹرین وہی پرانی موسیقی الاپ رہی تھی۔ چھک چھک...... چھکا چھک۔ عاکف پھر اس میں محو ہو گیا۔

چھوٹے چھوٹے اسٹیشن اپنی رنگین عمارتوں کے ساتھ تیزی سے گزر جاتے۔ ریل وہاں نہیں ٹھہرتی تھی۔ کافی دیر بعد دور بستی کی کئی منزلہ عمارتیں نظر آنے لگیں۔ وسل کی آواز پر ریل کی رفتار کم ہوتے ہوتے رک گئی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے خوانچہ فروش کھڑکیوں کی طرف دوڑے۔ اور چیخ چیخ کر آوازیں لگانے لگے۔ گرما گرم سموسے پکوڑے، چائے بسکٹ، مچھلی تندوری روٹی، خالص ماوا ربڑی الغرض بھانت بھانت کی آوازیں لگا رہے تھے۔ اور مسافر بھی خرید رہے تھے۔ کچھ لوگ نیچے اتر گئے۔ اور جو یہاں اترنے والے تھے وہ اپنا سامان اتار رہے تھے۔ اور جو چڑھنے والے ان کا سامان قلی سروں پر لادے ڈبے میں گھس آئے۔ ان کے ساتھ مسافر بھی آ گئے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ ارے...... ارے کہتے رہ گئے۔ یہاں کہاں جگہ...... کہاں گھسے چلے آ رہے ہو۔ مگر قلی اپنا کام کر کے یہ جا وہ جا۔

افروز نے بھی تلی مچھلی اور روٹی لی عاکف نیچے اتر گیا تھا واپسی میں وہ بھی کچھ پھل وغیرہ خرید لایا۔ ڈبے میں کافی چپقلش آ گئی تھی بہت مسافر اتر گئے ان کی جگہ نئے آ گئے۔ وہ اپنا سامان اور جگہ بنا رہے تھے۔ اتنے میں آگے کی سیٹ پر جھگڑا ہونے لگا۔ پہلے والے مسافر ناراض ہو رہے تھے کہ تمہارے اتنے سامان کی جگہ یہاں نہیں ہے۔ تمہیں تو کسی خالی ڈبے میں جانا چاہیے تھا۔ اب اپنے بچوں کو سروں بٹھائیں۔ واہ بھئی خوب تماشا ہے۔ کم بخت قلی کو دیکھو سامان ٹھونس ٹھانس چلتا بنا۔ آنے والوں نے چیں بچیں ہو کر کہا۔

''کیا تم نے ڈبہ خرید لیا ہے۔ یا سدا یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ میاں تھوڑی تکلیف ہی سہی۔ آخر انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔''

''ہاں اور کیا تھوڑی دیر بے آرامی ہی سہی۔'' پیچھے سے ایک صاحب بولے۔

''بھئی دل میں جگہ چاہیے۔ سفر میں آرام کہاں کچھ سامان اِدھر رکھ لیجیے۔'' ایک اور صاحب نے کہا۔ عاکف بھی اُدھر دیکھنے لگا۔

''ایں!...... یہ تو ثوبیہ اور شاکر ہیں۔'' مارے حیرت کے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھوں میں چمک آ گئی۔ سالوں بعد ثوبیہ کو دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن وہ ثوبیہ اور شاکر ہی تھے۔ البتہ وہ پہلے کی طرح نازک اندام نہ تھی۔ بلکہ ایک بھاری بھرکم عورت تھی۔ تب اس کا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنے لگا۔

☆☆☆

یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ ایک طالب علم تھا۔ بس اسے صرف پڑھائی کی دھن تھی۔ ان کے سامنے والا گھر کئی ماہ سے خالی پڑا تھا۔ ایک دن اس کی بہن نے بتایا کہ بھیا سامنے والے گھر میں لوگ آ گئے اور سب سے بڑی بات میرے اسکول کی کلاس فیلو ثوبیہ بھی ہے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ وہ بڑی شریر ہے۔ دیکھنا۔''

''اچھا!'' وہ ہنسنے لگا پھر مجھے کیا۔ ''سہیلی تمہاری ہے میری تو نہیں۔''

انہی دنوں اس کے امتحانات شروع ہو گئے۔ وہ اور اس کے دوست رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے نیچے سو گیا۔ اتنے میں باہر سرگوشیاں اور ہنسی کی آواز آنے لگی۔ پھر دبے قدموں کوئی کھڑکی کے قریب آیا۔ وہ سوتا بن گیا۔ 'دیکھنا چاہیے آج کیا شرارت ہونے والی ہے۔' آج کل اس کے کمرے سے کوئی نہ کوئی چیز غائب ہو رہی تھی۔ یعنی کبھی پین کبھی کتاب' پوچھنے پر پتا چلا ہم تو آپ کے کمرے میں جاتے ہی نہیں۔ اس نے سوچا آج رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہیے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے اوپر بہت سا ٹھنڈا پانی آ گرا وہ گھبرا کر اُٹھ گیا۔

''یہ کیا حماقت ہے۔''

اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔ دوسری طرف ہنسنے اور بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اسے بڑا غصہ آ رہا

تھا۔ حد ہوگئی بدتمیزی کی۔ وہ صحن میں آ گیا۔ وہاں اس کی چھوٹی بہن نوشین کھڑی تھی۔

”یہ کس کی شیطانی تھی۔“ اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔

”بھائی جان میں تو ابھی آئی ہوں مجھے کیا خبر۔“ وہ روہانسی ہوگئی۔

”امی چچی وغیرہ کہاں ہیں؟“

”وہ سامنے والے گھر میں گئی ہیں۔ میں بھی وہیں سے آ رہی ہوں۔“

”یہ پانی کس نے پھینکا؟“

اتنے میں راحیل جو باتھ روم میں چھپا ہوا تھا نکل آیا۔

”میں بتاؤں بھائی جان! یہ ثوبیہ آپی نے۔ کہنے لگیں بڑا مزا آئے گا۔ باجی نے منع بھی کیا پر وہ کہنے لگیں میں تو پھینکوں گی پانی۔“ نوشین نے اسے گھورا۔

”آئندہ منع کر دینا۔ ایسی بیوقوفی پھر نہ کرے اور نہ میرے کمرے میں آئے۔ میری کئی چیزیں اِدھر اُدھر ہوگئی ہیں۔ ورنہ پکڑ کر مرغا بنا دوں گا۔“

”مگر بھائی جان وہ تو لڑکی ہیں۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔ اس بات پر وہ ہنس پڑا اور کمرے میں چلا گیا۔

ایک دن ایک کتاب جو وہ دوست سے لایا تھا غائب تھی بہت تلاش کی پر نہ ملی۔ نوشین کو آواز دی پوچھنے پر پتا چلا ثوبیہ لے گئی ہے۔

”لاحول ولا قوۃ! اس لڑکی نے تنگ کر دیا ہے۔ کبھی پین غائب، کبھی کتاب، یہ آخر میرے کمرے میں کیوں آتی ہے، بے ہودہ لڑکی ہے۔ بلا اجازت کسی کی چیز لیتے ہیں بھلا؟“ اتنے میں کھڑکی سے کسی نے کتاب پھینکی۔

”یہ لو اپنی کتاب۔ میں کھا نہیں جاتی، پڑھ کر واپس کر دیتی۔ زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کی جرأت پر۔ اس نے بغیر کچھ کہے کتاب اٹھالی۔ اس کا سارا غصہ ختم ہو گیا۔

کافی دن گزر گئے کوئی بات قابل ذکر نہ ہوئی۔ ثوبیہ اب بھی گھر میں آتی تھی اب چچی بھی اسے بہت پسند کرنے لگی تھیں۔ اور آپی بھی۔ کیونکہ شریر بہت تھی سب سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھی مگر اب وہ اس کے کمرے کی طرف نہیں آتی تھی۔ وہ اسے آتے جاتے دیکھتا مگر کبھی توجہ نہ دیتا۔

ایک دن تیار ہو کر کالج جا رہا تھا۔ ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ اوپر سے بہت سارا پانی اس کے قریب آ گرا۔ اس پر بھی چھینٹیں آئیں۔ اس نے اوپر دیکھا ثوبیہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”اوہ! آپ تھے میں سمجھی گلی سونی ہے۔ سوری ویری سوری۔“ اور پھر بس۔ وہ گھر واپس آیا کپڑے تبدیل کیے۔ اس نے سوچا ایک دن اسے سزا ضرور دینی چاہیے۔ آخر مجھے کیوں تنگ کرتی ہے میرا اس کا کیا مذاق۔

ایک دن کالج سے لوٹا تو دیکھا اس کے کمرے میں میز پر جھکی ہوئی کچھ کر رہی ہے۔ وہ دبے پاؤں گیا۔ اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ گھبرا گئی۔ اور ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”نوشین، آپی، نومی، راحیل۔“ وہ ایک ایک کا نام لیتی رہی۔

”اونہہ! بوجھو تو جانیں۔“ اور اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

”اللہ چھوڑیے۔ میں تو چچی کے پاس آئی تھی۔ ان سے کام تھا۔“

”آج بڑے دنوں بعد چور پکڑا گیا ہے۔ بغیر سزا دیے تھوڑی چھوڑوں گا۔“ وہ آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

”بابا معاف کر دو اب نہ کمرے میں آؤں گی نہ کوئی شرارت کروں گی۔“ اس نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

”پہلے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کرو ایسے ہی معاف نہیں کروں گا۔ اس روز تم نے میرے قیمتی سوٹ کی ناس مار دی تھی۔ ٹائی اور قلم نہ ملنے پر امتحان میں دیر سے پہنچا۔“ عاکف نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اب کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گی۔ کہہ تو دیا۔ اللہ میاں کوئی آ جائے گا۔“

”چلو پھر آج سے ہماری تمہاری دوستی۔ بولو منظور ہے؟“

"ہاں...... ٹھیک ہے...... پر لوگ کیا کہیں گے۔"

"لوگوں کا کیا کہنا۔ آخر ہم پڑوسی ہیں۔"

دونوں گھروں میں خوب آنا جانا تھا۔ ثوبیہ کا ایک کزن اس کے ساتھ پڑھتا بھی تھا۔

عید آئی تو عاکف نے ایک رومال، عطر اور چھلا اور کارڈ گفٹ کیا۔ یوں دونوں میں سلام پیام شروع ہوگئے۔ محبت کے اشعار تحریر کیے جاتے۔ کبھی چھت پر جاکر باتیں ہوتیں۔ پڑھائی سے دھیان کم ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ امتحان میں وہ تھرڈ ڈویژن آیا۔ سب نے بُرا بھلا کہا۔ جو عزت اس نے گھر میں بنائی تھی خاک میں مل گئی۔ دادا جان جہاں دیدہ تھے معاملہ کو سمجھ گئے۔ فوراً فیصلہ سنا دیا۔

"اب یہ یہاں نہیں رہے گا بلکہ اپنے بڑے ابا کے گھر جاکر تعلیم مکمل کرے گا۔ اس کے دونوں بیٹے اسی کے ساتھ ہیں۔" اس نے بہت عذر پیش کیے مگر دادا جان کا فیصلہ اٹل تھا۔ وہ چلتے وقت ثوبیہ سے ملا۔ دونوں نے مستقبل کے عہد و پیماں باندھے۔ کبھی جدا نہ ہونے کا فیصلہ کیا۔

وہاں جاکر وہ اتنا مصروف ہوا۔ صبح کالج شام ٹیوشن سینٹر پھر پڑھنا وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اور سال گزر گیا۔

امتحان دے کر وہ گھر گیا تو پتا چلا ثوبیہ کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ حیران رہ گیا کہ آخر اتنی جلدی کیوں۔

مگر گھر والوں سے پتا چلا اس کی نسبت اس کے ماموں کے بیٹے شاکر سے طے تھی۔ اب شاکر کو دبئی میں اچھی سروس مل گئی ہے تو شادی ہو رہی ہے وہ اُسے بھی ساتھ لے جائے گا۔ دولت میں بڑی طاقت ہے اس سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ بلکہ محبت بھی۔ وہ ثوبیہ سے ملا۔ وہ خوب روئی اپنی مجبوری کی دردناک کہانی سنائی۔ عاکف نے کہا کہ تم منع کردو۔"

"نہیں! یہ میں نہیں کرسکتی۔ لوگ میرے والدین کو طعنے دیں گے۔ ان کا جینا دوبھر کردیں گے۔ انھوں نے مجھے پالا پوسا، اس کا میں انھیں یہ انعام دوں۔ میرے ابا بڑے عزت والے ہیں۔ وہ مجھے مار دیں گے یا خود مرجائیں گے۔ اور عاکف محبت تو ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ جس کا تعلق روح سے ہے نا کہ بدن سے۔ جسم تو فانی ہے۔ اسے جدا کیا جاسکتا ہے مگر روح کو نہیں۔ یقیناً تم مجھے کبھی نہیں بھولو گے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"میرے دل میں تم اور صرف تم ہو۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

اس طرح یہ کہانی روایتی انداز میں ختم ہوگئی۔ عاکف بہت دنوں تک اداس رہا۔ پھر تعلیم مکمل کرکے باہر جانے کا پلان بنانے لگا۔ لیکن جیسے ہی اس کی تعلیم مکمل ہوئی گھر میں اس کی شادی کے چرچے ہونے لگے۔ اس نے بہت منع کیا مگر بڑوں کے آگے ایک نہ چلی۔ ماں نے دھمکی دے دی اگر کہنا نہ مانا دودھ نہیں بخشوں گی۔"

مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق آخر وہ راضی ہوگیا۔ خوب دھوم دھام سے اس کی خالہ کی لڑکی سے شادی ہوگئی۔

افروز بہت اچھی لڑکی تھی۔ شادی کے بعد مہینے دو مہینے عزیزوں کی دعوتوں میں گزر گئے۔ پھر بہن بھائیوں نے مل کر ایک آدھ جگہ کی پکنک پارٹی منائی۔ یوں کئی مہینے ان مشاغل میں گزر گئے۔ وہ شریک تو سب میں ہوتا مگر افروز کی تقریباً ہر بات پر اختلاف کا پہلو نکال لیتا۔ بعض اوقات افروز بڑی سبکی محسوس کرتی۔ اس لیے وہ اکثر چپ رہتی۔ گفتگو میں کبھی پہل نہ کرتی۔ وہ کبھی شکایت کرتی تو لڑنے لگتا۔

"کیا میں تمہاری ہر بات پر ہاں ہاں کرتا رہوں یہی چاہتی ہو۔ مگر میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔"

ایک اس کی یہ عادت بھی تھی کہ گھر دیر سے آتا۔ ماں نے بھی ٹوکا۔ بھئی اب تم شادی شدہ ہو۔ گھر جلدی لوٹا کرو۔"

افروز بھی اس کے بغیر کھانا نہ کھاتی۔ جب وہ آتا وہ کھانا لگاتی۔ کبھی تو وہ کھالیتا کبھی کہتا باہر کھا آیا ہوں۔ پھر وہ تھوڑا بہت اکیلی کھالیتی۔

"تم میرا انتظار نہ کیا کرو کھانا کھاکر آرام کیا کرو۔" اس بات پر افروز کو بھی غصہ آجاتا۔

"سارے مرد گھر آکر اپنی بیوی کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ تم ہی دنیا سے الگ ہو۔"

عاکف جان بوجھ کر اسے تکلیف پہنچاتا۔ جیسے ثوبیہ کا اس سے انتقام لے رہا ہو۔

سال بھر بعد عدیل پیدا ہو گیا۔ افروز اس میں مصروف ہو گئی۔ اس کی وجہ سے عاکف بھی جلدی آنے لگا۔ کھانا بھی اکثر ساتھ ہی کھاتا۔

شازیہ کے بعد تو افروز نے اُس سے کچھ بھی کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔ ایک دن عاکف نے کہا۔

''کیا بات ہے میرے دیر سویر سے آنے پر خفا نہیں ہوتیں۔ کھانا اکیلے ہی کھا لیتی ہو۔''

افروز کو اس سوال پر ذہنی اذیت ہوئی۔ اس کا دل چاہا اس پڑھے لکھے جاہل کو ایسا جواب دے کہ یہ شرمندہ ہو جائے کہ وہ انسانی جذبوں کی کس کس طرح توہین کرتا رہا ہے۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لے کر کہا۔

''انسان کو اپنے حال پر صابر و شاکر رہنا چاہیے۔ کیونکہ تقدیر سے لڑنا کسی کے بس میں نہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ تم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔''

''اچھا!'' عاکف نے قدرے مسکرا کر کہا مگر دل میں اپنے آپ کو کمتر محسوس کرنے لگا۔ اسے یاد آیا شروع میں ایک دن افروز نے کہا تھا کہ آج باہر چل کر کھانا کھائیں۔ تو اس نے جواب دیا تھا کہ کیا گھر میں کھانا نہیں پکا۔

''پکا کیوں نہیں ہے مگر دل چاہ رہا ہے۔ بس۔''

''مگر مجھے اس طرح ہوٹلوں میں جا کر کھانا اچھا نہیں لگتا۔''

''تم تو اکثر باہر کھا کر آتے ہو۔'' افروز نے کہا۔

''وہ خود نہیں دوستوں کے ساتھ ہوتا ہوں وہی آرڈر دے کر منگا لیتے ہیں۔''

مگر اب تو وہ بچوں میں مگن تھی۔ وہ دیر سے آئے یا سویرے۔ عاکف نے سوچا میں نے افروز کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ویسے بھی وہ ایک گھریلو غیر جذباتی سی عورت ہے۔ گویا اس نے اپنے آپ کو مطمئن کیا۔

ثوبیہ کی شرارتیں اسے ہمیشہ یاد آتی تھیں پھر وہ سوچتا وہ بھی میری طرح ناشاد ہو گی۔ سماج نے دو زندگیوں کو برباد کر دیا۔

آج...... اتنے عرصے بعد اچانک وہ مل گئی تھی۔

بالکل غیر متوقع۔ اس نے فوراً پہچان لیا۔ اس کے برابر ہی شاکر بیٹھا تھا، برابر کی سیٹ پر غالباً ان کے بچے تھے۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ درمیان میں کسی بات پر ہنس پڑتے۔ تب اس کے دل میں حسد کی آگ لگ گئی۔

'سوچا ملوں یا نہ ملوں؟ خیر چلو حال احوال پوچھ لیتے ہیں۔ اس میں کیا حرج ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی ضرور خوش ہو گی۔ مجھے بھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔' یہ سب اس نے اپنے دل میں سوچا۔ چند خاموش لمحے یونہی گزر گئے۔ ثوبیہ کی پچھلی سیٹ پر ایک شخص میگزین پڑھ رہا تھا۔ عاکف نے اُٹھ کر اس سے کہا آپ یہ میگزین پڑھ چکیں تو مجھے دے دیجیے گا۔''

''میں پڑھ چکا ہوں یہ لیجیے۔'' اس نے میگزین اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

تب ہی شاکر اور ثوبیہ نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''آخاہ! یار عاکف تم؟''

شاکر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے لہجے میں بلا کا خلوص تھا۔ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''کیوں بھئی کیسے حال ہیں؟''

''ہم غریبوں کے کیا حال چال'' اس نے مسکرا کر ثوبیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم سناؤ۔''

''بس یار یوں ہی دربدر پھرتے رہے۔'' وہ ثوبیہ کی طرف اشارہ کر کے۔ ''اگر یہ ساتھ نہ ہوتیں تو بے موت مر گیا ہوتا۔ مثل مشہور ہے ماں نہ ماں کے جائے سب ہی لوگ پرائے۔ نہ زبان اپنی نہ مکان۔ مختصر یہ کہ پہلے دبئی، پھر دمام، پھر بحرین اور پھر سعودی عرب اور اب پاکستان۔''

''یعنی لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔'' عاکف نے ہنس کر کہا۔ اس پر سب ہی ہنس پڑے۔ ابھی ثوبیہ نے اس کی طرف توجہ نہ دی تھی جب وہ ہنسی تو عاکف نے پوچھا۔

''ثوبیہ تم تو ٹھیک ہو؟''

''الحمدللہ!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ شاکر سے وہ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ مگر ثوبیہ نے کوئی حصہ نہ

لیا۔ وہ اپنے بچوں میں لگی رہی۔ انھیں کھانے پینے کی چیزیں دیتی رہی۔ بچے چھوٹے ہی تھے۔ اتنے میں شاکر باتھ روم گیا۔ عاکف نے موقع غنیمت جانا۔

"ثوبیہ کیا بات ہے بالکل اجنبی لگ رہی ہو۔ مجھے تو تم بہت یاد آتی تھیں۔ باوجود کوشش کے تمھیں بھلا نہ سکا۔"

"کیا تم اکیلے سفر کر رہے ہو۔" اس نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں خاموش رہا۔

"معلوم ہوتا ہے تم نے مجھے بھلا دیا۔"

"یاد رکھنے کا فائدہ؟" اس نے رکھائی سے کہا۔

"وہ زمانہ جب تم نئی نئی شرارتیں کیا کرتی تھیں۔ کیا سب بھول گئیں۔ میں تو نہیں بھولا۔ یا شاید شاکر کی وجہ سے ایسا کہہ رہی ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" اس نے قدرے حیرانی سے کہا۔

"یاد رکھنے کو اور بہت سی چیزیں مثلاً بچوں اور گھر کی ذمہ داریاں کیا کم ہیں۔" اس نے تند لہجے میں کہا۔ "بچپن میں نادانیاں شرارتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بچپن ہے ہی اس کا نام۔ ذہن کچے ہوتے ہیں آگے پیچھے کا ہوش نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ طفلانہ باتیں بھول ہی جانے کے لیے ہوتی ہیں۔ یاد رکھنے کو اور بہت سی باتیں ہیں۔" اس نے اپنا شال کندھوں پر پھیلاتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

عاکف کھسیانا سا ہوگیا۔ اور اپنے آپ کو ہلا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ثوبیہ ایسا روکھا اور صاف جواب دے گی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا ثوبیہ اسے دیکھ بہت خوش ہوگی۔ ماضی کی باتیں اسے ضرور یاد ہوں گی۔ اور اس سے بچھڑنے کا دکھ۔ لیکن اس کی تمام خوش فہمی دھری کی دھری رہ گئی۔ اس کی نگاہیں ندامت سے جھک گئیں۔ ایک شادی شدہ خاتون سے اس قسم کی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔

اتنے میں شاکر تولیے سے بال جھاڑتا ہوا باتھ روم سے آگیا۔

شاکر کے سامنے وہ اپنے آپ کو مجرم وخائن محسوس کرنے لگا۔ شاکر اس کا دوست ہے۔ اور ثوبیہ اس کی عزت۔ وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں عدیل آیا۔

"پاپا چلیے آپ تو یہیں بیٹھ گئے۔"

"ارے بھائی ساتھ ہیں کیا؟" شاکر نے کہا تم بھی عجیب آدمی ہو۔ بتایا ہی نہیں۔ ذرا ملواؤ تو سہی۔"

"پھر کبھی سہی۔ اب تو تم وطن آ ہی گئے ہو۔"

اس نے عدیل کی انگلی پکڑ کر واپس اپنی سیٹ پر جاتے ہوئے کہا۔ افروز آگے کی سیٹ پر جھکی ہوئی نیم خوابی کی حالت میں تھی۔ عاکف نے اسے دیکھا۔ آج اس نے سوچا۔ افروز کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی۔ اس کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ جب کہ اس کا تو اس میں کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ واقعی وہ بہت صابر اور نیک عورت ہے۔

پھر اس نے اپنی ذہنی کیفیت کو بدلنے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں بدستور آسمان پر بادل کے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے۔ نیچے ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے۔ پرندے نیچی پرواز میں اُڑ رہے تھے۔ سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ دھوپ سنہری ہو رہی تھی۔ میدان اور چراگاہوں سے چرواہے جانوروں کو گھروں کی طرف لے جا رہے تھے۔ تب اس نے سوچا کائنات کتنی حسین ہے۔ مگر جب انسان کی آنکھوں پر غفلت اور خود غرضی کر پردہ پڑ جاتا ہے تو اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ میں ان ہی لوگوں میں شامل ہوں۔

گاڑی کی سر تال بدستور فضا میں شور مچا رہی تھی۔ اچانک اس کی سر تال بدل گئی۔ اس نے باہر دیکھا۔ ٹرین پٹری بدل رہی تھی۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ بادلوں کے ٹکڑے شنگرفی ہو رہے تھے۔ تب ہی گاڑی نے وسل دی۔

عاکف نے افروز کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔

"اٹھو اسٹیشن آرہا ہے۔ سیدھی ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اور اپنے سامان کو سنبھالو۔ کہیں کوئی چیز رہ نہ جائے۔"

افروز سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اور گاڑی آہستہ آہستہ رکنے لگی اور پھر ٹھہر گئی۔ اس کی زندگی کا صحیح اسٹیشن اب آیا تھا۔

☆☆☆

ساتویں ٹرین بیتی

آنٹی



صدف آصف

بھارت میں پیش آنے والا ایک ایسا چشم کشا واقعہ جو شاید آپ بھی کبھی نہ بھلا پائیں گے

میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، لکھنے پڑھنے کے ساتھ سیاحت کی بھی شوقین ہوں، میری چھوٹی خالہ زینب بھی میری ہم مزاج تھی۔ میں ماسی کے ساتھ مل کر صفائی ستھرائی اور جھاڑ پونچھ کروانے کے بعد تھک کر برآمدے میں آ بیٹھی ،اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ جا کر فون اٹھایا تو خالہ کی ہنستی مسکراتی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ انڈیا جانے کا پلان بنا رہی ہیں،۔ تا کہ رشتے داروں سے ملنے کے علاوہ ان کا سیاحت کا شوق بھی پورا ہو سکے،، خالہ میری مزاج آشنا تھیں انہیں خبر تھی کہ میرے پیر بھی دیس دیس جا کر گھومنے کو بے قرار رہتے ہیں، اسی لیے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی ،اندھا کیا چاہے دو آنکھیں'' میں نے خوشی خوشی گھر والوں سے اجازت مانگ لی جو بڑی منتوں کے بعد حاصل ہو سکی۔ یہ مرحلہ طے پایا تو ہم دونوں نے انڈیا میں رہائش پزیر قریبی رشتے داروں سے فون پر بات کی۔ ویزے کی درخواست دے دی گئی۔ جو جلد ہی منظور ہو گئی ۔ کاغذات کی وصولیابی کے بعد ہم نے ضروری سامان باندھا اور خوشی خوشی لاہور اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہو گئے،۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب دونوں ملکوں کے مابین ماحول میں اس قدر کشیدگی نہیں پائی جاتی تھی، بھارت کا ویزا حاصل کرنا بہت آسان نہ سہی، مگر اتنا مشکل بھی نہ تھا۔

☆☆☆

انڈیا میں ہمارا پہلا قیام بمبئی میں تھا، جو اب انڈیا میں ممبئی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہم لوگ وہاں پہنچ کر خالہ کے سسرالی رشتے داروں کے گھر ٹھہرے، یہ گھر زینب خالہ کی نند عارفہ آنٹی کا تھا۔ ان کی ایک بیٹی مونا تھی۔ جو بڑی ملنسار لڑکی نکلی۔ ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم دونوں میں جلد ہی گاڑھی چھننے لگی۔

مونا نے مجھے قریبی بازاروں کی سیر کرائی، بھیل پوری، اور پاؤ بھاجی کھلائی۔ اس نے مجھے رکشہ میں سیر بھی کرائی ۔ راستے میں نئی اور پرانی عمارتیں نظر آئیں۔ مجھے نئی نئی جگہوں کی سیر کرتے ہوئے۔ بہت مزہ آتا تھا۔

اکثر ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے شام کے وقت قریبی پارک چلے جاتے، میں وہاں بینچ پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کا مشاہدہ کرتی۔ مگر ابھی تک مجھے کوئی ایسی کہانی نہ مل سکی جسے میں صفحہ قرطاس پر بکھیر سکوں۔۔ ارے۔۔ ہاں۔۔ میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ

سیر و سیاحت کے علاوہ کہانیاں لکھنا بھی میرے مشغلے میں شامل تھا۔

دو دن بعد عارفہ آنٹی نے ہمارے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا اور چند قریبی رشتے داروں اور جاننے والوں کو اس میں مدعو کیا۔ مہمان سادہ کپڑوں میں دیے گئے وقت پر پہنچ گئے۔

عارفہ آنٹی نے مہمانوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا، وہ سب ہم سے بہت پیار و محبت سے ملے۔ خاص طور پر جب خالہ زینب نے ہنستے ہوئے سب کو بتایا کہ میں ایک قلمکار ہوں اور پاکستان کے کئی پرچوں میں میری کہانیاں چھپ چکی ہیں تو سب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خالہ نے مزہ لیتے ہوئے میری خوب تعریفیں کیں اور میں شرما گئی۔

''واہ۔۔۔ بھئی۔۔۔ ہمارے بھاگ کھل گئے۔۔۔ جو ہماری ملاقات، پاکستان کی ایک بڑی لکھاری سے ہو رہی ہے'' خالہ کی پڑوسن رادھا نے بیچ میں کھڑے ہو کر کہا تو سب نے تالیاں بجا کر بڑے پرجوش طریقے سے میری حوصلہ افزائی کی۔

اس کے بعد، میری فیلڈ اور پاکستان کے حوالے سے دلچسپ سوال جواب کیے گئے۔ جن کا جواب میں نے بڑے پروقار طریقے سے دیا۔ اس کے بعد میں ان لوگوں میں گھل مل کر ہنسی مذاق کرنے لگی۔ کھانا لگنے کا اعلان ہوا تو سب لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے بھی عافیت کی سانس لی۔

مجھے وہاں کے روایتی کھانوں یعنی پوری، بھاجی، سبزیوں کے پکوڑے اور مٹھائیاں بہت پسند آئیں۔ میں نے ایک پوری اور پیالی میں تھوڑی سے بھاجی نکالی اور مزے لے کر کھانا شروع کر دی۔ اس کے بعد سوجی کا حلوہ نکالا اور بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کی، مجھے پوجا کے برابر کی نشست خالی نظر آئی تو میں اس طرف بڑھ گئی۔

پوجا مونا کی کالج فرینڈ تھی۔ سانولی سلونی سی ہرنی جیسی آنکھوں والی پوجا کی شخصیت میں ایک انوکھی سی



کشش تھی۔ وہ دیکھنے والی نظر کو بار بار اپنی طرف کھینچتی۔ دعوت شروع ہوتے ہی وہ میری توجہ کا مرکز بن گئی، مگر اس نے دوسرے لوگوں کی طرح مجھ سے نہ بڑھ چڑھ کر سوال جواب کیے۔۔ نہ ہی میرے آگے پیچھے گھومی۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے، پیاری سی مسکراہٹ سے نوازتی رہی۔

''کیا۔۔ میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کیوں۔۔ نہیں۔۔'' اس نے شستہ لہجے میں جواب دیا۔

ایک لکھاری کی حیثیت سے مجھے لوگوں کے چہرے پڑھنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔۔ اسی لیے لاشعوری طور پر میری توجہ پوجا پر مرکوز ہوگئی، جو اپنی پلیٹ میں ایک کچوری اور جلیبی نکالے بیٹھی جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی سحر انگیز آنکھوں کی طرف دیکھ کر یوں محسوس ہوتا، جیسے ان میں کوئی بڑا طوفان چھپا ہوا ہے۔

میرے بار بار دیکھنے پر وہ چونک اٹھی اور اخلاقاً، مسکرائی مگر صاف لگتا تھا کہ اس کے پنکھڑی سے لب مسکرانا نہیں چاہتے۔

میں نے اس سے ہلکی پھلکی بات چیت شروع کی تو اس کا انداز بھی تھوڑا دوستانہ ہو چلا۔ وہ بہت حسین لڑکی تھی مگر اسے اپنے حسن کا خود بھی ادراک نہیں تھا، میں نے اپنی فطری خود اعتمادی سے اس کا دل جیت لیا اور یہ ہی تو میری منشا تھی، مجھے ایسا لگنے لگا، جیسے ایک زبردست کہانی میرے قلم کی نوک تلے آنے والی ہے۔

اس نے عارفہ آنٹی سے اصرار کیا کہ ہم سب کل کی چائے اس کے گھر پئیں۔ میں تو پہلے ہی اس کے ساتھ مزید وقت گزارنا چاہتی تھی تا کہ اس کی شخصیت پہ چھائے اسرار پر سے پردہ اٹھایا جا سکے۔ خوشی خوشی حامی بھر لی، مجھے زینب خالہ نے کسی سے ملوانے کے لیے بلوایا تو میں اس کے پاس سے اٹھ گئی، مگر میری نگاہیں اسی پر جمی رہیں۔

میرے جانے کے بعد وہ پورا وقت کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی۔ اور دعوت کے اختتام سے قبل اٹھی اور بغیر کسی کی جانب دیکھے تیز قدموں سے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ میری چھٹی حس بیدار ہوئی۔۔ پوجا کے بارے میں ایک عجیب سا احساس جاگا، جیسے وہ اپنے بس میں نہیں ہو بلکہ کسی کے زیر اثر ہو۔ ایک مہین سا غلاف اس کی شخصیت کے گرد لپٹا ہوا ہو۔

☆☆☆

دوسرے دن میں وہاں جانے کے لیے وقت سے قبل ہی تیار ہوگئی، مگر خالہ کو اپنے ایک سسرالی رشتے دار سے ملنے جانا تھا، وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد ہوئیں۔ میں نے مونا کی جانب دیکھا۔ وہ سمجھ گئی۔ اس بات کا حل یوں نکالا گیا کہ عارفہ آنٹی کو زینب خالہ کے ساتھ جانا تھا اور مونا میرے ساتھ پوجا کے گھر جانے والی تھی۔

میں اور مونا شام چار بجے پوجا کے گھر پہنچ گئے، ہم نے گھنٹی بجائی تو ایک چھوٹے قد کی بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔

''آنٹی چپل اتار کر اندر آیئے گا'' اس نے ہدایت دے کر ہمیں ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ ابھی میں اس کے آنٹی کہنے پر ہی حیران و پریشان تھی کہ اس نے ایک اور جھٹکا دیا۔

''آپ۔ یہاں۔ بیٹھیں۔۔ میں۔ ماں۔۔ کو بھیجتی ہوں۔۔'' اس نے بید کی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا اور پوپلے منہ سے بولی۔

''ہائیں۔۔ ماں۔۔'' میں نے اس بوڑھی کا پوپلا منہ دیکھ کر کہا۔

اس کے منہ سے لفظ ماں سن کر میں حیرانی کے سمندر میں گر گئی۔ مگر وہ جھکی ہوئی کمر پر ہاتھ رکھتی اندر غائب ہوگئی۔

''یہ۔ بڑی بی کون ہیں۔۔ جو اس قدر چنی منی بن رہی ہیں؟'' میں نے غصے میں مونا سے پوچھا۔۔

''یہ عورت نہیں ہے'' مونا نے افسردگی سے جواب دیا۔

''کیا۔۔ مطلب؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یہ۔۔ پوجا کی چھ سالہ بیٹی وجنتی ہے'' مونا نے دھیرے سے کہا۔

''کیا۔۔۔ کہہ رہی ہو۔۔'' میری آنکھیں پھٹ گئیں اور چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''ہاں۔۔۔ یہ۔۔ ایک کڑوی سچائی ہے۔۔'' مونا نے سر ہلا کر کہا۔

مجھے پوری بات جاننے کی بے چینی ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں مزید کوئی سوال جواب کرتی، دروازے پر آہٹ ہوئی۔

ہم دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے، سامنے سے گلابی ساڑی میں ملبوس دلکش سی پوجا مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ مجھے لگا مونا نے اس بوڑھی کے حوالے سے کوئی بھدا مذاق کیا ہے۔

☆☆☆

''آپ لوگوں کی کرپا ہے، جو ہمارے غریب خانے پر پدھاریں'' اس نے ہاتھ جوڑ کر ہمیں پرنام کیا اور بڑے تپاک سے ملی۔

''یہاں آکر بہت خوشی ہو رہی ہے۔۔ پوجا'' میں نے بھی اخلاق نبھایا۔

ناریل کی مٹھائی، پاپڑ اور مرمرے کے ساتھ مزیدار چائے پینے کے بعد میں نے مونا سے سرگوشی میں وجنتی کے بارے میں پوچھا۔

''تم۔۔ خود کیوں پوچھ لیتی'' مونا نے شانے اچکا کر کہا۔

''کیا وہ بوڑھی عورت۔۔ میرا۔ مطلب ہے وجنتی ۔۔ تمہاری بیٹی ہے؟'' میں نے رک رک کر اس انہونی کے بارے میں پوچھا۔

''ہاں۔ نائلہ جی۔۔ یہ بات سچ ہے'' پوجا کا ہنستا مسکراتا چہرہ دکھوں میں ڈوب گیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میری وجہ سے اس کے حسین چہرے پر اداسیوں نے ڈیرا سا جمالیا مگر تجسس کے ہاتھوں برا حال تھا۔

''۔ میں مکمل کہانی تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں'' میں نے اس کے ہاتھ کو چھو کر تسلی دیتے ہوئے درخواست کی۔

''میں بھی چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ جو انہونی ہوئی ہے۔ اسے تم کہانی کی شکل میں لکھو تا کہ اس سے دوسرے لوگ سبق حاصل کر سکیں، وہ غلطی نہ کریں۔۔۔ جو میں نے کی تھی'' پوجا نے میرا ہاتھ تھام کر افسردگی سے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں اور رمیش ایک دوسرے سے بہت پریم کرتے تھے، میں نے اپنے پریوار والوں کی مرضی کے خلاف جا کر رمیش سے شادی کر لی۔ اور بیاہ کر امریکا چلی گئی، جہاں رمیش ایک امریکی فرم جیسن لمیٹڈ میں بڑے اچھے عہدے پر فائز تھا۔ ہمارا گزارا بہت اچھے طریقے سے ہونے لگا۔ میں اس سمبندھ سے بہت خوش تھی، مگر پتی کے جانے کے بعد میرا وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ کیوں کہ میں نے بھی ملٹی میڈیا میں ماسٹر کیا ہوا تھا۔ اس لیے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ جلد ہی رمیش کے ایک دوست کے توسط سے مجھے ایک سوفٹ ویئر کمپنی میں جاب مل گئی۔ جیون خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولنے لگا، پورے ہفتے مصروف رہنے کے بعد، ہم ویک اینڈ پر کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتے، روپے پیسے کی بھی کوئی تنگی نہ تھی۔ اچانک میری جنت پر کسی بری نظر کا سایہ پڑ گیا، جب اچانک میرے سسر کو ہارٹ اٹیک ہوا۔۔''

پوجا بولتے بولتے تھک گئی تو پانی کے دو گھونٹ پینے کو رکی، میں اس کی بتائی ہوئی کہانی کے پوائنٹس ساتھ ساتھ، ایک کاغذ پر تحریر کرتی چلی جا رہی تھی۔۔

''باپ کے بیماری کی اطلاع ملتے ہی رمیش کی بری حالت ہو گئی، ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس ممبئی لوٹنا پڑا۔ یہاں رمیش کے پرکھوں کا مکان تھا جس میں اس کے ماتا پتا اور بھائی بہن رہتے تھے، رمیش اپنے پتا جی سے بہت اٹیچڈ تھے۔ وہ آئی سی یو میں تھے، جب ہم یہاں پہنچے۔ ہمارے انڈیا لوٹنے کے دوسرے دن ہی ان کا دیہانت ہو گیا، رمیش کے لیے یہ بات جیسے روگ بن گئی، ان کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ رمیش کی ماتا اپنے پتی کی ارتھی اٹھنے کے ساتھ ہی بستر سے لگ گئیں۔

گھر کے بڑے بیٹے ہونے کی حیثیت سے اب رمیش کا یہاں رہنا ضروری تھا۔ اسی کارن ہم نے ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کاش ہم واپس چلے جاتے تو ہمیں وہ غم نہ ملتا۔'' پوجا نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ مونا نے ہاتھ دبا کر اسے تسلی دی میں بڑی دلچسپی سے اس کی کہانی سننے میں گم تھی۔

''ہم جب ممبئی لوٹ کر واپس آئے تو ایک دن میری طبیعت خراب ہو گئی اور میں چکرا کر گر گئی، سب اسپتال لے کر بھاگے تو ایک خوش خبری میری منتظر تھی۔ میں ماں بننے والی تھی، مگر رمیش اس خبر کو سن کر ویسے خوش نہ ہو سکے

جیسے انہیں ہونا چاہیے تھا، اصل میں پتا جی کی موت کے بعد ماتا جی کی مسلسل بیماری نے ان کے اعصاب تھکا دیئے تھے۔ وہ مجھ پر بالکل توجہ نہ دیتے، میں بہت اداس رہنے لگی، اپنی دیکھ ریکھ بھی ویسے نہ کر سکی، جیسا کہ ڈاکٹر نے ہدایات کی تھی۔ بچے کی پیدائش کا سمے قریب آرہا تھا مگر فرسٹریشن کے کارن میں ایک دن بری طرح سے بیمار پڑ گئی۔ مجھے اسپتال میں دو دن داخل ہونا پڑا، ڈرپ لگائی گئی، ڈاکٹر نے خصوصی طور پر رمیش کو میرا خیال رکھنے کی تاکید کی'' پوجا نے اذیت کے ساتھ یہ بات بتائی، شاید ان یادوں کو دہرانا اس کے لیے کوئی آسان بات نہ تھی۔ میں نے مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''میری طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اب رمیش میرا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگے تھے، ایک دن ڈنر کے بعد جانے کیوں مجھے گھٹن اور سینے میں جلن کی شکایت ہوئی، رمیش دوا کھلانے کے بعد، مجھے گاڑی میں بٹھا کر ہمارے گھر سے نزدیک واقع ایک پارک میں چہل قدمی کے لیے لے گئے اس کا نام ''شیواجی پارک'' ہے۔ اس وقت رات کا سمے تھا، اماوس کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا، پارک میں لوگوں کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے جیسے ہی پارک کا مین گیٹ کراس کیا کسی پرندے کی خوفناک اور مکروہ آواز میرے کانوں میں پڑی میں ایک دم خوف زدہ ہوگئی، میں نے رمیش کی طرف دیکھا وہ بڑے نارمل انداز میں میرے ساتھ چل رہے تھے میں نے ان سے پرندے کی آواز کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ہنستے ہوئے اسے میرا وہم قرار دیا کیوں کہ بقول ان کے انہوں نے تو ایسی کوئی آواز نہیں سنی۔

مجھے اس بات سے دکھ پہنچا کہ وہ میری بات کا وشواس نہیں کر رہے، جانے کیوں میرا دل اس جگہ سے اچاٹ ہونے لگا، میں نے اپنے پتی سے فوراً وہاں سے گھر واپس جانے کی ضد شروع کر دی تو وہ تھوڑا ناراض ہونے لگے کہ ابھی تو آئے ہیں، چلتے ہیں تھوڑی دیر میں۔

میں ان کی ناراضگی کے کارن خاموشی سے واک کرنے لگی مگر میرا من اس جگہ سے جانے کیوں بیزار ہو رہا تھا، ٹھنڈے پسینے آنے لگے، رمیش نے جب میری حالت دیکھی تو ان کو بھی میری چنتا ہونے لگی کہ کہیں میری طبیعت بگڑ نہ جائے۔

انہوں نے مجھے کونے میں پڑی ایک بنچ پر بٹھایا اور پارک کے دوسرے کنارے پر بنی کینٹین کی طرف بڑھ گئے تاکہ میرے لیے پانی یا جوس لا سکیں۔ میں خوف کے مارے آنکھ بند کر کے بھگوان سے پراتھنا کرنے لگی'' پوجا نے ماتھے پر آنے والا پسینہ پونچھا، موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا مگر یہ واقعہ دہراتے ہوئے پوجا کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ مونا نے اٹھ کر اسے پانی پلایا، وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''اس سمے رات کا سناٹا مجھے خوف زدہ کر رہا تھا، اچانک کسی نے میری آستین پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا، میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک خوفناک شکل کی بوڑھی فقیرنی تھی جس نے کالے رنگ کا لمبا سا لباس پہنا ہوا تھا، اس کے گلے میں ہڈیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی، اس کی آنکھوں کا رنگ لال سرخ ہو رہا تھا، جو اس اندھیری رات میں بھی چمک رہی تھی۔ میں خوف سے کھڑی ہوگئی جلدی سے اس سے اپنی آستین چھڑائی۔ اس کے چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ تھی، میرا نواں مہینہ چل رہا تھا، وہ مسلسل میرے پیٹ پر نگاہیں جمائی ہوئی تھی، خوف جیسے میرے اندر سرایت کر گیا تھا'' پوجا نے آنکھیں بند کر کے جھرجھری سی لی میں اور مونا دلچسپی سے اس کی آپ بیتی سن رہے تھے۔

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' خاموشی کے طویل وقفے سے گھبرا کر میں نے پوجا کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا، وہ جیسے نیند سے جاگی۔

''میں نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ وہ کون ہے مگر میں نے اپنی آستین اس کی گرفت سے چھڑائی جس سے زور کا دھکا لگا، وہ مائی گھاس پر منہ کے بل جا گری، میرے منہ سے جانے کیا کیا مغلظات نکلنے لگیں، میں نے اس کی بدصورتی کا مذاق اڑایا، اسے ایک کالی بھتنی کے نام سے پکارا، اور اپنے پاس سے دور ہٹ جانے کے لیے کہا، اس سمے جیسے میں اپنے حواس کھو چکی تھی'' پوجا بتاتے بتاتے ہانپنے لگی۔

''ان سب باتوں کے بعد اس کا ردعمل کیسا تھا؟'' مونا نے پوچھا۔

''میں ایسی پتھر دل نہیں ہوں، مگر اس رات کے خوف نے میرے اندر ایک دوسری پوجا کو جنم دے دیا تھا، بہ نسبت اس کے کہ میں اس مائی کو کوئی بخشش دیتی، بلاوجہ

اسے اتنی بری بھلی سنائی، وہ اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی اٹھی اس کی آنکھ میں آنسو تھے۔

''میں تو کچھ سے کے لیے آئی تھی تاکہ تمہیں ہونے والے بچے کی بدھائی دوں، کیول اب یہ بدصورت شکل سدا تمہارے ساتھ رہے گی'' اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی عجیب سی لکڑی کی نوک مجھے چبھوئی اور بولی۔

''مائی۔۔۔سنو۔۔۔مجھے۔۔۔معافی دے دو'' مجھے ہوش آچکا تھا، اس کے پیچھے بھاگی، مگر اس نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور وہاں سے دور چلی گئی میری طبیعت بگڑنے لگی اور میں وہیں گر کر بیہوش ہو گئی'' آنسو پوجا کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے تھے، ہم نے اسے دوبارہ پانی پلایا۔

''رمیش لوٹا تو مجھے بیہوش دیکھ کر اس کی حالت خراب ہو گئی، باہنوں میں ڈال کر گاڑی میں لٹایا اور تیز رفتاری سے گاڑی بھگائی تاکہ اسپتال پہنچا جا سکے۔ اتنے میں سگنل کی بتی سرخ ہو گئی، مجھے ہوش آچکا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے وہ ہی بڑھیا دوبارہ کھڑی نظر آئی۔ رمیش دیکھو وہ ہی بڑھیا، میں نے راستے میں رمیش کو پارک والا واقعہ سنا دیا تھا اسی لیے چیخ کر اسے دکھانے لگی، مگر جب وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں ایک دم ہشاش بشاش ہو کر بیٹھ گئی اور گھر جانے کی ضد کرنے لگی۔

دوسرے دن رمیش کے آفس جانے کے بعد میں بیڈ پر بیٹھی چائے پی رہی تھی جو کام والی بائی نے مجھے بنا کر دی تھی کہ اچانک مجھے شدید سردی لگنے لگی میں باقاعدہ کپکپا رہی تھی میں نے آنکھیں بند کر لیں، مجھے ایسا لگا کہ کسی نے میرا نام لے کر پکارا ہو میں نے آنکھیں کھولیں تو سامنے وہ ہی بڑھیا کھڑی تھی، میرا خوف سے دم نکلنے لگا، میں نے چیخنا چاہا مگر میری آواز حلق میں جیسے اٹک گئی، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا پورا جسم منجمد ہو گیا ہو، میں نے دیکھا کہ اس بڑھیا کا ایک ہاتھ اچانک لمبا ہونا شروع ہو گیا تھا، اس نے وہ ہاتھ میرے پیٹ پر پھیرا، اسی خوفناک پرندے کی مکروہ آواز مجھے دوبارہ سنائی دی، شدید تکلیف کا احساس ہو، مجھے ایسا لگا کہ میری آتما پرلوک سدھارنے والی ہے۔ میں نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی'' پوجا نے حقیقتاً کپکپاتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا اس کی کہانی سن کر میرے دل کی حالت بھی عجیب ہو رہی تھی۔

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے جب دوبارہ ہوش آیا تو، میں نے دیکھا کہ سب اداس سے میرے اردگرد کھڑے ہیں۔

''بدھائی ہو آپ ایک بیٹی کی ماں بن گئی ہیں۔'' نرس نے رسمی طور پر مجھ سے کہا۔ سب کی خاموشی خصوصاً رمیش کے چہرے پر چھائی سنجیدگی سے میں نے یہ مطلب لیا کہ وہ بیٹی کے پیدا ہونے سے خوش نہیں ہیں، حالانکہ وہ تو خاصے آزاد خیال تھے لیکن اصل میں ان کی اداسی کا کارن مجھے جب سمجھ میں آیا جب نرس نے فیڈ کروانے کے لیے وہ بچی مجھے لا کر دی۔ اف اس کو دیکھ کر تو میرے بولنے کی شکتی ہی ختم ہو گئی تھی''

پوجا دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ہم دونوں کے آنسو بھی اس کا رونا دیکھ کر بہنے لگے۔

''ہے بھگوان میری بیٹی کا جسم تو نوزائدہ بچے کا تھا، مگر چہرہ ایک بوڑھی عورت کا تھا ویسا ہی چہرہ جیسا پارک والی بوڑھی فقیرنی کا تھا جس کی بدصورتی کا میں نے مذاق اڑایا تھا۔ اپنی بچی کو دیکھ کر میں دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔ اس بوڑھی فقیرنی کی بات سچ ثابت ہوئی اب وہ میری بیٹی کی صورت میں ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ یہ زندگی بھر کا روگ ہے جس نے میری خوشیوں بھری زندگی کو چتا کی آگ دے دی ہے

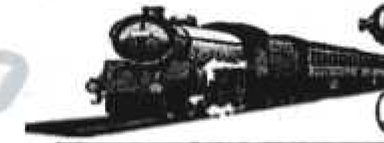
میں آپ سب سے ایک ہی بات کہوں گی کہ ہمیشہ کسی کا دل دکھانے یا کسی کی بددعا لینے سے گریز کریں'' پوجا نے بڑے دکھی دل سے اپنی کہانی ختم کی۔ ہم دونوں اپنے دل پر گہرا بوجھ لیے واپس گھر لوٹ آئے۔

آج بھارت سے واپس اپنے وطن واپسی ہے۔ میں ٹرین میں بیٹھی سوچ رہی ہوں۔ کیا واقعی جو میں پوجا کی کہانی دیکھ سن کر آئی ہوں حقیقت تھی۔ خدا سب کا حال پر رحم کرے۔ ٹرین اپنی رفتار سے چلنے لگی ہے مگر لگتا ہے جیسے کچھ نہ کچھ ضرور میں پوجا کے گھر چھوڑ آئی ہوں۔ اور آنٹی! آنٹی کی آوازیں اور وہ مکروہ صورت بڑھیا میں اپنے ذہن میں بٹھائے ساتھ لیے چلی جا رہی ہوں۔

☆☆☆

آٹھویں ٹرین بیتی

ٹرین وہاں بھی ملے گی



صائمہ مجید

اُس ٹرین کے یادگار سفر کا احوال؛ جس نے اُس نوجوان کی زندگی بنا ڈالی مگر...

ٹرین کو اسٹیشن پر آنے میں کچھ دیر ہے۔ میں ملتان کے پلیٹ فارم پر بیٹھا اِنسانوں کو بھاگتے ، دوڑتے دیکھ رہا ہوں۔ مسافر پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے ہیں۔ ٹکٹ گھر میں لمبی قطار لگی ہے اور چند مسافر ہاتھوں میں ٹکٹ لئے خراماں خراماں ویٹنگ روم کی طرف چل رہے ہیں اور جو ویٹنگ روم میں بیٹھے ہیں ٹکٹ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں۔

میں ملتان سے کراچی جانے کے لئے ایک بیگ کے ساتھ پلیٹ فارم پہ موجود ہوں۔ بیگ میں ایک ڈائری ہے جو میری کل اثاثہ زندگی ہے۔ دو سوٹ ، دو جوڑی موزے ، بنیان ، کھانے کے لئے نمکو اور بھنی ہوئی مونگ پھلی کے چند پیکٹ موجود ہیں۔ مونگ پھلی اور نمکو ہمیشہ میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اِن کا شوقین ہوں۔ کسی حد تک یہ بات دُرست بھی ہے۔ شوقین بھی ہوں لیکن میرے خاص اپنے کی نشانی بھی ہے۔

جب بھی مونگ پھلی اور نمکو کے پیکٹ دیکھتا ہوں ۔ میری آنکھوں کے سامنے وہی چنچل شوخ سا چہرہ آ جاتا ہے۔ ہاں وہی چہرہ جس کی برسوں پوجا کی ہے ۔ جس کو چاہا ہے۔ جس کا مسکراتا چہرہ مجھے جینے کا راستا دکھاتا ہے۔

آپ بھی سوچ رہے ہو گے ، میں کن باتوں کو لے بیٹھا ہوں۔ چلیئے شروع سے اپنی کہانی بتاتا ہوں ۔ آپ کو سمجھ بھی آ جائے گی اور میرا سفر بھی کٹ جائے گا۔ کچھ باتیں ، کچھ یادیں زندگی کو حسین بنا دیتی ہیں۔ وہ بھی سردیوں کی ایک حسین صبح تھی۔ جس کو دیکھو تن کو چار چار کپڑوں سے ڈھانپے اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہے۔ جرسیاں ، دستانے ، اوور کوٹ ، سر پہ اونی ٹوپی اور جانے کیا کیا۔ جانے لوگ سردی سے کیوں گھبراتے ہیں۔ مجھے تو سردیاں بہت پسند ہیں ۔ سردیوں کی لمبی راتیں ہوں ۔ لحاف ہو ، مونگ پھلی ، چلغوزے ، اخروٹ ہوں اور فرش پر پڑی انگیٹھی میں انگارے دہک رہے ہوں اور ساتھ زندگی ہو تو زندگی جینے کا مزہ آتا ہے۔

ہر کسی کا محبوب ہوتا ہے اور میرا بھی ایک دوست ہے۔ روز میں اپنے سچے دوست سے خوب باتیں کرتا ہوں ۔ ہاں میرا دوست ایسا ہے جس کی دوستی میں سکون و راحت ہے۔ سردیوں کی اِن ٹھٹھرتی راتوں میں ، میں اپنے دوست ''اللہ'' سے باتیں کر کے میرا سکون کی وادیوں میں کھو جاتا ہے۔ ''اللہ'' سے باتیں

کرنا لطف دیتا ہے اور میں اِس لطف کو کھونا نہیں چاہتا۔

دُھند کی چادر نے دن کے اُجالے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ایک گز کے فاصلے پر بھی بندہ نظر نہیں آتا تھا۔سورج کب کا دُھند کو بھگانے میں لگا ہوا تھا۔میں ملتان کے پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔اللہ اللہ کر کے آدھ گھنٹہ کے کرب ناک انتظار کے بعد ٹرین نے پلیٹ فارم سے تھوڑی دُور سے وسل دی تو میری جان میں جان آئی۔

☆☆☆☆

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب میں اِسی ٹرین سے کراچی ذریعہ معاش کے سلسلے میں جا رہا تھا۔دوستوں سے سُن رکھا تھا کہ کراچی میں بہت کام مل جاتا ہے۔پورے پاکستان سے مزدور اِدھر کا رُخ کرتے ہیں اور کمانے کے ساتھ ساتھ یہاں کے نظارے بھی کرتے ہیں۔اِسی لیے کراچی کو روشنیوں کا شہر کہا گیا ہے۔سمندر کنارے یہ شہر اپنی خوبصورتی سے ہر آنے والے کو متاثر کرتا ہے۔جو اِدھر آتا ہے یہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔پاکستانیوں کیلئے دوبئی کا درجہ رکھتا ہے۔مگر بدقسمتی سے کراچی اب کرچی کرچی ہو کر رہ گیا ہے۔افراتفری ،لوٹ مار،اسٹریٹ کلنگ معمول بن گیا ہے۔خیر میں بھی کمانے کے غرض سے کراچی کا ٹکٹ ہاتھ میں تھامے سردی کی شدت کو انجوائے کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ مونگ پھلی کے مزے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ٹرین آئی تو میں نے اپنا بیگ اُٹھایا اور مطلوبہ کمپارٹ میں سوار ہو گیا۔ڈبے میں چند مسافر تھے جو اپنی اپنی سیٹ پہ پڑے شاید اونگھ رہے تھے۔میں نے اپنا بیگ سامنے والی سیٹ پر رکھا اور خود ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔۔۔قسمت سے وہاں پہلے کوئی مسافر



نہیں تھا۔ میں نے برتھ بھی لیا ہوا تھا۔ دس منٹ رُکنے کے بعد ٹرین نے رخت سفر کا اعلان کرتے ہوئے وسل دی۔ ملتان کے پلیٹ فارم سے کافی مسافر سوار ہوئے تھے۔ ڈبہ آہستہ آہستہ مسافروں سے بھر گیا لیکن میرے ساتھ والی سیٹ پر کوئی مسافر نہ آیا۔ ٹرین چلی تو میں پُرسکون ہوگیا اور کھڑکی کے ساتھ لگ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔

تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ میری نظریں باہر گھومتی پھر رہی تھیں۔ اللہ کی کاریگری دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ٹرین رُک گئی۔ یہ شجاع آباد کا اسٹیشن تھا۔ ٹرین یہاں بمشکل پانچ منٹ رُکی ہوگی۔ چند مسافر سوار ہوئے اور ٹرین نے پھر سے رینگنا شروع کر دیا اور پھر لمحوں میں اپنی رفتار میں آگئی۔

کھیت کھلیان، درخت، کوٹھیاں، سڑکیں پیچھے چھوڑتی ٹرین منزل کی طرف دوڑ جا رہی تھی اور میں اِن نظاروں میں گم تھا کہ میری سماعت سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔

”ایکسوزمی!“

میں قدرتی حسین نظاروں کی دُنیا سے باہر آیا اور نظریں مخاطب کرنے والی آواز کی طرف اُٹھ گئیں۔ سامنے خوبصورت چنچل سی مہ جبیں جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال رہی ہوگی کھڑی مجھے تکے جا رہی تھی۔ میری نظریں اُس حسین مکھڑے کا طواف کر رہی تھیں۔ رب تعالیٰ نے کیسا شاہکار بنایا تھا۔ چٹا گورا رنگ، سنہری زُلفیں، سڈول جسامت، آنکھیں جھیل سی اور لبوں پر مسکراہٹوں کے پھول کھل رہے تھے۔ میں اُسے دیکھ کر بنانے والے کے گن گانے لگا۔

مہ جبیں نے دُوبارہ لب ہلائے۔ ”ایکسوزمی!“

”جی فرمایئے۔“

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔؟“

جس سیٹ پر میں نے بیگ رکھا ہوا تھا اُس نے اُس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔جی۔“ میں نے یہ کہتے ہی اپنا بیگ اُٹھالیا اور وہ وہاں بیٹھ گئی۔

”کیا یہ سیٹ آپ کی ہے؟“ میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”نہیں لیٹ ہونے کی وجہ سے میں اپنے ڈبے میں سوار نہ ہوسکی اور بمشکل گرتے پڑتے اس ڈبے میں سوار ہوگئی۔ ٹکٹ آفیسر سے بات کی تو اُنہوں نے یہاں بیٹھ جانے کو کہا۔ اگلے اسٹیشن پر ٹرین رُکے گی تو اپنی متعلقہ ڈبے میں چلی جاؤں گی۔ تھوڑی دیر برداشت کر سکتے ہو۔“

وہ بے باکی سے محوِ گفتگو تھی۔

”اوکے۔“

”ویسے تمھارے اندر لڈو تو پھوٹ رہے ہوں گے کہ ایک حسین لڑکی تمھارے سامنے بیٹھی ہے۔“ وہ بے باکی سے بول رہی تھی اور مجھے اُس کا یہ انداز بہت بھلا لگا۔ اُس کی مسکراہٹ پر میں قربان ہوا جا رہا تھا۔ حیران تھا کہ دُنیا میں جسے دیکھو پریشانیوں، دُکھوں کا پرچار کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہ اِس حسینہ تو کسی اور دُنیا کی مخلوق لگتی ہے۔ جس کے چہرے پہ غم کی پرچھائی تک نہیں ہے۔ کوئی دُکھ ہے نہ کوئی غم۔

وہ سیٹ پر بیٹھتے ہی ڈائری میں گم ہوگئی۔ میں مسلسل اُسے گھور رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر سے باتوں کا سلسلہ شروع کرنا چاہا۔

”مونگ پھلی کھاؤ گی۔“ لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے میں نے کہا اور مونگ پھلی کا پیکٹ اُس کی طرف بڑھایا۔

بڑی ڈھیٹ حسینہ تھی۔ اُس نے بھی انکار نہیں کیا اور پورے کا پورا پیکٹ ہی ہڑپ کر گئی۔ میں نے بیگ سے دُوسرا پیکٹ نکالا اور پھر باتوں کا طویل سلسلہ چل نکلا۔

”آپ کی منزل کہاں ہے؟“

”میری منزل؟“ اُس نے جواباً سوال کیا۔ ”دُنیا میں تو بس سیر و تفریح کرنے آئی ہوں۔ میری اصل منزل تو کوئی اور ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔

اُس کا فلسفیانہ جواب مجھے پسند آیا۔

”میرے پوچھنے کا مطلب ہے کہ ابھی کہاں جا

رہی ہو۔؟'' میں نے پوچھا۔

''کر......ا......چی......کراچی۔'' اُس نے مونگ پھلی چباتے ہوئے جواب دیا۔

مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اُس کا مزاج میرے جیسا ہی تھا۔ ہنس مکھ، شوخ، نڈر، باتونی۔

''پھر تو محفل خوب جمے گی۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''خوش فہمی!''

اُس نے دھیمے سے زیرِ لب کہا۔

''آپ کہاں کے لئے محوِ سفر ہیں۔''

''میں بھی کراچی جا رہا ہوں۔''

''گڈ۔۔۔۔ویری گڈ۔۔''

''کوئی جاب واب ہے؟''

''نہیں۔۔۔۔جاب کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ اِسی سلسلے میں کراچی جا رہا ہوں۔ سُنا ہے وہاں بہت کام مل جاتا ہے۔'' میں نے تفصیلاً جواب دیا۔

''اوہ۔'' اُس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''آپ کراچی۔۔۔؟'' میں نے اُس کے کراچی جانے کی وضاحت مانگی۔۔

''میرا مستقل ٹھکانہ کراچی ہے۔ یہاں شجاع آباد میں خالہ کے ہاں آئی تھی۔ ایک ہی خالہ رہ گئی ہے۔ بیچاری بیمار رہتی ہے۔ کئی بار کہا کہ میرے ساتھ چلو، میں علاج کراؤں گی۔ مگر مانتی نہیں۔ کبھی کبھی رشتوں کو بھی اہمیت دینی چاہیے۔ ساری عمر بزنس بزنس کی گردان اچھی نہیں ہوتی۔'' اُس نے ٹرین کی چھت کی طرف گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''میں کاروباری مخلوق ہوں۔ آفس میں سر کھپاتے کھپاتے عرصہ ہو گیا ہے۔ مما پاپا، چند سال پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں جان بحق ہو گئے اور مجھے تنہا کر گئے۔ پاپا کا وسیع بزنس تھا۔ میں اکلوتی اولاد ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی آزمائش تھی یا کوئی اور وجہ کہ میرا کوئی بھائی دُنیا میں وارد نہ ہو سکا۔ پاپا نے مجھے بہت پیار دیا۔ میں اکثر اوقات اُن کے ساتھ آفس جاتی۔ مختلف دوروں پہ ساتھ ہوتی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ کاروباری گُر بھی سیکھنے لگی۔ اب میں نے ایم اے کر لیا ہے اور مما پاپا کے گزرنے کے بعد کاروبار سنبھالے ہوئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ کرم ہے۔ خوشحال زندگی گزر رہی ہے۔

پاپا میری شادی برادری سے باہر کرنا چاہتے تھے یہاں تک کہ پاپا کو اور مجھے میرے مزاج کا، ذہن کا سرتاج نہ مل سکا۔ کئی بادل منڈلائے بھی تو اُن میں ہوس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

چار دن کی زندگانی ہے ہنس کر گزارنی چاہیے۔ بس یہی وجہ ہے کہ جب کاروباری ذہن سے تھک جاتی ہوں تو پارکوں میں، دیہات بستیوں میں گھومنے کے لئے نکل جاتی ہوں۔ بس یہی اپنی زندگی ہے۔ تم سناؤ۔۔؟''

اُس نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ابھی تک اُس نے نام تک نہ پوچھا تھا بس پہلے آپ اور اب تم پہ آ گئی تھی۔ نام تو میں نے بھی پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میرے تو دِل میں جلترنگ بجنے لگے تھے۔ باتیں کرتی اور مسکراتی ہوئی وہ مجھے بہت پیاری لگنے لگی۔

''میں غریب اِنسان کا غریب بیٹا ہوں۔ غربت مجھے وراثت میں ملی ہے۔ اِک ماں ہے جو چارپائی پہ پڑی کھانستی رہتی ہے۔ میں ذریعہ معاش کے لئے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ ابو عرصہ ہوا فوت ہو گئے ہیں۔ ہم دو بہن بھائی ہیں۔ بہن کو امی کے پاس چھوڑ کر اپنے شہر سے مایوس ہو کر کراچی کمانے جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ دو زندگیاں جڑی ہیں۔ خود اور اُن کو زندہ رکھنے کے لئے جتن کر رہا ہوں۔ یہی اپنی زندگانی ہے۔ ابھی بہن کی شادی بھی کرنی ہے اور اپنا۔۔۔۔اپنا ''اللہ'' مالک ہے۔''

میں نے آخری جملے پر زور دے کر کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

جونہی میں خاموش ہوا۔۔۔۔وہ مسکرا دی۔۔۔۔

''میری غربت پہ ہنس رہی ہو۔'' میں نے ناگواری میں پوچھا۔

''ارے۔۔۔ارے۔۔۔نہیں۔ میں تو تم پہ

ہنس رہی ہوں کہ مرد ہو کر حالات سے لڑنے کی بجائے حوصلہ چھوڑے بیٹھا ہے۔ارے۔۔نادان۔۔جوان ہو۔پڑھے لکھے ہو۔۔پھر مایوسی ،اُداسی کیوں۔۔۔؟''

ابھی باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ٹرین نے رُکنے کا عندیہ دے دیا۔یونہی گاڑی اسٹیشن پر رُکی۔میں نیچے جانے کے لئے اُٹھا اور اُس حسینہ سے عرض کی کہ یہی رُکنا میں کھانے کے لئے کچھ لے آتا ہوں۔گاڑی میں چائے ،گرم انڈے اور جانے کیا کیا بیچنے والے آئے تو تھے مگر میں نے کچھ نہیں لیا تھا۔مونگ پھلی اور نمکو سے گزارہ کیا تھا۔سادہ پانی کی بوتل ویسی ہی پڑی تھی۔سردیوں میں پیاس کم ہی لگتی ہے ناں۔

''آپ رُکو۔''اُس نے مجھے جانے سے روک دیا۔''میں جاتی ہوں۔پتا ہے آج کل لڑکیوں کی زیادہ چلتی ہے اور میں خوبصورت وحسین بھی ہوں۔''اُس نے کن اکھیوں سے مجھے دیکھا اور مسکرانے لگی۔بڑی منہ پھٹ لڑکی تھی۔

اُس نے وہی کر بھی دیکھایا۔وہ نیچے اُتر گئی اور میں کھڑکی سے باہر کا نظارہ دیکھنے لگا۔وہ مسکرا رہی تھی۔۔اُس کی آوارہ زلفیں اُن کو گھائل کر رہی تھیں۔

میں اندر بیٹھا یہ سین دیکھ رہا تھا اور مردوں کی عقل کو داد بھی دے رہا تھا۔اپنی عورتوں کے حقوق پورے نہیں کر پاتے اور غیر محرم عورتوں ،لڑکیوں کے گرد بھنورے کی طرح منڈلاتے پھرتے ہیں۔غیرت مندوں کی یہاں غیرت مرجاتی ہے اور شیطانیت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر میں جانے وہ کیا کچھ لے کر واپس سیٹ پر آگئی۔میری نظریں بھنی ہوئی مونگ پھلی کے پیکٹوں پر ٹک گئیں۔

''اتنے پیکٹ۔۔۔؟میں نے پوچھا۔

ہاں مجھے پتا ہے تم مونگ پھلی کے شوقین ہو اور راستے میں باتوں کے دوران کتنے پیکٹ ہڑپ کر گئے ہو۔۔۔یہ رکھ لو کام آئیں گے۔میری طرف ہے۔''

''آپ نے میری غربت کا مذاق اُڑایا ہے۔میں نہیں لوں گا۔''

''تم بھی کتنے پاگل ہو۔''

اُس نے میری ناراضگی کو بھانپتے ہوئے کہا۔''میں تمھاری غربت کا مذاق نہیں اُڑا رہی۔ایک دوست ہونے کے ناتے لائی ہوں۔اور میں نے بھی تو کئی پیکٹ ہڑپ کیے ہیں۔۔۔اور نیچے میں اِس لئے اُتر گئی تھی کہ تمھیں دکھاؤں کہ ہمارے معاشرے میں کیا کیا ہو رہا ہے۔''

اُس کی اک اک ادا پر پیار آتا تھا۔۔۔

☆☆☆☆

ٹرین چل پڑی لیکن ہمارا ساتھ نہیں چھوٹا تھا۔کئی اسٹیشن آئے لیکن اُس نے اپنے ڈبے میں جانے کی بات تک نہیں کی۔۔۔میں بھی اُس کا ساتھ چاہتا تھا۔پھر بھی میں نے پوچھ لیا۔میری بابت پہ کہنے لگی۔

اتنا اچھا ہم سفر ملا ہو کس پاگل کا دل چاہے گا کہ وہ اُس کو چھوڑ دے۔لڑکی ہو کر کتنی دلیرانہ باتیں کرتی تھی۔ایسی باتیں تو مجھے کرنی چاہیے تھیں۔لیکن۔

میں مسکرا دیا۔کتنا خوش بخت سفر تھا اور کتنا حسین ہم سفر۔مجھے میری قدر کرنے والا مل گیا۔ٹرین میرے لئے قیمتی ہیرے سے کم نہیں تھی۔ہر کسی کو ایسی ٹرین اور ایسے ہم سفر نہیں ملا کرتے۔۔۔

☆☆☆☆

کراچی پہنچے تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کہاں جاتے ہو۔بھگوڑے۔میں اُس کے جملے سے حیران تو ہوا لیکن دوسرے لمحے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اپنی منزل کو ڈھونڈنے۔''

''ارے پاگل۔۔۔منزل خود چل کر تمھارے پاس آئی ہے اور تم منزل ڈھونڈنے نکل پڑے۔۔۔بیوقوف۔منزل تو تمھارے سامنے کھڑی ہے۔''

راستے بھر میں اُس نے کئی القاب سے نوازا تھا۔

''کیا میں بیوقوف ہوں جو اتنے لمبے سفر میں تم سے محو گفتگو رہی ۔میں نے پہلی نظر تمھیں اپنا ہم سفر مان لیا تھا۔

اِس کے ساتھ اُس نے اپنا سیل نکالا اور ڈرائیور کو فون کیا۔ چند منٹوں میں گاڑی اسٹیشن پر پہنچ گئی جیسے گاڑی اُس کے انتظار میں پہلے سے اسٹیشن پر موجود ہو۔ شاندار چمکتی گاڑی۔۔۔ میں تو اُس کے ڈرائیور کے مقابل بھی نہیں تھا۔۔۔ لیکن اُس نے مجھے پلکوں پر بیٹھالیا۔

کہتے ہیں ناں عورت کو کوئی نہیں پہچان سکا۔۔۔ اِس کے کئی روپ ہیں اور ہر روپ نرالا ہے۔

''اب تمھیں کہیں جاب ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا سب کچھ تمھارا ہے بس میں نے تمھیں اپنا سرتاج چُن لیا ہے۔۔۔ بولو۔۔۔ منظور ہے؟''

میری تو باچھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔۔۔ میں بھلا کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ منزل واقعی خود چل کر میرے پاس آئی تھی۔۔۔ میں منزل کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ یوں ہم میاں بیوی کے خوبصورت بندھن میں بندھ گئے۔

☆☆☆☆

ہنسی خوشی زندگی بسر ہونے لگی ۔اللہ تعالیٰ نے پہلے بیٹا اور پھر انیلا کی صورت میں رحمت عطا کر دی۔ میں مستقل کراچی کا ہو کر رہ گیا۔۔۔ بہن کی شادی ملتان میں کر دی تھی اور امی کو اپنے پاس لے آیا تھا۔ میری شادی کے تیسرے سال ایک دن اماں ہمیں چھوڑ کر حقیقی دیس چلی گئی ۔غم کی اِن گھڑیوں میں میری ہم سفر نے بہت ساتھ دیا۔۔۔ اُس کا سہارا نہ ہوتا تو میں کمزور پڑ گیا ہوتا۔۔۔ لیکن قدرت خداوندی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

میری بہن اپنے گھر میں خوش باش زندگی جی رہی ہے لیکن میری چنچل سی ہم سفر میرے ساتھ نہیں ہے۔ میری منزل کہیں کھو سی گئی ہے ۔آج اُس کی یادیں، اُس کی باتیں ہیں اور اُس کا کاروبار ہے جو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ انیلا ایف ۔اے کر رہی ہے اور بیٹا ایم ۔ایس ۔سی کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ چلا گیا ہے۔

آج اپنی بہن سے مل کر واپس کراچی جا رہا ہوں ۔وہی اسٹیشن آ گیا ہے۔ جہاں میری ہم سفر پہلی بار ملی تھی ۔ٹرین بھی وہی ہے۔ سیٹ بھی وہی ہے۔ کھڑکی بھی وہی ہے اور پٹری بھی وہی ہے ۔ویسی ہی ٹرین کی چھک چھک سنائی دے رہی ہے لیکن نہیں ہے تو میری ہم سفر، میری منزل، میری شریک حیات نہیں ہے۔۔۔ جس نے میری زندگی بنا دی ۔ مجھے کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھا کر محل کا مکین بنا دیا تھا۔۔۔

آج میرے پاس سب کچھ ہے لیکن میں آج بھی اپنا وہی حلیہ برقرار رکھے ہوئے ہوں ۔وہی کپڑے، وہی بیگ، وہی موزے، وہی مونگ پھلی کے خالی پیکٹ اور اُس کی ڈائری میرے پاس موجود ہے۔ جس سے اُس کی خوشبو آتی ہے اور میں اُس کی مہک سے سرشار رہتا ہوں۔ میں مہینے میں ایک بار کراچی سے ملتان اور ملتان سے کراچی سفر ضرور کرتا ہوں ۔وہی ٹرین ہوتی ہے جس میں میری نیک صفت بیوی ملی تھی ۔اِس اُمید پر اُسی ٹرین میں اُسی حلیے میں سفر کرتا ہوں کہ کہیں میری منزل مل جائے گی ۔ مجھے میری بیوی مل جائے گی۔

لیکن میں بھی کتنا پاگل ہوں ۔وہ تو وہاں جا بسی ہے جہاں سے واپس کوئی نہیں آیا۔ وہاں نیک لوگ جا سکتے ہیں ۔نیک اعمال کر کے ۔البتہ میں بھی وہاں جا سکتا ہوں لیکن مجھے اُس جیسا نیک بننا پڑے گا ۔نیک اعمال کرنے ہوں گے تبھی میں وہاں جا کر اپنی منزل سے مل سکتا ہوں۔ دعا کیجیے گا کہ یہ ملن جلد از جلد ہو۔۔۔ لیکن ایک سوچ میرے ذہن میں سوار رہتی ہے کہ کیا یہی ٹرین وہاں بھی ملے گی۔۔۔؟

ٹرین اپنی منزل پر پہنچ چکی ہے اور میں تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل پڑا ہوں۔

☆☆☆

نویں ٹرین بیتی

کورا کاغذ



ثمینہ فیاض

اُس شخص کا زندگی نامہ، جس نے محنت کی بھٹی میں عمر جلا دی، مگر ہاتھ پھر بھی کچھ نہ آیا

لاہور ائر پورٹ سے اتر کر وہ سیدھا کینٹ اسٹیشن لاہور آیا تھا تا کہ شیخوپورہ جا کر وہاں سے اپنے گاؤں کے لیے کوئی سواری لے کر گھر تک جا سکے۔ وہ اب لاہور سے شیخوپورہ جانے والی ٹرین میں بیٹھا وہ کمزور بوڑھا سا شخص جس کی کمر سالہا سال وزن ڈھونے کے باعث مڑ کر کھمبے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ چہرے پر وقت سے پہلے جھریوں نے جال بچھا دیا تھا۔ تو بال سب ہی وقت کی دھارا میں بہہ کر اپنا وجود کھو چکے تھے۔ سادہ گھسے ہوئے سفید شلوار قمیض (جو دھل دھل کر اب پیلاہٹ کے ساتھ ساتھ کئی داغوں کا شکار بھی ہو چکا تھا) میں ملبوس بیٹھا تھا۔

اس کا نام دلاور تھا۔ دلاور اپنے مستقبل کی فکر میں اپنے ماضی کی تلخ یادوں کو سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اپنے کمزور سے معمولی ریگزین کے دو بیگز میں چند جوڑے۔ پچاس ہزار روپے اور بچوں کے لیے کچھ چھوٹے موٹے تحفے لیے وہ منزل پر پہنچنے کا سوچ رہا تھا لیکن اس کی پریشانی یہ نہ تھی اسے اس خط نے پریشان کر رکھا تھا۔ جو پچھلے ماہ اسے ملا تھا اس کی بیوی کی جانب سے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے سینے پر منوں بوجھ آن پڑا تھا۔ پچیس سال بعد وہ مستقل اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ ویسے تو ہر ۶ سے ۸ سال بعد آ جاتا تھا مگر چند دنوں کے لیے۔ اس کی زندگی کے قیمتی پچیس سال جس میں اس نے دن رات محنت کی اپنی جان پر ظلم کرتے ہوئے اپنی ہر جسمانی، نفسیاتی، روحانی ہر طرح کی خواہش کو اتنی مضبوطی سے اپنے ارادے کی زنجیر سے باندھے رکھا کہ وہ دم توڑ گئی تھیں۔ اب وہ خود سے بھی لاتعلق تھا اگر زندہ تھا تو صرف اپنے بیوی بچوں کے لیے لیکن جب انسان ساری زندگی کسی اک انسان یا اس انسان سے منسوب چند انسانوں کے لیے وقف کر دے تو کبھی کبھی کچھ بے حس لوگ اس کی قدر کرنا چھوڑ دیتے ہیں شاید اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ اک ان پڑھ انسان تھا۔ گاؤں میں اس کے باپ کی اچھی خاصی زمین تھی۔ سارہ بچپن بہت موج مستی اور بے فکری سے گزرا تھا۔ دوستوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے کب وہ جوانی کی دہلیز پر آن کھڑا ہوا اسے خود بھی اندازہ نہ ہوا۔ اس کا باپ اب مزید کھیتی باڑی نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس کی جگہ اب دلاور کام کرنے لگا اپنے باپ کی طرح دلاور بھی بہت محنت سے کھیتوں میں ہل چلاتا ان میں پانی، کھاد اور



دواؤں کا خیال رکھتا یہی وجہ تھی کہ اس کی فصلیں باقی گاؤں والوں کی نسبت زیادہ لہلہاتی نظر آتیں۔ اناج بھی زیادہ ہوتا اور اسی حساب سے آمدنی بھی اچھی ہوتی۔ اماں نے جلد ہی اس کے لیے لڑکی دیکھی اور اس کی شادی کروادی۔ اس کی بیوی اک ایسے کسان کی بیٹی تھی جس کا کوئی بیٹا نہ تھا بوڑھا کب تک اور کتنا کام کرتا ٹھیک طرح دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے دن بدن فصلیں سوکھتی چلی گئیں اور نوبت فاقوں تک آگئی۔ جب وہ شادی ہو کر دلاور کے گھر آئی تو نہ صرف پیٹ بھر کھانے کو ملا بلکہ تن ڈھانپنے کو اچھا کپڑا اور پکی چھت بھی میسر آگئی۔ اس کے دل میں لالچ بڑھنے لگی تو دلاور نے اسے بھی کھیتوں پر اپنے ساتھ کام پر لگا لیا پھر وہ امید سے ہونے کے باعث اتنا کام نہیں کر سکتی تھی۔ پیسے کی ایسی ہوس اس پر سوار تھی کہ اپنے گاؤں کے چند لڑکوں کی حرص میں

اس نے دلاور کو ملک سے باہر بھیجنے کے لیے راضی کر لیا۔ دلاور اپنی ساری زمین بیچ کر کویت چلا گیا وہ کویت میں اک مزدور کے طور پر کام کرنے گیا تھا۔ اس کے جاننے والوں میں کئی لوگ اس طرح باہر گئے تھے جن کے بچے عیش سے زندگی گزار رہے تھے۔ سالہا سال دلاور ہر مہینے اچھی خاصی رقم بھیجتا رہا مگر اپنے پاس وہ کچھ نہ رکھتا تھا کہتا اس پردیس میں مجھے کچھ ہو گیا تو کون میرے پیسے میرے بچوں تک پہنچائے گا۔ وہ ہر چار چھ سال بعد پاکستان آتا تو بچے اسے اجنبیوں کی طرح ملتے۔ اسے اپنے مکان کو دیکھ کر خوشی ہوتی کہ اچھی محنت سے گھر بنا لیا تھا۔

تنکا تنکا جوڑ کر اس کے خوابوں کا جو آشیانہ بنا تھا۔ اس کی پہلی بنیاد تب ہلی جب بیٹے نے جوا کھیلنا شروع کر دیا تھا اور ماں کے سارے زیور وہ بیچ آیا تھا۔ دلاور کے ماں باپ اتنے سالوں

میں مر چکے تھے۔ بیوی ان پڑھ ہونے کے ساتھ ساتھ لالچی بھی تھی۔ جب شروع شروع میں بیٹا بچوں کے ساتھ چھوٹا جوا کھیلتا اور اکثر جیت جاتا تو وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ اس نے یہ بات دلاور سے چھپائی تھی پھر بیٹے کو پیسے کی ایسی لت لگی کہ ماں سے بھی چھپانے لگا۔ لاڈ پیار میں بگڑے اس لڑکے نے گھر سے چھوٹی موٹی چوریاں بھی کرنی شروع کر دیں تھیں۔ تب بھی دلاور کی بیوی نے اسے کچھ نہ بتایا وہ ہمیشہ ہی اسے بے خبر رکھتی۔ بیٹے کے ہر عیب پر پردہ ڈال کر مطمئن رہتی۔ ہر غلطی پر اسے بچہ کہہ کر معاف کر دیتی لیکن اسے معلوم ہی نہ ہوا کب وہ بچے سے بڑا ہو گیا اور وقت کے

ساتھ ساتھ اس کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی گئیں۔ پیسے کی فراوانی اور تعلیم کی کمی ویسے ہی انسان کو کسی جہالت اور گناہوں کی کھائی میں دھکیلنے کے لیے کافی ہوتی ہے اوپر سے باپ بھی سر پر نہ ہو تو بچوں کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے۔

دلاور کے اکلوتے بیٹے مظہر نے شراب جوا، زنا ہر طرح کے عیب اختیار کر لیے تھے۔ کئی کئی راتیں وہ گھر سے باہر رہتا۔ ماں بس ہر پل اس کے گھر آنے کی دعائیں کرتی رہتی جب کہ بہن بھی اس کھلی آزادی کے نتیجے میں آوارہ لڑکوں سے دوستیاں کر کے تفریح کا سامان سمجھتی۔ اپنی ذات کو بے وقعت کر کے چند تحفے لے کر یا پھر گھوم پھر کر کچھ کھا لینے کو بہت اچھی بات تصور کرتی اس کے خیال میں وہ کچھ غلط نہیں کر رہی تھی۔ اور ان ہی ساری حرکتوں کی وجہ سے وہ بھی پورے گاؤں میں بدنام ہو چکی تھی۔ دلاور ہر بات سے بے خبر کولہو کے بیل کی طرح کام کرتا رہا۔ جو کچھ کماتا پاکستان بھیج دیتا اپنے پاس صرف اتنے پیسے رکھتا جس سے وہ دو وقت کی روٹی کھا کر زندہ رہ سکے۔

چند دن پہلے دلاور کو اک خط ملا جس میں اس کی بیوی نے اپنی پریشانیوں کا ذکر کر کے پیسے مانگے تھے بیٹی کی شادی اور بیٹے کی نوکری دلانے کے لیے رشوت کی ضرورت پڑتی ہے یہ کہا گیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے کچھ پیسہ جمع کر سکا اور بھیج دیا۔ ادھر دلاور کے بیٹے نے اپنی عیاشیوں کو پورا کرنے کے لیے ماں اور بہن کو پریشان کر رکھا تھا روز روز کی مار سے تنگ آ کر بہن اور ماں پریشان ہو گئی تھیں اور پھر اس کی دھمکی کہ اگر پیسہ نہ ملا تو تم دونوں کو بیچ دوں گا۔ اس سے وہ اور زیادہ خوف زدہ تھیں اور اک دن اس نے ان دونوں کا سودا کر دیا۔ دلاور کو اس کی بیوی نے اب ساری حقیقت لکھوا کر بتائی تھی جب پانی سر سے گزر چکا تھا وہ سب کام چھوڑ کر پہلی فرصت میں پاکستان آیا تھا۔ لاہور ائرپورٹ سے نکل کر وہ سیدھا کینٹ اسٹیشن گیا ٹرین حسب معمول پھر لیٹ تھی۔ اک پلر سے ٹیک لگائے وہ سوچوں میں گم تھا اور کچھ دیر بعد وہ ٹرین کا مسافر تھا جہاں سے ٹرین کے ذریعے شیخوپورہ آیا تھا اس پورے راستے وہ اپنی پوری کہانی اک مسافر کو سناتا رہا تھا اجنبی مسافر اپنے شہر شیخوپورہ میں اتر کر بغیر کسی ہمدردی کے اسے تنہا چھوڑ گیا تھا اور اب پلیٹ فارم پر پہنچا تاکہ شیخوپورہ سے اندر اپنے گاؤں تک جا سکے۔ اس کے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے ساری زندگی جس پیسے کے لیے اس نے قربانیاں دی تھیں۔ اس پیسے نے اس کے پورے گھرانے کے لالچ اور حوس کی آگ سے جھلسا دیا تھا۔

پلیٹ فارم کی انتظارگاہ میں دیکھا مگر بہت رش تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے تھک چکا تھا۔ اس لیے اک سایہ دار جگہ دیکھ کر وہیں بیگ رکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ ٹرین سے اترنے کے بعد اس نے جب کوئی بس یا سائیکل رکشہ کرنے کا سوچا تو پیسے دیکھے مگر اب وہ غائب تھے اس لیے وہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اسے کوئی امید نظر نہیں آتی تھی کہ کیسے گھر تک جائے گا دو گھنٹے گزر چکے تھے مگر کوئی اتنے پیسے دینے کو تیار نہ تھا کہ وہ گاؤں تک جا سکے شیخوپورہ سے اگلی ٹرین لاہور جانے کے لیے تیار کھڑی تھی وہ جو پچاس ہزار لایا تھا وہ بھی اس سے چھن چکے تھے جانے کب اس کی لاہور سے شیخوپورہ آتے ہوئے آنکھ لگ گئی اور اب وہ پیسے بیگ میں نہیں تھے۔۔

جب اس کی نظر اس شناسا چہرے پر پڑی وہ دوڑ کر اس کے پاس آیا چاچا تم آ گئے۔

دلاور چاچا تم آگئے۔ تم نے بہت دیر کر دی سب ختم ہوگیا اور پھر اس کے ہی گاؤں کے سجاد نے بتایا کہ کل چاچی، کنول (دلاور کی بیٹی) اور مظہر تینوں کی تدفین کر چکے ہیں دلاور جیسے بیٹھتا چلا گیا وہ اک سکتے کے عالم میں سب سن رہا تھا۔ چاچا چاچی بہت پریشان تھی مظہر نے کنول کو اپنے جوئے میں ہار دیا تھا جس کی وجہ سے کل کچھ غنڈے اسے لے جانے لگے جس پر چاچی نے مزاحمت کی تو ان کو غنڈوں نے ایسا دھکا دیا کہ ان کا سر دیوار سے لگا اور پھٹ گیا وہ اسی وقت دم توڑ گئی۔ کنول چاچی کو یوں تڑپتا دیکھ کر بکھر گئی وہ جانتی تھی کہ اس کا محافظ خود اس کا دشمن بن گیا ہے اور ماں جس کی آس پر اب تک وہ لڑ رہی تھی اس کے مرنے کے بعد اب اس کے پاس اور کوئی حل نہ تھا اس کے پاس اپنی عزت بچانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں سے بچ کر کمرے میں بند ہو گئی۔ لیکن جب وہ لوگ دروازہ توڑنے لگے تو اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ اس سارے فساد میں کسی کے ہاتھ کچھ نہ آیا غنڈے پیچ تاب کھاتے مظہر کو مار رہے تھے کہ ہمیں اپنی رقم پوری چاہیے وہ ویسے ہی جسمانی طور پر کمزور سا تھا۔ شراب اور مختلف نشوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کی مار برداشت نہ کر سکا اور پٹتے پٹتے جانے کب وہ بھی مر گیا۔

سارے گاؤں میں کہرام مچا تھا۔ آپ کا گھر مظہر پہلے ہی جوئے میں ہار چکا تھا غنڈوں نے کاغذات دکھاتے ہوئے تینوں کی لاشیں اکٹھا گھر سے باہر پھینک دی تھیں سارے گاؤں والوں نے مل کر چندہ اکٹھا کیا اور ان کی تدفین کر دی۔ تم کو خط لکھا تھا لیکن پتا نہیں تم تک پہنچا بھی کہ نہیں۔''

دلاور کی حالت دیکھ کر سجاد کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ اسے کچھ نہیں معلوم تھا وہ اسے دلاسا دینے کے لیے اس کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ لاہور جانے والی ٹرین نے سگنل دے دیا وہ جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی اور اب آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی۔ سجاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چاچا کو اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر کیسے جائے؟ اس لیے اس نے رک جانے کا فیصلہ کیا وہ ابھی کوئی سائیکل رکشہ دیکھ رہا تھا کہ لوگوں کے شور سے پلٹ کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوئی ٹرین کے نیچے آگیا ہے سجاد نے پلٹ کر دیکھا چاچا غائب تھا۔ وہ اک دم گھبرا گیا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال آتے ہی اس نے ٹرین کی پٹریوں کی جانب بھاگ کر فاصلہ طے کیا خون سے لتھڑا جسم پڑا تھا۔ اس کے لباس کی دھجیوں سے سجاد کو اندازہ ہوا اس گھر کے اک فرد کی تدفین ابھی باقی تھی۔

☆☆......☆☆

میرے ہم سفر

چل اے میرے ہم سفر
دنیا کے شور سے کہیں دور
کسی اور گگن میں
جہاں کوئی اور نہ ہو
جہاں کوئی دکھ رنجش نہ ہو
جہاں کوئی پہرہ، بندش نہ ہو
جہاں دلوں کو مسلا نہ جائے
جہاں جذبوں کو کچلا نہ جائے
چل اے میرے ہم سفر
جہاں بھوک افلاس نہ ہو
جہاں انسانیت میں کوئی کلاس نہ ہو
جہاں امیر غریب نہ ہو
جہاں موت اتنی قریب نہ ہو
چل اے میرے ہم سفر
ستاروں سے آگے کسی اور فلک پر
جہاں دنیا کا کوئی ستم نہ ہو
جہاں جھوٹے وعدے اور قسم نہ ہو
جہاں تذلیل نہ ہو
چل اے میرے ہم سفر
دنیا کے شور سے دور
کسی اور گگن میں
جہاں کوئی اور نہ ہو

شاعر: علی رضا عمرانی۔ سجاول

دسویں ٹرین بیتی

کس نے کھیل کھیلا ہے؟



شمسہ قمر

ستائیس دسمبر کی ایک انہونی، جس نے اُس خاندان کو ریلوے اسٹیشن پر رات گزارنے پر مجبور کر دیا

مجھے آج بھی 27 دسمبر 2007ء کی سردیوں کا وہ دن یاد ہے۔ کراچی میں سردی اتنی زیادہ نہیں ہوتی لیکن پھر بھی ہم اسے سردی ہی کہتے ہیں۔ میرے میاں پائلٹ ہیں۔ میرے میاں جب رات میں ہم سب کے ساتھ بیٹھے تو انھوں نے بچوں سے کہا کہ بھئی میں ایک سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔

”کیسا سرپرائز؟“ میری بیٹی نے کہا۔

”بس صبح پتا چلے گا۔“ میاں جی نے سسپنس برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

میرے تین بچے ہیں بڑا شہروز جو اس وقت صرف 15 سال کا تھا۔ دوسرا بیٹا شاہ اس وقت 9 سال اور بیٹی 8 سال کی تھی۔ رات بچوں نے بے چینی میں کاٹی۔ صبح اسکول سے واپس آئے تو ان کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ گیراج میں بلیک کرولا کھڑی تھی۔ سب اندر آ کر بے قرار ہو کر باپ سے لپٹ گئے۔

”بابا آپ نے زبردست سرپرائز دیا ہے۔“ میاں جی اور میں بھی ان کو دیکھ کر بے حد خوش تھے۔

”بھئی میری پیکنگ کر دو۔ شام کو میری لندن کی فلائٹ ہے۔ یاد ہے ناں۔“

”جی میں نے کر دی ہے پہلے ہی۔“

4 روز کے لیے وہ لندن جا رہے تھے لیکن انھیں نہیں معلوم تھا کہ وہ ہمیں کن حالات کا سامنا کرنے کے لیے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

اگلی شام کو تقریباً تین بجے میں بچوں کے ساتھ شاپنگ کے لیے Forum شاپنگ مال پہنچی۔ بچے نئی گاڑی میں بیٹھ کر بہت ایکسائیٹڈ تھے۔ ہم نے جب شاپنگ کر لی تو میری بیٹی کہنے لگی کہ آئیں ماما کچھ کھائیں۔ چنانچہ ہم Forum میں واقع ایک ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ سب نے اپنا اپنا آرڈر دیا۔

”ماما آپ کچھ نہیں کھائیں گی۔“ میری بیٹی نے پوچھا۔

”نہیں میرا دل نہیں کر رہا، تم لوگ کھاؤ۔“

جب بچے کھا پی کے فارغ ہوئے تو ہم لوگ باہر نکل آئے۔ گاڑی کی طرف جاتے ہوئے میں نے کہا کہ اچھا ہوتا کہ میں Pina Colada پی لیتی۔ ابھی مجھے پیاس محسوس ہو رہی ہے۔“ میرا بڑا بیٹا جو میرا بہت خیال کرتا تھا کہنے لگا۔

”تو ایسا کون سا مسئلہ ہے، آپ چلیں اور چل کر پی لیں۔ ہم تو ابھی گاڑی میں بھی نہیں بیٹھے۔“

”نہیں رہنے دو۔“ میں نے کہا۔

”نہیں ماما! آپ کو پینا پڑے گا۔“ یہ کہہ کر وہ



واپس Forum کی طرف چلنے لگا۔ مجبوراً ہم سب اس کے پیچھے چلنے لگے لیکن ہمیں نہیں پتا تھا کہ ہماری اس طرح واپسی ہمارے لیے کس قدر اذیت ناک اور تکلیف دہ ثابت ہونے والی تھی۔ کاش میں نے یہ خواہش نہ ظاہر کی ہوتی لیکن......

کاش وہ لفظ ہے جو انسان کو بہت رُلاتا ہے اور تکلیف دیتا ہے۔ اور وہ یہ کاش کہہ کر ہمیشہ خود کو کوستا اور کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ واپس اسی ریسٹورنٹ میں جا کر میں نے Pina Colada کا آرڈر دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے نوٹس کیا کہ لوگوں کی نظریں ہماری طرف تھیں۔

"یہ لوگ ہماری Direction میں کیوں دیکھ رہے ہیں۔" میں نے بچوں سے کہا۔

"ہاں ماما ہم بھی یہی محسوس کر رہے ہیں۔ ویسے ہماری فیملی خوب صورت بھی تو بہت ہے۔ لوگ ہماری طرف ہمیشہ متوجہ ہو جاتے ہیں۔"

میرے بیٹے نے ہنس کر کہا۔ لیکن آج کچھ اور ہی بات تھی۔ پھر میں نے ذرا غور کیا تو پتا چلا کہ سب ہمارے پیچھے دیکھ رہے ہیں۔ ہم دراصل جہاں بیٹھے تھے ہمارے پیچھے دیوار پر ٹی وی تھا اس کی آواز بند ہوئی ہے اس لیے ہم متوجہ نہیں تھے اور اسکرین ہمارے پیچھے ہی تھی۔ میں نے لوگوں کی نظروں کے تعاقب میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو بہت بڑی اور دل دہلانے والی خبر چل رہی تھی۔

"بے نظیر بھٹو کو گولی لگ گئی تھی۔ پنڈی کے لیاقت باغ میں جلسہ کر کے جب وہ گاڑی میں بیٹھیں تو یہ واقعہ ہوا اور دھماکہ بھی ہوا۔" لوگ اسی لیے پریشانی کی حالت میں

آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے یہ ناقابلِ یقین خبر دیکھ رہے تھے۔ میں بھی پریشان ہوگئی۔ اتنی دیر میں لوگوں نے باہر کی طرف ایک طرح سے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی Forum کی لائٹس بھی بند ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ میں نے اپنا ڈرنک آدھا وہیں چھوڑا اور بچوں سے کہا کہ جلدی چلو ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔ لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ سب میرے لیے اتنا آسان ہرگز نہ ہوگا جتنا میں سمجھ رہی تھی۔

بچوں کو تقریباً بھگاتے ہوئے میں Forum سے باہر نکلی۔ یہاں تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ہر کوئی وحشت زدہ نظر آرہا تھا۔ گاڑیاں بھاگ رہی تھیں۔ ہم نے بھی اپنی گاڑی جو کہ پارکنگ نہ ملنے کی وجہ سے دور کھڑی تھی اس کی طرف تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے حالانکہ میں کافی مضبوط عورت ہوں۔ لیکن اس وقت میں بہت نروس اور پریشان تھی اور کسی بھی طرح جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ مجھے تین بچوں کی زندگی کی حفاظت کرنی تھی۔ شاید اس لیے میں پریشان ہوگئی تھی۔

''لائیں ماما میں چلاتا ہوں۔'' میرے بیٹے نے میری پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔ وہ بھی 2 سال سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ عمر اتنی نہیں تھی لیکن ماشاء اللہ لمبا چوڑا تھا اور پھر ہم اکثر اُسے گاڑی بھی چلانے دیتے تھے۔ ایک تو گاڑی نئی تھی۔ بغیر ایسے حالات میں میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے ڈرائیونگ سیٹ سونپ دی اور خود ساتھ بیٹھ گئی۔

جب ہم پنجاب چورنگی پہنچے تو وہاں منظر ہی دوسرا تھا۔ ساری گاڑیاں آپس میں گتھم گتھا نظر آرہی تھیں۔ سگنل بند تھا اور ٹریفک پولیس غائب، لوگ پریشانی میں بے ہنگم انداز میں اپنی گاڑیاں نکالنے کے چکر میں مزید ٹریفک جام کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ بیٹے نے جونہی لیفٹ سائیڈ پہ موڑ کاٹا تو گاڑی پھنس گئی۔ ہم ڈیفنس میں رہتے ہیں۔ کراچی کے رہنے والے سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کسی سگنل کی بات کر رہی ہوں۔ اب ہمیں رائٹ مڑنا تھا۔ جس کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اسی اثناء میں تھوڑی جگہ بنی تو میرے بیٹے نے گاڑی نکالنی چاہی۔ گاڑی تو نہ نکل سکی لیکن ساتھ فٹ پاتھ پر گاڑی کا ٹائر نجانے کس چیز کے ساتھ لگ کر پھٹ گیا۔ میرے حواس مختل ہوگئے۔ اتنی دیر میں سامنے سے نوجوانوں کا ایک بہت بڑا گروہ گاڑی کے سامنے آگیا۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کے راڈ اور لکڑی کے ڈنڈے تھے۔ ہماری گاڑی کے پاس آکر انھوں نے بونٹ پہ ڈنڈا مارتے ہوئے کہا۔

''اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند کر دو۔ ہماری لیڈر مر گئی ہے اور تم لوگ لائٹیں جلا رہے ہو۔''

محترمہ بے نظیر صاحبہ کی Death اب کنفرم ہوگئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میں نے شیشہ نیچے کرتے ہوئے ان کو ہاتھ جوڑتے ہوئے لجاجت سے کہا کہ ہم بند کر رہے ہیں، خدا کے لیے گاڑی کو ڈنڈے مت مارنا۔'' میں نے بیٹے سے کہا کہ فوراً ہیڈ لائٹس بند کر دے۔ اس دوران میں مسلسل آیۃ الکرسی کا ورد کر رہی تھی۔ اللہ نے ان کے دل میں رحم ڈالا اور وہ ایک سائیڈ پر ہوگئے لیکن وہ ڈیفنس والے راستے کی طرف تھے اور ہمارے پاس سیدھا جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہم سیدھے چلے گئے اس وقت کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا جو راستہ Gulf کی طرف جاتا ہے ہم نے اسی پر گاڑی ڈال دی اس راستے پر ٹائر جل رہے تھے۔ ذرا آگے پہنچے تو دیکھا کہ سڑک کی دونوں طرف نوجوان کھڑے آگ لگا رہے تھے درمیان میں تھوڑا راستہ ابھی بچا تھا۔ جہاں سے گاڑی گزر سکتی تھی۔ بی بی کی Death کو ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی جس کا فائدہ ہمیں مل رہا تھا ابھی مار اماری پوری طرح شروع نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی کا ٹائر پھٹنے کی وجہ سے اس کی رفتار بہت آہستہ تھی اور یہ خدا نے ہمارے حق میں اچھا کیا تھا۔ کس طرح......؟ میں آپ کو بتاتی ہوں۔

جب ہم ان لڑکوں کے پاس پہنچے تو وہ پتھر مار رہے تھے چونکہ ہماری اسپیڈ آہستہ تھی اس لیے ہم ان کے سامنے سے گزرے تو میں نے ایک دفعہ پھر ہاتھ جوڑ دیے اور پاس سے گزرتے ہوئے بلند آواز میں کہا کہ خدارا ہمیں نہیں مارو اور میں ہاتھ کے اشارے سے انھیں منع کر رہی تھی' ان تک میری آواز پہنچ گئی تھی اور وہ نجانے کیسے رک گئے۔ ورنہ اگر ہم اسپیڈ میں جا رہے ہوتے تو وہ لازماً پتھراؤ

کر کے ہمیں اور گاڑی کو نقصان پہنچاتے۔ اللہ نے ان کے دل میں رحم ڈال دیا اور انھوں نے ہمیں جانے دیا۔ اب ہمارے بائیں طرف Gulf جانے کا راستہ تھا۔ لیکن ادھر بھی جگہ جگہ ٹائر جل رہے تھے۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ بس جس طرف صاف راستہ مل رہا تھا اور محفوظ نظر آ رہا تھا۔ ہم اسی طرف گاڑی لے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے حواس بحال کر کے دیکھا تو ہم کینٹ اسٹیشن والے پل پہ چڑھ چکے تھے۔ بس ہم جا رہے تھے کسی نامعلوم منزل کی طرف۔ اچانک میرے بیٹے نے اسٹیشن کی طرف گاڑی موڑ دی۔

''ماما یہاں ٹرینز وغیرہ ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی سیکیورٹی ہو۔''

''ٹھیک ہے جو مناسب سمجھو کرو۔''

ان حالات میں مجھے اپنے 15 سال کے بیٹے میں بھی ایک مضبوط مرد نظر آ رہا تھا جس پر مجھے بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا۔ میرے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔ باقی دونوں بچے بہت چھوٹے تھے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق میں اپنے بیٹے پر بھروسہ کرنے پر مجبور تھی۔ میرے بیٹے نے گاڑی اسٹیشن کی طرف موڑنے کے بعد ایک لمبی سانس بھری۔ ہم گاڑی ایک طرف روک کر اندر پلیٹ فارم کی طرف گئے۔ ہمیں کبھی ٹرین میں سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ ہم ہمیشہ By Air ہی ٹریول کرتے تھے۔ میرا بیٹا ایک آدھ دفعہ اپنے دوستوں کے ساتھ ٹرین کا سفر کر چکا تھا۔

جب ہم اندر پہنچے تو کچھ لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے تھے وہ شاید ٹرین کے منتظر تھے۔ جو کہ فی الحال آتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم بہت پریشان تھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ہم واپس اندر آئے تو بکنگ کاؤنٹر بھی ویران تھا۔ جو لوگ آئے تھے' شاید وہ حالات سے ناواقف تھے۔ جنھیں گھر سے ہی حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ آئے ہی نہیں تھے۔ کچھ لوگ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ اب ہم بھی آ کر ان میں شامل ہو گئے تھے۔ میرے بیٹے نے کہا کہ چلیں ماما ہم Waiting Room میں چلتے ہیں۔''

ہم اندر گئے تو وہاں دو تین عورتیں شیر خوار بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔ مجھے کچھ ڈھارس ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ یہاں کس کا انتظار کر رہی ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہم لاہور سے آئے تھے اپنے رشتہ داروں کے پاس اور اب ہم آج رات کی نان اسٹاپ ٹرین سے واپس جا رہے ہیں۔''

''میں نے دل میں کہا کہ اب کیا ٹرین آئے گی کہاں جاؤ گے۔''

''اور آپ کے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے۔''

''ہیں لیکن وہ ان بچوں کے لیے دودھ لینے گئے ہیں۔''

ان حالات میں دودھ لے کر آنا ناممکن تھا جو کچھ ہم دیکھ کر آ رہے تھے۔ وہ ناقابل بیان تھا۔

اتنی دیر میں میرا بیٹا آیا اور کہنے لگا کہ ماما اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں چلتے ہیں۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ گئی تو کیا دیکھا کہ ٹی وی چل رہا تھا اور چیخ چیخ کر ملک کے حالات بتائے جا رہے تھے۔ جو کہ دل دہلانے کے لیے کافی تھے۔ اسٹیشن ماسٹر پریشان تھا۔ اس کے ساتھ اور بھی دو تین ملازمین تھے۔ جن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونک گئے۔

''بی بی آپ ان بچوں کے ساتھ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ آپ کو نہیں پتا کہ کیا ہو رہا ہے۔''

''جی تفصیل میں تو نہیں پتا لیکن ہم بھی آگ کے دریا سے گزر کر آئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے استفسار کیا۔

میں نے مختصراً اسے اپنی روئیداد سنائی۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا کہ آپ بہت خوش قسمت ہیں جو ابھی تک بخیر و عافیت یہاں کھڑی ہیں۔ پورے ملک میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔ ہزاروں گاڑیاں جلادی گئی ہیں۔ شرپسندوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر خاص طور پر ہمارے شہر میں اپنی پرانی دشمنیاں نکالی ہیں۔ ٹرالروں کو آگ لگادی گئی ہے۔ شاپنگ سینٹر بھی جلائے گئے ہیں۔ بسیں، ویگنیں، رکشہ، سب جلایا جا رہا ہے۔''

میں ٹی وی پر دیکھ رہی تھی ہر چینل ہولناک صورت حال بیان کر رہا تھا۔ بی بی کے جیالے دھاڑیں مار رہے تھے۔ جگہ جگہ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ کئی جوان لڑکیاں اٹھالی گئی تھیں۔ جاب، اسکول، کالج یونیورسٹی سے آتے ہوئے لڑکیوں کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ غرضیکہ گھروں میں کھڑی گاڑیوں کو بھی جلا دیا گیا تھا۔ ہر طرف وحشت

تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم کسی دشمن ملک میں بھٹک کر آگئے ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ہم گھر کس طرح جاسکیں گے۔ موبائل سروس بھی معطل تھی۔ ہم کسی سے بھی رابطہ نہیں کرسکتے تھے۔

اسٹیشن ماسٹر نے ہمیں تسلی دی اور کہا کہ آپ گھبرائیں مت اللہ سے دعا کریں۔ اللہ مدد فرمائے گا۔"

میں نے ان سے پوچھا کہ اب ہم کہاں جاکر بیٹھیں؟

تو اس نے کہا کہ آپ Waiting Room میں جاکر بیٹھیں۔ چنانچہ میں بچوں کے ساتھ باہر نکلی تو پلیٹ فارم سنسان پڑا تھا۔ جہاں ہروقت زندگی اپنے بھرپور انداز میں رواں دواں ہوتی ہے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی وہاں موت کا سناٹا رقص کررہا تھا اور ہر شے پر جیسے کسی نے سحر پڑھ کر پھونک کر اسے ساکت وجامد کردیا تھا۔ کوئی ٹرین نہ آرہی تھی اور نہ جارہی تھی اور نہ ہی ایسے کوئی آثار نظر آرہے تھے۔ بہت تھوڑے لوگ پورے اسٹیشن پر نظر آرہے تھے۔ بس ویرانی ہی ویرانی تھی۔ میں کانپتے ہوئے دل کے ساتھ یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ پورا پلیٹ فارم کسی قبرستان کا منظر پیش کررہا تھا۔ بوجھل قدموں کے ساتھ میں ویٹنگ روم میں آگئی۔ وہ عورتیں ابھی بھی وہاں موجود تھیں۔ ان کے مرد ناکام ہوکر واپس آگئے تھے اور ان کے بھوکے بچے بلک رہے تھے۔ وہ بے چارے تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کراچی میں ان کا اس طرح کے حالات سے سامنا ہوگا ورنہ شاید وہ بہت زیادہ خوراک کا بندوبست کرکے چلتے۔

سب سے زیادہ جلاؤ گھیراؤ اور خون ریزی کراچی میں ہوئی تھی اس شہر کے اندر موجود شرپسند عناصر ہمیشہ ہی کسی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں تاکہ وہ بھی اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرسکیں۔ خیر رات ہوگئی اور ہم سب خوف کے عالم میں بیٹھے تھے۔ وہ بہت طویل اور بوجھل رات تھی۔ میرا بیٹا تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں لگے ٹی وی پر خبریں دیکھنے جاتا اور آکر تازہ ترین صورت حال سے ہمیں آگاہ کرتا جو کہ خون جمادینے کے لیے کافی تھی۔ یہ کیسے لوگ تھے جو اپنے ہی گلستان کو اجاڑ رہے تھے۔ اپنے ہی لوگوں کو کاٹ رہے تھے۔ وہ کس کا غصہ کس پر اتار رہے تھے شاید ان کو خود بھی علم نہیں تھا۔ جس لیڈر کے وہ پرستار تھے کیا اس نے کبھی کہا تھا کہ اس طرح اپنے غم کا ماتم کرتے ہیں۔ بہرحال وہ رات قیامت کی تھی اور ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح بھی اداس اور ہولناک تھی ہمیں کچھ نہیں آرہی تھی کہ گھر کس طرح پہنچا جائے۔

صبح کے پانچ بجے اسٹیشن ماسٹر نے اپنے گھر میں کھڑی گاڑی منگوائی اور مجھے کہا کہ بہن آپ اکیلی ہیں بچوں کے ساتھ میں آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔ اس وقت شاید شرپسند تہلکہ مچا کر تھک ہار کر آرام کررہے ہوں گے۔ یہ موقع بہترین ہے۔"

مجھے خوف تو بہت آرہا تھا لیکن رسک تو لینا ہی تھا۔ میں آیات کا ورد کرتے ہوئے اپنے بچوں کو لے کے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی نے چلنا شروع کیا بس کیا بتاؤں ہر طرف جلے ہوئے ٹائر کہیں جلی ہوئی گاڑیاں، بسیں، موٹرسائیکلیں، رکشے، شاپنگ مال گاڑیوں کے شوروم غرض رات بھر صرف محض چند گھنٹوں میں جو چیز نظر آئی شرپسند عناصر نے خاکستر کرڈالی تھی۔ اسٹریٹس لائٹس تک کو نہ بخشا تھا۔ راستے بھر خوف کے عالم میں بغیر کسی رکاوٹ کے سفر کرلیا گیا اور بس خدا خدا کرکے اپنے گھر ڈیفنس پہنچے تو سکھ کا سانس لیا۔

میں نے فرشتہ صفت آدمی کا بہت شکریہ ادا کیا۔ ایسے لوگوں کے دم سے دنیا آباد ہے۔ گاڑی کو اللہ کے آسرے پہ چھوڑ دیا کہ قسمت میں ہوئی تو مل جائے گی۔ بس یقین کریں۔ پلیٹ فارم پہ گزاری ہوئی وہ رات جو خوف، وحشت واذیت کی رات تھی میں آج تک بھی نہیں بھلا پائی۔

ہر سال بے نظیر کی برسی کے موقع پر مجھے وہ رات یاد آجاتی ہے جو خدا کسی کی زندگی میں نہ لائے اور میں یہ سوچتی ہوں کہ بے نظیر کے موت کا ذمہ دار عوام تو نہ تھی، جس کے ساتھ جیالوں نے اس طرح کا بدلہ لیا کہ مکتی باہنی کی یاد تازہ ہوگئی۔ آخر کیوں ایسا کیا گیا۔ کس کی ایماء پر کیا گیا۔ کیا بی بی کو اس معصوم عوام نے مارا تھا جو ان کے لیے اپنی نسلوں تک کو قربان کردینے کا عزم رکھتی تھی۔ مجھے اس کا جواب تاحال نہ مل سکا، نہ مل سکے گا۔ اور سوچتے سوچتے دس برس گزر گئے۔ کیا آپ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہے؟؟

☆☆☆

شیر بادشاہ! شہر کی سڑکوں پر



پورے جنگل پر حکمرانی کرنے والا شیر......

دیکھا آپ نے کس طرح شہر کی سڑکوں پر گھوم رہا ہے......شاید جنگل کے بادشاہ کو بھی یہ جمہوری حکومت پسند نہیں آ رہی......میٹرو ریڈ اور اورنج بس سروس کو کھوجتا کہیں یہ 'بادشاہ' نئی والی گرین لائن' یا بزنس ٹرین میں نہ چڑھ جائے۔ 'بادشاہ' کو بھلا سڑک سے پٹڑی پر جانے سے کون روک سکتا ہے۔

کیا پتا 'بادشاہ سلامت!' پاناما لیکس کی انکوائری کے لیے ہی شہر میں آئے ہوں' اور......اور یہ بھی ممکن ہے کہ 'شیر بادشاہ' کو کوئی خو بو ملی ہو اور جناب کوئی دھرنا شرنا دینے کے لیے جگہ کا انتخاب کر رہے ہوں۔ قارئین آپ کا کیا خیال ہے؟

ناول

ایم اے راحت

زرد لومڑی

قسط:02

انتقام کی ایک نئی داستان، جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا۔

برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا معرکۃ الآرا سلسلہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ میری زندگی عام لوگوں سے تھوڑی سی مختلف تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ میں دو دشمنوں کے رومانس کا نتیجہ تھی۔ ہے نا مزے کی بات۔ دو دشمنوں کا رومانس۔ ایک فرانسیسی، دوسرا ویت نامی۔ لیکن ایسے ہی





واقعات کمزور انسان کی اصلیت کا ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے نا کہ ''عشق نہ پوچھے ذات'' وہ تو بس ہو جاتا ہے اور اس کے نتائج یکساں ہوتے ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔

فطری طور پر میں اپنا تجزیہ کرتے ہوئے یقین دلاتی ہوں کہ میں رومانس پسند ہوں۔ حسین چہرے۔ (مردوں کی بات کر رہی ہوں) مجھے لبھاتے ہیں۔ میں انھیں دیکھتی ہوں تنہائیوں میں ان کے بارے میں سوچتی ہوں۔ کبھی کبھی خوابوں میں ان کو محسوس کرتی ہوں۔ لیکن یہ جذبے خوابوں ہی میں سو جاتے ہیں۔ جاگتے لمحوں میں صرف اس طرح سوچتی ہوں کہ ''نا آسودہ خواہشیں ہی دلکش ہوتی ہیں'' اگر ان خواہشوں کی تکمیل ہو جائے تو اس کے بعد کیا ہوگا۔

بہک گئی میں، بہک گئی، بھٹک گئی۔ لیکن یہ بہکنا اور بھٹکنا ہی میرے ایک عام انسان ہونے کی دلیل ہے۔ کام کتنا ہی مشکل یا بڑا کر لیا جائے۔ انسان، انسان ہی رہتا ہے۔ بہت سے جذبوں میں کمزور، چاہے وہ خود سے کتنا ہی فرار حاصل کر لے۔

میرے والد مسٹر سارترے اور چچا ہی کہوں گی۔ مسٹر وانچی نے مجھے ایک سپر گرل بنا کر بہت بڑے کام کے لیے بھیج دیا تھا۔ اور اس کام میں مجھے جتنا مزہ آ رہا تھا، بتا نہیں سکتی۔ یوں سمجھیں کہ میرا رواں رواں متاثر تھا، میں خود کو پورا گروپ سمجھ کر کام کر رہی تھی۔ یعنی عقل بھی عمل بھی۔ اور اب تک میں نے جو کچھ کیا تھا۔ اس نے بہتوں کو لرزا دیا تھا۔ اور اپنی پارک کو خلائی ''مخلوق'' سمجھا جا رہا تھا۔

ہمارے کچھ انسانی افکار بھی تھے۔ اور ایک بڑا عمل ہم ان کے لیے کر رہے تھے۔ جیسے انسانی اعضا کی بڑے پیمانے پر تیاری اور انھیں نادار لوگوں کو مفت فراہم کرنا۔ یہ کام بھی مناسب رفتار سے ہو رہا تھا یعنی ''سوچی آرگنیو'' رفتہ رفتہ دنیا کے بے شمار ممالک میں پھیلتا جا رہا تھا اور اس کے لیے جو فنڈنگ ضروری تھی اس کے حصول کا ایک ذریعہ میں بھی تھی۔ یعنی دنیا کے وہ بڑے ممالک جو آپس کی سیاسی سازشوں کے شکار تھے۔ ہمارے ذریعہ مناسب معاوضے پر اپنی مشکل کا حل پا سکتے تھے۔ اس طرح سچی بات ہے کہ میں خود کو ماضی کی ''ماتا ہری'' کا مقام دیتی تھی۔

دیکھا آپ نے۔ ہوں نا انسان...... فطری کمزوریوں کا شکار۔

خیر بات ہو رہی تھی اس وقت کی جب میں جیف ہاؤس میں ایشل کے ساتھ موجود تھی اور مسٹر میک مین نے مجھے کورڈیل کلب پر چھاپے اور اس کے مالک کی خودکشی کے بارے میں بتایا تھا۔ مسٹر میک مین سے تھوڑی دیر بات ہوئی۔ میں نے کسی سرگرمی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن کچھ مرحلے ایسے تھے جن کے بارے میں جاننا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے پاپا کو یعنی مسٹر ''کمپارٹو'' کو فون کیا۔ مسٹر سارترے نے ایسے انتظامات کیے تھے کہ ہم باآسانی ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے تھے۔ وہ میری آواز سن کر بہت خوش ہوئے۔

''تارتیلا۔'' انھوں نے مستی میں کہا۔ کچھ عرصہ سے انھوں نے خوشی کے عالم میں مجھے کارتا تیلا کہنا شروع کر دیا تھا۔

''میں مسٹر کمپارٹو'' میں نے جواب دیا۔

''جو ہو رہا ہے کیا مسٹر کمپارٹو اس سے بے خبر ہیں؟''

''اچھا سوال کر دیا تم نے۔''

''وہ کس طرح؟''

''ہمارے اس آرگنائزیشن کے تین مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں، میں، تم اور وانچی۔ بے شک باقی کارکن دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن وہ صرف کل پرزے ہیں۔ ہم تینوں کے شعبے الگ الگ ہیں ان کی تفصیل پر اس وقت گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا کہ ہمیں اپنے اپنے شعبوں پر مکمل اختیار ہے۔ صورت حال پر ایک بار بحث ضروری ہے کہ اس کے بعد ہر شعبے کو اپنے اپنے معاملات خود سنبھالنا ہوں

گے۔ چنانچہ اپنے ہر عمل کا اختیار تمہیں حاصل ہے۔''

''میں اس اغوا شدہ آبدوز کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہمارے بین الاقوامی مددگار ہمیں اس کے بارے میں تفصیلات فراہم کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ شمال کی جانب بڑھ رہی ہے اور حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا اصل رخ کس طرف ہے۔''

''کیا ٹریک ٹو کی طرف؟'' میں نے سوال کیا۔

''امکان اس بات کا ہے۔'' مسٹر کمپارٹو نے کہا۔

یہ ٹریک اصل میں ہم نے خود بتائے تھے۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری طرح کوئی اور ہیکر ہمیں ہیک کر کے ہماری معلومات سے فائدہ نہ اٹھالے۔ دنیا بھر میں کمپیوٹروں کو اب ہر طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے ممالک کو ٹریک ون، ٹو، تھری وغیرہ کے نام سے منسوب کر لیا گیا تھا اور تینوں ڈائریکٹر یہ نام یاد رکھتے تھے۔

''یہ تو تشویشناک بات ہے سر۔'' میں نے کہا۔

''سو فیصدی۔ بے حد تشویش ناک۔ کیونکہ جدید ترین آلات اس کا صحیح سراغ نہیں لگا پا رہے ہیں ویسے ڈارلنگ تم کیا کر رہی ہو؟''

اٹھا پٹخ۔ مار دھاڑ، قتل و غارت گری، اور کچھ نہیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''ممکن ہے تمہاری یہ کاوشیں آبدوز کی چوری سے منسلک ہو جائیں۔ اس سلسلے میں اعلیٰ پیانے پر کام کیا جا رہا ہے اور وقت آنے پر تمہارا نام بھی آبدوز تلاش کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا۔

''آبدوز کی چوری کے سلسلے میں اب تک کوئی ہنگامہ سامنے نہیں آیا۔ وجہ یہ ہے کہ میڈیا کو اس بارے میں کوئی بھنک نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ ایسے انتظامات کئے گئے ہیں کہ اگر کہیں سے میڈیا کو اس کا علم بھی ہو جائے تو اسی جگہ اس کی گردن دبا دی جائے۔''

''اوہ۔ نو۔ اور کچھ۔''

''محتاط رہو۔ اور اپنا خیال رکھو۔ آخر میں ایک باپ کی آواز سنائی دی اور میں نے مسکرا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

لیکن مسٹر کمپارٹو سے ہونے والی گفتگو تشویشناک بھی تھی اور فکر انگیز بھی۔ جیسا کہ ابھی ابھی بات ہوئی تھی کہ ہم تینوں کو کسی بھی کام کے لئے اپنے طور پر عمل کرنے کی اجازت ہے کہ میں نے اس بارے میں بھی سوچا۔ پھر میں نے برطانوی سیکرٹ سروس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے نمبر سے مردانہ پر آواز سنائی دی۔

''کون۔''

''میرا نام اینی پارک ہے اور......''

''اوہ میڈم۔ میں آپ کی آواز پہچانتا ہوں۔ میرا نام فرینک اوبرائے ہے اور میں اسپیشل برانچ سکریٹری ہوں۔'' شاید آپ کو حیرت ہو کہ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ہدایت ملی ہے کہ ہر ممکن طریقے سے آپ کو تلاش کر کے آپ سے رابطہ کروں۔''

''خیریت مسٹر فرینک۔''

''ہاں۔ بالکل خیریت ہے۔ یہ ہدایت اس لیے ملی ہے کہ آپ کو کوئی مشکل نہ پیش آجائے۔''

''اوہ۔ شکریہ یہ وجہ گورڈیل کلب پر چھاپے کی کوئی خاص رپورٹ ہے؟''

''بظاہر نہیں۔ لیکن کچھ خفیہ کاغذات ملے ہیں جن کی چھان بین کی جا رہی ہے۔ البتہ یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ انھوں نے امریکا، جرمنی، آسٹریا اور فرانس میں بھی خفیہ کلب قائم کر رکھے ہیں۔ جو گورڈیل کی سربراہی میں ہیں۔ یہ سب بڑی بڑی رقمیں مہیا کرتے ہیں۔ اور ان کے ذرائع قانونی نہیں ہیں۔''

''ان کلبوں کو صرف ایک آرگنائزیشن چلاتی ہے یا ان کے مالک الگ الگ ہیں۔''

''ان کا تعلق ایک خفیہ کمپنی سے ہے۔''

''کمپنی؟ فلیش گورڈن۔''

''ہاں۔ کمپنی۔ اس کا اکاؤنٹ سوئٹزرلینڈ میں ہے۔''

''گڈ۔ اچھی رپورٹ ہے۔''

''ویسے میڈم ایشلنا رمن آپ کے پاس ہیں؟'' فرینک نے پوچھا۔

''ہاں۔ کیوں؟''

''اس کی حفاظت ضروری ہے۔ وہ سخت خطرے میں ہے۔''

''او کے۔ اس کی فکر مت کرو، اگر اس سے کوئی خاص بات معلوم ہوئی تو میں تمھیں فون کر کے ضرور بتاؤں گی۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

ایشل بہت عجیب تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر ایک طرح کی آزاری لگی ہو۔ مجھے اس کا یہ انداز بڑا انوکھا لگا تھا۔ اس نے کچن میں اپنے ہاتھ سے بہترین کھانا تیار کیا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا تھا۔

''معاف کرنا ایشل۔ اتنے بڑے گھرانے کی لڑکیاں تو انڈا تلنا بھی نہیں جانتیں۔ مگر تم نے بہترین کھانا پکایا ہے۔''

''بس مجھے آتا ہے۔''

''کمال ہے۔ ویسے اپنے شوہر سے تمہاری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی۔''

''ہوائی میں۔ مسٹر گرے بین نے ایک عالیشان پارٹی دی تھی۔ اس میں ہم دونوں شریک تھے۔ گرے بین۔ ہوائی۔ میں نے اپنے ذہن کی خفیہ یادداشت کے خانوں میں یہ نام تلاش کیا لیکن اسے یاد نہیں آیا۔

''یہ شخص کیا کرتا ہے۔''

''اب شاید کچھ نہ کرتا ہو۔'' ایشل نے مسکرا کر کہا۔

''کیا مطلب؟ کیوں؟''

''کیونکہ وہ مر چکا ہے۔''

''ہوائی سے تمہارا کیا تعلق ہے۔''

''کیونکہ میں وہیں رہتی تھی۔''

''اوہ...... اور تمہارا شوہر یہاں لندن میں۔''

''ہاں۔''

''پھر تم دونوں کیسے ملے تھے؟''

''کوئی مشکل نہیں تھی۔ کہیں بھی۔ یہاں لندن میں بھی'' اس نے جواب دیا اور میں خاموش ہو گئی۔ مسٹر سارترے نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا کر رہی ہوں۔ اور میں انھیں کوئی مؤثر جواب نہیں دے پائی تھی۔ یہ کچھ بہتر تو نہیں تھا۔ آلات کے بارے میں بھی یہ خیال رکھتے تھے کہ شاید میں اس سلسلے میں بھی کچھ کر سکوں۔ کیا میں ایسا کر سکتی ہوں۔ اور مجھے احساس ہوا کہ میں اس معیار پر کام نہیں کر رہی۔ آخر کیوں؟

اس رات میں نے اپنا حساب لیا۔ تو مجھے خصوصی طور پر ایک بات کا احساس ہوا۔ یہاں لندن میں آ کر میں ہر شعبے کے لوگوں سے کھل مل گئی ہوں۔ میرا کوئی عمل خفیہ نہیں ہے۔ کب کہاں ہوں سب جانتے ہیں۔ کون جانے ان

میں کون میرے ہر عمل کو ناکام بنانے میں مصروف ہوں جبکہ مجھے معلوم تھا کہ گورڈیل میں اعلیٰ پائے کے لوگ شامل ہیں اور کون اپنے مفاد کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ یہ کون جانتا۔

تو پھر؟ میں نے کچھ فاصلے پر گہری نیند سوتی ہوئی ایشل کو دیکھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اچانک مجھے مشکوک لگی اور میں بے چین ہوگئی۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے تحت میں اپنی جگہ سے اٹھی اور چند خاص چیزیں لے کر باہر نکل آئی۔ ایشل کو میں نے اسی طرح سوتا چھوڑ دیا تھا۔ پُر احتیاط قدم اٹھاتی میں جیف ہاؤس کے گیٹ کے باہر نکل آئی۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ باہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن ابھی میں چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ میں نے کسی کار کی روشنیاں دیکھیں جو جیف ہاؤس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میرے قدم رک گئے۔ اس وقت یہ کار؟ میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ سیاہ رنگ کی کار تین افراد سیاہ سوٹ میں ملبوس نیچے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی رائفلیں دبی ہوئی تھیں اور وہ بڑے محتاط انداز میں جیف ہاؤس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میرے ہونٹ خشک ہو گئے۔ شک کی گنجائش نہیں تھی وہ جو بھی تھے۔ میرے لیے آئے تھے اور خوش بختی سے میں نے اچانک ہی جیف ہاؤس چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیا ہی عمدہ اور بروقت فیصلہ تھا۔ اور ایشل کسی کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے کہ کون جانے ان کی آمد کا ذریعہ ایشل ہی ہو۔ یا پھر۔

اچانک مجھے اندر سے ایشل کی دردناک چیخیں سنائی دیں اور میں ایک لمحے کے لیے بدحواس ہوگئی۔ شاید انھوں نے ایشل کو قتل کر دیا۔ ایک بے اختیار جذبے کے تحت میں درخت کی آڑ سے باہر نکل آئی۔ حماقت انسان سے ہو ہی جاتی ہے۔ اس کار کو میں نے نظر انداز کر دیا تھا اور یہ سوچ لیا تھا کہ کار میں صرف وہی تینوں تھے جو اندر چلے گئے۔ جبکہ کار میں چوتھا آدمی بھی تھا جو خاموشی سے نیچے اترا اور میرے سر کے پچھلے حصے میں سورج اتر آیا۔ تین طاقت ور ضربیں پڑی تھیں اور میری عاقبت روشن ہوگئی تھی۔

اس کے بعد ہوش آیا تو خود کو ایک بڑے کمرے میں پایا۔ لیکن کمرہ نہیں قید خانہ تھا۔ جدید ساخت کا بہترین قید خانہ اور اس قید خانے میں، میں ایک ہسپتالوں والے بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ میرا بدن پھوڑے کی طرح رکھ رہا تھا اور سر کا تو حال ہی نہ پوچھو۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے دوبارہ میری گردن پر رکھا گیا ہے۔

مجھے یوں لگا جیسے اس کمرے کے علاوہ برابر میں دوسرا کمرا بھی ہے۔ درمیان میں ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ کھڑکی کے دوسرے طرف ہونے والی کھراہٹ نے ہی مجھے احساس دلایا تھا کہ ادھر بھی کوئی ہے۔ خیر خود کو سنبھالا پلنگ سے اٹھی۔ کھڑکی کے قریب پہنچی اسے کھولنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوگئی۔ کھڑکی میں اسٹیل سے بنا مضبوط جال تھا جسے ہلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ لیکن دوسری طرف آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ اور دوسری طرف مجھے ایک شخص نظر آیا جو اچھی شخصیت کا مالک تھا لیکن اس وقت اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ کپڑے بھی خون آلود تھے۔ غالباً اس پر تشدد کیا گیا تھا۔

کھڑکی کھلنے کی آواز پر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا اور تھکے تھکے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا پھر آہستہ آہستہ چلتا کھڑکی کے پاس آگیا۔

''میں ایک بار کھڑکی کھول کر آپ کو دیکھ چکا ہوں مس اینی پارک۔''

''آپ کون ہیں اور مجھے کیسے جانتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''اوہ۔ میری آپ سے فون پر بات ہو چکی ہے۔ میں فرینک اوبرائے ہوں۔ اسپیشل برانچ سیکریٹری۔''

''اوہ مسٹر فرینک۔'' میں نے پر افسوس لہجے میں کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔''

''آپ بہت زخمی ہیں۔'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''ہاں۔انھوں نے میری دوانگلیاں کاٹ دی ہیں۔اس نے اپنا ہاتھ سامنے کیا تو میرے منہ سے سی کی آواز نکل گئی۔اس کے ہاتھ کی دوانگلیاں غائب تھیں اوران کی بینڈ یج بھی نہیں کی گئی تھی۔

''ارے۔لیکن کیوں؟''میں نے افسوس سے پوچھا۔

''انھیں میری آپ سے گفتگو کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا۔وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں نے کورڈیل کلب کے بارے میں آپ کواور کیا بتایا ہے۔

''کیا آپ کواس کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم ہے۔''

''خاص بات۔اس نے ایک ہلکی سی کراہ سے کہا۔پھر بولا۔''میں جانتا ہوں میراانجام ٹھیک نہیں ہے وہ لوگ کسی طور بھی مجھ پر یقین نہیں کریں گے کیونکہ جیک برگنزا میرا بچپن کا دوست تھا۔''

جیک برگنزا۔ایک نیانام میرے علم میں آیا۔

''ہاں۔چیکوسلواکیہ کا باشندہ تھا۔لیکن امریکن اسپیشل فورس میں کرنل کے عہدے پر فائز تھا۔ویت نام کی جنگ کے بعداس نے فورس کو چھوڑ دیا۔دوسال پہلے اسے افریقہ میں اس بات پر موت کی سزا ہوئی تھی کہ اس نے ایک سوشلسٹ صدارتی امیدوار کو قتل کر دیا تھا۔سزائے موت سے ایک دن پہلے اس نے جیل توڑی اور فرار ہوگیا۔پھر اسے شمالی جاپان کے جزیرے نوشیرو میں دیکھا گیا۔لیکن کچھ عرصہ کے بعد غائب ہوگیا۔تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ ایک جعلی نام سے اور جعلی کاغذات کے ساتھ کورڈیل میں شامل ہے۔اور وہاں کوئی خفیہ کام کر رہا ہے۔بعد میں یہ خفیہ کام منظر پر آ گیا۔اس نے کچھ انتہائی خطرناک میزائل چوری کیے اور پھر انھیں خفیہ طور پر کئی ملکوں کی اہم تنصیبات کو نشانے پر لے کر نصب کر دیا اوران سے بڑی بڑی رقموں کا مطالبہ کیا۔اس نے اپنی بات کے ثبوت کے طور پر تین بار یہ میزائل داغ کر دکھائے۔اور نشانے پر آئے ملکوں نے اس کے مطالبات پورے کیے۔کیلنگسی ملک نے ایک مشترکہ فورس بنادی گئی کہ اسے تلاش کرو۔اور مس اینی پارک آپ جانتی ہیں کہ آپ بھی ایک مشکوک ہستی ہیں اور آپ نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔''

''مائی گاڈ۔تو تم پراس لیے تشدد ہوا ہے۔''

جی۔''اس نے گردن جھکالی۔

اچانک ہی باہر کچھ آوازیں سنائی دیں اور میں جلدی سے اس جگہ سے ہٹ گئی۔اور اپنے پلنگ پر آ کر لیٹ گئی کچھ ہی لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔اور وردی میں ملبوس دوگارڈ اسٹین گنوں سے مسلح اندر داخل ہوگئے انھوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔اور میں تیار ہوکران کے ساتھ چل پڑی۔

جس کمرے میں وہ مجھے لائے وہ کافی کشادہ تھا۔اس میں شاندار فرنیچر پڑا ہوا تھا۔مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ باہر چلے گئے۔کچھ ہی منٹ کے بعد ایک شاندار شخصیت کی مالک دراز قامت عورت اندر داخل ہوگئی۔چہرے مہرے سے وہ بے حد شاطر نظر آ رہی تھی۔مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

''ہیلو اینی پارک۔''

''ہیلومیم۔''میں نے بھی بے باکی سے کہا۔

''خوب صورت ہو۔بہت خوب صورت ہو۔یقیناً تم نے بوائے فرینڈز کی ایک فوج بنائی ہوگی۔''اس نے کہا اور مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئی۔میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے الفاظ سے اس کی شخصیت کا ایک پہلو نمایاں ہوگیا۔وہ عیاش طبع اور اوباش فطرت تھی۔اور یہ بات اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''میرا نام سلوااسٹارک ہے،میں کورڈیل کی وائس چیئر پرسن ہوں۔مسٹر گولڈن کورس اس کے چیئر مین ہیں۔''

''بہت بڑے لوگ ہیں آپ۔''میں نے کہا۔

''کورڈیل انٹرنیشنل ہے۔ ہم نے ایک نئی جہت کی بنیاد ڈالی ہے جسے قومیں اور ملک ابھی سمجھ نہیں سکے ہیں تو ہمیں جو مقام ملے گا اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تم اگر کہو تو میں تمھیں اس کے بارے میں مختصراً بتاؤں۔''

''ضرور۔'' میں نے دلچسپی سے کہا۔

''کورڈیل میں مختلف ملکوں کے نمائندے شامل ہیں۔ ان کے پاس عہدے اور اختیارات ہیں جس طرح اقوام متحدہ مختلف ممالک کی نمائندہ آرگنائزیشن ہے اس طرح کورڈیل خفیہ اقوام متحدہ ہے۔ جو ایسے معاملات کی نگران ہے جو خفیہ ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ایسی سازشوں کے خلاف اتحاد ہے جو منظر عام پر نہیں ہوتیں۔ ہم معلومات ہونے پر ان کے خلاف کام کرتے ہیں اور اپنے عمل کو منظر عام پر لانا پسند نہیں کرتے بلکہ خاموشی سے اس سازش کا قلع قمع کر دیتے ہیں اور نمائندہ ممالک کو پتا چل جاتا ہے کہ ایک ایٹمی یا غیر ایٹمی سازش فنا کر دی گئی۔

''ویری گڈ۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''اس طرح بہت سے وہ ممالک جو ہم میں شامل نہیں ہیں ہمارے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں اور ہماری کاوشوں کو قیمت پر ملیامیٹ کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔''

''ہوں۔'' میں نے دلچسپی سے کہا۔

''مزے کی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ ممالک بھی اپنے ہی خلاف زبردست پیمانے پر عمل کرتے ہیں جو کورڈیل کے ذمے ہیں۔'' سلوا اسٹاک نے کہا۔

''وہ کیوں؟'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ مفاد پرستی سیاست کا ایک حصہ بنالی گئی ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ لیکن یہ وقت انھیں سنانے کے لیے نہیں ہے۔''

''جی۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے باپ نے تمھیں آبدوز کے اغوا کی اطلاع دی ہے۔ تمھیں جس مقصد کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے اس میں بھی یہی معاملہ کارفرما تھا۔ یعنی یہ کہ جس ملک نے تمھیں ہائر کیا ہے وہ اس بات سے آگاہ ہوا تھا کہ کوئی بہت بڑی بین الاقوامی سازش ہوئی ہے اور اس سے کوئی اہم گروپ کارفرما ہے۔ تم بے کار وقت ضائع کر رہی تھیں۔ وہ ہم ہی لوگ ہیں جو ایک اہم مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ جیک ہوگنز ابھی ہمارے ساتھ شامل ہے۔ تمھیں ہم نے ذہانت سے کام لے کر ایک تیسری پارٹی بنادیا ہے۔ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔''

میرے بدن میں پسینے کی نمی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ میرے بدن میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مسکرائی اور بولی۔

''ان کی بدقسمتی وہ وقت لے آئی ہے جب بے شمار بے گناہ لوگ موت کی آغوش میں جا سوئیں گے۔''

''گگ کیا۔'' میں نے کہا۔

''ہمارا مشن مکمل ہو گیا۔ جیک ہوگنز اپنا کام کر چکا ہے۔ اور اب ہم اس ملک پر میزائل فائر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اس کے ان حصوں کو نشانہ بنائیں گے جن سے ہمیں اختلاف ہے۔''

''کیا تم لوگوں نے اس ملک سے بات کی؟''

''کیا بات۔''

''یہی کہ اگر وہ تمہارا مطالبہ پورا کر دیں تو تم اپنا ارادہ ترک کر دو گے۔''

''یہ بات چیت طویل عرصہ سے چل رہی ہے۔''

''کوئی نتیجہ۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ تھوڑی سی ناسمجھی تاریخ کا بہت بڑا المیہ بن جاتی ہے۔''

''کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''غالباً نہیں۔''

''وہ آبدوز جسے اغوا کیا گیا تھا۔''

''ہمارے قبضے میں ہے۔ اس پر سے میزائل اتار لیے گئے ہیں۔ دو میزائل ہی بیس سے فائر ہوں گے جہاں تم موجود ہو۔ جبکہ دو مغربی جرمنی سے فائر کیے جائیں گے۔''

میں نے اس وقت بڑی بے بسی محسوس کی تھی۔ میں اتنی اہم جگہ موجود تھی لیکن کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سلوا اسٹارک میری صورت دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ ابھری تھی اس کی مقناطیسی آنکھیں جسے میرے اندر اتر رہی تھیں پھر اس نے کہا۔

''کسی اجنبی شخصیت کے سامنے اگر اپنے رازوں کی نقاب کشائی کی جائے تو اس کا مطلب کیا ہوگا۔ جانتی ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہی کہ اس کی زندگی کی کہانی ختم ہو چکی ہے۔ سوری جان'' وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولی اور اچانک میرا خوف کافور ہو گیا۔ مجھے زور کی ہنسی آ گئی۔ یہ ایک حربہ تھا جس کے بارے میں انکل وانچی نے مجھے بتایا تھا۔ یعنی شدید خطرے کے وقت جب دشمن تمھیں آخری دھمکی دے رہا ہو تمہاری لاپروائی ہی اسے نروس کر سکتی ہے اور کچھ نہیں تو اس کے پستول کا نشانہ خطا کر سکتا ہے۔ سلوا اسٹارک حالانکہ بہت پائے کی عورت تھی، لیکن میری ہنسی پر حیران رہ گئی۔

''تمہاری ہنسی سمجھ میں نہیں آئی۔''

''بس ایسے ہی؟'' میں نے کہا۔

''لیکن تمہاری یہ بے خوفی مجھے پسند آئی۔ ایک خوب صورت لڑکی جسے ملکہ حسن کا اعزاز بھی مل سکتا ہے۔ اگر اتنی بے خوف بھی ہو تو کمال کی ہوتی ہے۔ میں ایسی لڑکیوں کی عاشق ہوں۔ سنو۔ میں تمہاری جان بچا سکتی ہوں اپنے لیے۔''

میں حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں مردوں جیسی ہوس ناچ رہی تھی۔ میں نے بارہا کچھ لوگوں کی آنکھیں پڑھی لیکن جن میں عجیب سی دیوانگی ابھر آئی تھی۔ لیکن یہ عورت۔ یہ عورت۔

''میں تمھیں کورڈیل میں شمولیت دعوت دیتی ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گئی اس کے جانے کے بعد مجھے انھیں باوردی گارڈ نے واپس میرے قید خانے میں پہنچا دیا۔ میں نے کافی دیر توقف کیا پھر کھڑکی کے قریب جا کر فرینک کو آواز دی۔

''تم آ گئیں مس پارک۔''

''ہاں۔''

''خیریت سے ہو؟''

''ہاں۔''

''میں تمہارے لیے فکر مند تھا۔''

''شکریہ۔ تمہارے ہاتھ کی تکلیف کیسی ہے۔''

''الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہڈی تک کٹی ہوئی ہے چھوڑو یہ بتاؤ تمھیں کیوں بلایا گیا تھا۔''

''میڈم سلوا اسٹارک سے ملاقات کرنے کے لیے۔''

''اوہ۔ کیا وہ تمھیں ملی۔'' فرینک نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔ اس سے ملاقات کر کے آئی ہوں۔ کیوں تمھیں حیرت ہے۔''

''حد سیکیونکہ خود کورڈیل کے مرکزی لوگوں میں سے بے شمار نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ بہت مغرور، دھوکے باز اور خطرناک ہے۔ ایک خاص بات بتاؤں۔

''ہاں بتاؤ۔''

''کہا جاتا ہے کہ وہ الزبے کوخ کی بیٹی ہے۔ الزبے کوخ تاریخ کی خونی عورت جس پر ہٹلر جان دیتا تھا۔ ہٹلر کے نام نے مجھ پر بے خودی سی طاری کر دی اور میں کچھ لمحوں کے لیے کھو سی گئی۔ فرینک نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا تو میں چونکی۔

''اس سے کیا بات ہوئی؟''

''مجھ سے میرے بارے میں اور میرے کام کے بارے میں پوچھتی رہی۔''

''تمھیں کوئی پیش کش تو نہیں کی۔''

''کیسی پیش کش۔'' میں نے سوال کیا۔ لیکن فرینک نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے زیادہ میں اس سے فرینک نہیں ہوسکتی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ روشنی معدوم ہو چکی تھی اور تاریکی اپنا تسلط جما رہی تھی کہ اچانک راہداری میں ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ نا جانے کیوں میرے بدن میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ کوئی آ رہا ہے۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے اور یقیناً میرے لیے کھانا آ رہا ہوگا۔ تو کیا......؟ ہاں ضروری ہے۔ وقت کم ہے اور ایک خوف ناک کھیل جاری ہونے والا ہے۔ اتنا خوف ناک کہ اس کے نتیجے میں تیسری جنگ عظیم بھی چھڑ سکتی ہے اور ممکن ہے کچھ ممالک اپنے مفادات کے لیے یہ چاہتے ہوں۔

ایسے میں کسی معجزے کا انتظار بے وقوفی ہے۔ عمل صرف عمل، کامیابی یا ناکامی، دونوں میں سے جو بھی ہو۔ اندر آنے والا گارڈ ہی تھا۔ ایک مخصوص جثے کا آدمی جس کی مونچھیں کافی بڑی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے تھی جس پر خوان پوش ڈھکا ہوا تھا۔ گارڈ نے ٹرے میرے سامنے رکھی اور بڑی شگفتہ انگریزی میں بولا۔

''امید ہے آپ کو یہ کھانا پسند آئے گا۔''

''شکریہ۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ اور آگے بڑھی پھر اس طرح ٹرے پر جھکی جیسے اس کا تعریف کردہ کھانا دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ بالکل قریب کھڑا تھا۔ میں جھکی اور پھر ایک دم زمین پر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہی میں نے سوئپ لگا کر اس کی ٹانگوں کو لپٹنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ رقص کرنے کے انداز میں تھرکا اور میری کوشش آسانی سے ناکام ہوگئی۔ میں جانتی تھی کہ میرا انجام کیا ہوگا۔ وہ میری اس حرکت پر مجھے گولی مار دے گا۔ اس لیے میں نے اس پر تابڑ توڑ حملے کیے اور وہ کمر لچکا لچکا کر انھیں ناکام بناتا رہا۔

''بے حد مضبوط اعصاب کی مالک ہوں میں۔ خطرناک سے خطرناک لمحوں میں متاثر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ انوکھی مخلوق جو کچھ کر رہی تھی اس نے میرا ذہن مفلوج کر دیا تھا۔ وہ جس طرح ان حملوں کو ناکام بنا رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔

''ہماری ثقافت میں اسے کتھک رقص کہا جاتا ہے۔ استاد دھرپت لعل کشوری نے ہمیں سکھایا تھا آپ کچھ اور کوشش کریں، ہم آپ کو منی پوری، اور گوتم چندی بھی دکھانا چاہتے ہیں۔''

گارڈ بڑی خوب صورت انگریزی بول رہا تھا لیکن میری صلاحیتیں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔ جیسا کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں نے دنیا کی بیشتر زبانیں سیکھی ہیں۔ خاص طور پر ایشیائی زبانیں کیونکہ میں خود ایشیائی ہوں۔ ان میں اردو، ہندی، پرشین وغیرہ بھی ہیں۔ باقی جو کچھ اس نے کہا تھا وہ تو مکمل طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن کتھک، دھرپت لعل کشوری اور منی پوری کے الفاظ میری سمجھ میں آئے تھے۔

لیکن یہ گارڈ۔ یہ شکل وصورت سے تو ایشیائی نہیں لگتا تھا۔ اس کے نقوش اس وقت واضح نہیں تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ کس ملک کا باشندہ ہے۔ لیکن بڑی عجیب شخصیت تھی۔ غرض یہ کہ اس وقت اس پر قابو پانے میں ناکام تھی۔ وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا پھر انگریزی میں بھلا۔

''میرے لائق اور کوئی خدمت۔''

''کون ہو تم؟'' میں نے خلا میں تیر پھینکا۔ اور یہ سوال سلیس اردو میں کیا۔ میرے خیال میں میں اسے حیران کرنے میں کامیاب ہوگئی کیونکہ وہ کچھ لمحے کچھ نہیں بول سکا تھا۔ البتہ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور کہنے لگا۔

''اردو کا یہ ایک ہی جملہ آتا ہے یا اور بھی بول سکتی ہو۔''

''میں تم سے میر تقی میر، مرزا غالب اور مومن خان مومن کی شاعری پر بھی گفتگو کرسکتی ہوں۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ تم نے مجھے حیران کردیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹرے میں تمہاری پسند کا کھانا ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہی۔ برابر دوسرے کمرے کا دروازہ ہے۔ جس کے پیچھے فرینک او برائے موجود ہے چاہو تو تھوڑا سا کھانا اسے بھی کھلا دو۔ کیا یاد کرے گا۔ اور ہاں سنو ایک پتا بتارہا ہوں یہ ذہن نشین کرلو۔''

''پتا؟'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔ بچ جاؤ اور فوری طور پر کسی عارضی پناہ گاہ کی ضرورت پیش آجائے تو وہاں چلی جانا۔ وہاں تمھیں آنٹی بشیراں ملیں گی۔ اور میں۔'' وہ دروازے کی طرف مڑا تو میں نے جلدی سے کہا۔

''سنو۔''

''بولو۔ جلدی۔''

''تم کون ہو؟ تم مجھے حیران کرنے میں کامیاب ہوگئے ہو۔''

''نن نہیں خدا کی قسم۔ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی، میں شادی شدہ ہوں اس نے مخبوط الحواسوں کے سے انداز میں کہا اور برق رفتاری سے باہر نکل گیا۔''

میں اس کے الفاظ پر غور کرنے لگی مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ البتہ یہ حقیقت تھی کہ اس نے ایک ہی انٹری میں مجھے حیران کردیا تھا۔ اگر یہاں گارڈ ہے اور کورڈیل کی ملازمت کررہا ہے تو میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا اس نے۔ میں جانتی ہوں اور وہ بھی جانتا ہوگا کہ کورڈیل کے کرتا دھرتا کتنے سنگدل اور درندہ صفت ہیں۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوگیا کہ ان کے ایک گارڈ نے ان کی ایک قیدی کو دہائی دلوانے کی کوشش کی ہے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے یہ خطرہ کیوں مول لیا۔

میری عقل نے خود میرے خیال کی نفی کردی۔

نہیں۔ وہ صرف گارڈ نہیں ہے کچھ اور ہے۔ ممکن ہے کسی ایشیائی ملک کا ایجنٹ جیسے پاکستان، ہندوستان یا اس کے آس پاس کے کسی ملک کا باشندہ۔ جو کورڈیل کی خفیہ کارروائیوں سے واقف ہونا چاہتا ہو۔ کیونکہ کورڈیل ایک خطرناک آرگنائزیشن تھی جس کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ اس کے کچھ خفیہ اغراض ومقاصد ضرور ہوں گے۔

میں نے گردن جھٹکی۔ سنگین ترین حالات کا شکار تھی۔ آنے والے ایک لمحے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک ہو۔ اگر یہاں سے نکلنے کا چانس ملا ہے تو فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ چنانچہ میں سنبھل گئی۔ میری نظریں رکھی ہوئی ٹرے پر پڑیں تو اچانک مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ تھوڑا سا کھانے میں کیا حرج ہے۔ توانائی آجائے گی اور زیادہ بہتر طریقے سے کام ہوں۔ بلکہ اس میں سے کچھ فرینک کو بھی دوں۔ پتا نہیں اسے کسی مہربان نے کھانا دیا نہیں۔ اور وہ بے چارہ بھی بھوکا ہی ہو۔

میں نے آگے بڑھ کر ٹرے سے سرپوش ہٹایا۔ اور میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ ٹرے میں لائٹ میرون

گنیں رکھی تھیں۔ ہلکی لیکن انتہائی مہلک اور جدید ان کے بارہ میگزین بھی تھے۔ ساتھ ہی چار چھوٹے دستی بم۔ اسے موجودہ وقت کا جدید ترین اسلحہ کہا جا سکتا تھا۔

یہ تھا وہ کھانا جو وہ میرے لیے لایا تھا۔

ایک بار پھر سر میں بھنور پڑنے لگے۔ اس نے میرے فرار کا بندوبست کیا ہے۔ لیکن کیوں۔ وہ کون ہے آخر؟ پھر میں ایک دم اچھل پڑی۔ کیا حماقت ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور میں انہی سوچوں میں وقت ضائع کر رہی ہوں۔ میں نے جلدی سے یہ اسلحہ اٹھایا اور باہر نکل آئی۔ اس نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔ وہ تمام راز کھولتا گیا تھا۔ فرینک کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بری طرح اچھل پڑا۔ اس نے سہمی نظروں سے مجھے دیکھا اور سخت حیرت سے بولا۔

''اینی پارک تم۔ تم یہاں کیسے آ گئیں۔''

''اٹھو۔ دیر کرنا خطرناک ہے۔ تمہارے ہاتھ کی تکلیف کیسی ہے۔ میں نے کہا۔

''دو انگلیاں جڑ سے کاٹ دی جائیں اور ان پر کوئی دوا بھی نہیں لگائی جائے تو کیفیت کیسی ہو سکتی ہے۔ تم خود اندازہ لگا لو۔'' اس کا لہجہ شکایتی سا ہو گیا۔ ''یہاں سے نکلنا چاہو گے۔'' میں نے سوال کیا۔

''پتا نہیں تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔''

''لو یہ گن سنبھالو۔ میں نے ایک گن اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

''گن۔''

''ہاں اگر اسے استعمال کر سکو۔'' میں نے کہا اور اس نے گن لے لی اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر حیرانی سے بولا۔

''لیکن یہ تمہارے پاس۔ اوہ دوسری بھی ہے۔'' اس نے میری گن دیکھ کر کہا۔ مجھے اس کا یہ لیچڑپن پسند نہیں آیا۔ یہ تجسس دور کرنے کا وقت نہیں تھا۔

''آؤ۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ہم دونوں باہر نکلے تو ہمیں دو گارڈ چہار دیواری کے قریب گشت کرتے نظر آئے اوپر والے گارڈز کی توجہ ان کی طرف نہیں تھی۔ میں نے فرینک کو اشارہ کیا اور رک گئی۔ کوئی اندازہ نہیں تھا کہ عمارت میں کتنے مسلح افراد مستعد ہیں اس لیے ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا تھا۔ ایک معمولی سی چوک پر وہ ہمیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔

میں نے اپنے بائیں سمت دیکھا۔ اس طرف کسی قدر اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لمحے میں صورت حال کا جائزہ لے کر ایک فیصلہ کیا چنانچہ میں نے برق رفتاری سے گن سے لگی چمڑے کی مضبوط لمبی ڈور کھول لی اور اس گھاس میں چھپ گئی۔ میری آنکھیں گشت کرنے والے گارڈز پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دو مختلف سمتوں میں گھوم گئے ایک میری طرف آ رہا تھا دوسرا چکر لینے چلا گیا تھا۔ چنانچہ میں بلی کی طرح پاؤں دبا کر بیٹھ گئی۔ وہ گارڈ قریب آ گیا تو میں نے نپی تلی چھلانگ لگائی اور چمڑے کی ڈوری اس کی گردن میں ڈال کر اسے پوری قوت سے کھینچ دیا۔ گارڈ کے حلق سے ایک ہلکی سی ''قیں'' کی آواز نکلی اور وہ نیچے گر گیا۔ میں نے اپنا گھٹنا اس کی پشت پر رکھا اور دوبارہ زور لگایا۔ لیکن شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔ گارڈ ساکت ہو گیا۔ فوراً ہی میں نے دوسرا عمل کیا۔ میں نے گارڈ کا اوورکوٹ اتار کر پہنا اس کو خود سر پر رکھا اور اس کی لاش کو گھسیٹ کر جھاڑیوں میں ڈال دیا۔

فرینک پر سکتہ طاری تھا۔ شاید وہ غور کر رہا تھا کہ اینی پارک عورت ہے بھی یا نہیں۔ اس دوران دوسرا گارڈ گھوم کر اس طرف آ رہا تھا اور میں گارڈ کا روپ دھار کر اس کے استقبال کے لیے تیار تھی۔ اور میں نے اس کا شایان شان استقبال کیا۔ اس بے چارے نے مرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں کیا کروں۔ یہ جگہ بہت خطرناک تھی۔ ویسے صحیح معنوں میں اندازہ نہیں ہو سکا تھا

کہ ان سرگرمیوں کا اصل مرکز کون سا ہے۔ کئی جگہیں، کئی عمارتیں ایسی تھیں جنھیں اہمیت حاصل تھی۔ ان میں سے کچھ اس دوران تباہ ہو چکی تھیں یا کر دی گئی تھیں۔ اور کچھ ابھی پوشیدہ تھیں۔ اب یہ عمارت جہاں میں قید تھی۔ جہاں فرینک قید تھا۔ اور جہاں کورڈیل کی سربراہ سلوا اسٹارک نے ملاقات کر کے بے حد اہم روز منکشف کیے تھے۔ اس کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں ہو گا کہ میں اس کے چنگل سے زندہ نکل گئی تو ان کے لیے ایٹم بم ہی بن جاؤں گی۔ وہ اپنی آخری کوشش بھی اس کام میں صرف کر دیں گے کہ میرا خاتمہ کر دیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ سلوا اسٹارک نے دو میزائلوں کے اس عمارت میں ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ کیا یہ دعویٰ درست ہے۔

میں یہاں جو کچھ کر چکی تھی اس کی اطلاع بہت جلد ان لوگوں کو ہو جائے گی۔ اور ممکن ہے اس کے بعد کچھ تبدیلیاں کی جائیں۔ لیکن اب میں کیا کروں۔

اچانک میری فطرت عود کر آئی۔ ترمودا وانچی نے مجھے پندرہ دن قید رکھ کر تربیت دی تھی۔ اور بہت سے کارآمد عمل مجھے سکھائے تھے۔ پاپا نے مجھ پر اعتماد کیا تھا۔ خود میرے اندر ماتا ہری جیسی پائے کی جاسوس بننے کی لگن تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ یہ میری پہلی مہم تھی لیکن اس کی کامیابی پر میرے باپ کی خواہش کی تکمیل ہوتی تھی۔ اس کوشش میں اپنی جان کی فکر کرنا اپنے باپ کے اعتماد سے غداری تھی۔ یہاں سے نکل کر بھاگنا زندگی کی ضمانت لیکن ذمہ داریوں سے غداری تھی۔ چنانچہ میں نے ایک فیصلہ کیا۔ اور فرینک سے کہا۔

''ہمیں آزادی مل گئی ہے فرینک۔ اب بتاؤ کیا کریں۔''

''میں سخت تکلیف میں ہوں۔ اور مجھ پر بار بار غشی طاری ہونے لگتی۔''

''اٹھو۔ ہم اس عمارت سے باہر نکلیں۔ اس کے بعد سوچیں۔

وسیع ترین عمارت میں کون کہاں ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اب تک ہم لوگ من مانی کرتے رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شطرنج کی بازی پلٹنے میں اس پراسرار گارڈ کا ہاتھ تھا ورنہ اس صورت حال اور اس آسانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا جو اس وقت تھی۔ جبکہ اس گارڈ کے بارے میں سوچتے ہوئے اب بھی دماغ گھومنے لگتا تھا۔

فرینک کو جگہ جگہ سہارا دینا پڑ رہا تھا اور اس وقت مجھے انسانی فطرت کے ایک دلچسپ پہلو سے بھی آشنائی ہو رہی تھی۔ یعنی عورت اور مرد کا فلسفہ کہیں بھی شکست نہیں کھاتا۔

مسٹر فرینک کو سزا دیتے ہوئے ان کی دو انگلیاں کاٹ دی گئی تھیں۔ تکلیف کی وجہ سے ان پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ میں انھیں سہارا دے کر اس عظیم الشان عمارت کے باہر لائی تو انھوں نے بڑی مہارت سے مجھ سے ''فرینک'' ہونے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کے لیے غصہ آیا لیکن اپنے تجربے کے رجسٹر میں ایک علم کے اضافے کی وجہ سے انھیں معاف کر دیا۔ ہاں تھوڑی سی سزا ضروری بھی تھی اس لیے میں اس طرح لڑکھڑائی کہ ان کا زخمی ہاتھ زور سے دوسرے ہاتھ سے ٹکرایا۔ اور بالکل ہوش میں آ گئے۔

''آپ آزاد ہو چکے ہیں مسٹر فرینک۔'' باہر آ کر نے کہا۔

''دیکھئے زندگی کی قید سے کب آزاد ہوتا ہوں۔

''کیوں؟''

''وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''''کیوں؟''

''ظاہر ہے میں ان خفیہ کرداروں سے واقف ہو چکا ہوں۔

''شاید کورڈیل کی کالی بھیڑیں جلد منظر عام پر آ جائیں۔ بس اس کے بعد آپ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔

''ان کالی بھیڑوں کے منظر عام تک آنے سے پہلے میرے ساتھ کیا ہو گا۔ یہ میں نہیں جانتا۔''

''یہاں اس عمارت میں آپ کو قید کر دیا گیا تھا اور بظاہر آپ کے زندہ بچ جانے کے امکانات نہیں تھے۔''

''بالکل۔''

''لیکن آپ زندہ ہیں۔''

''ہیں کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ زندگی ہے تو آپ زندہ رہیں گے۔''

''ہاں شاید۔'' وہ میری مری آواز میں بولا۔

''اب آپ کہاں جائیں گے۔''

''گھر نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ وہ مجھے تلاش کریں گے۔ میرے پاس جگہ ہے۔ ہم دونوں وہاں آرام سے کچھ وقت گزار سکیں گے۔ آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''جائیے آپ وہاں جا کر آرام کیجیے۔'' میں نے کہا۔ وہ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ پھر عقل واپس آئی تو اس نے دوڑ لگا دی اور میں مسکراتی ہوئی واپس پلٹ پڑی۔ میرا رخ اس گھر کی طرف تھا اور میں دوبارہ اس میں داخل ہوگئی۔

مجھے صرف یہ خیال تھا کہ اگر سلو اسٹارک کے رہنے کے مطابق میزائل اس عمارت میں ہیں تو انھیں ناکارہ بناؤں۔ اور اس عمل میں زندگی اور موت کے فلسفے کو بھول جاؤں۔ کامیابی صرف کا میاب پھر میں ایک آوارہ روح کی مانند اس وسیع عریض عمارت میں ٹہلنے لگی۔ اور اس کے چپے چپے کی تلاشی لینے لگی۔ اس نے یہ خیال بھی رکھا تھا کہ جیسے سلو اسٹارک نے اسے بتایا تھا کہ دو میزائل یہاں سے فائر کیے جائیں گے۔ ظاہر ہے میزائل پوری مشنری کے ساتھ فائر کیے جاتے ہیں۔ اس عمارت میں ایسی کون سی جگہ ہو سکتی ہے جہاں یہ میزائل پوشیدہ ہوں۔

اب تک اس تلاش میں دو اور افراد کی زندگی چلی گئی تھی۔ یہ دونوں بھی گارڈ تھے اور اسٹین گنیں لیے پہرہ دے رہے تھے۔ انھیں قطعی علم نہیں تھا کہ عمارت میں کیا ہو چکا ہے۔ وہ تو اس وقت چونکے جب انھوں نے میرے پیروں کی آہٹ سنی۔ اس آہٹ پر وہ تڑپ کر پلٹے اور انھوں نے اسٹین گنوں کے لیور کھینچنے چاہے لیکن میری چلائی ہوئی گولیوں نے انھیں خون میں ڈبو دیا۔

اس وقت صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی جب میں اس عمارت سے باہر نکلی اور جھٹپٹے میں تیز رفتاری سے چلتی دور نکل آئی۔ میرا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ اب میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ کہاں جاؤں کیا کروں۔

اس وقت ایک ٹیکسی پیچھے کی طرف سے آ رہی تھی جو پہلے تو میرے قریب سے گزر گئی لیکن آگے جا کر رکی اور ریورس ہو کر میرے برابر آ گئی۔ ڈرائیور سکھ تھا داڑھی اور پگڑی والا۔ اس نے گردن نکال کہ مجھے دیکھا پھر بولا۔

''پیسے نہیں دیے حرامیوں نے کیا۔''

میں اس کے جملوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ پھر بولا۔ ''دسو چناں، کتھاں گزاری رات آ جاؤ۔ بیٹھو جہاں کہو چھوڑ دوں۔''

اُف میرے خدا۔ اب سمجھ میں آیا کہ سردار جی مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ غصہ نہیں آیا۔ میرا حلیہ ہی ایسا ہو رہا تھا لیکن سردار جی کی اس شوخ آواز کے ساتھ میں مجھے گاڑ دیا آ گیا۔ وہ عجیب انسان جو ایک سحر ہی کی طرح مجھ پر مسلط ہو گیا تھا۔ حقیقی معنوں میں اس نے کایا پلٹ دی تھی اور میں آزاد ہو کر یہاں آ گئی تھی۔ ورنہ انجام نہ جانے کیا ہوتا۔

ان یادوں کے ساتھ مجھے اس کا دیا ہوا پتا یاد آ گیا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور میں نے اُسی پتا بتا دیا۔ وہ اس طرح چل پڑا جیسے اسے اس کے بارے میں بخوبی معلوم ہو۔

منزل پر پہنچ کر میں نے کہا کیا۔

''میرے پاس واقعی پیسے نہیں ہیں تم یہ انگوٹھی رکھ لو۔''

ڈرائیور نے شوخی سے مجھے دیکھا پھر ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ یہ بھی مشرقی تھا بلکہ مجھے معلوم تھا کہ ہندوستان کا باشندہ ہے۔ لندن میں مشرقیوں کی کمی نہیں تھی۔ ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے اس چھوٹے سے بنگلے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ بیل بجائی تو بالکل مشرقی طرز کے لباس میں ملبوس ایک بھاری سے بدن کی عورت نے دروازہ کھولا۔ اور پھر مجھے دیکھ کر ایک دم آگے بڑھ آئی۔

''نی تو آ گئی پنو۔ میں کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔''

''پنو'' میرے ذہن میں چھنا کہ ہوا۔ اس کی پوری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ معصوم اور سادہ سا انداز تھا۔ میں تھوڑی سی جھجکی تو وہ جھٹ سے بولی۔ ''ارے اندر آ۔ کیا غیروں کی طرح باہر کھڑی ہے۔ ہائے مگر ایک بات تو بتا۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اندر گھسیٹ لیا پھر دروازہ بند کر لیا۔

''تو پنو ہی ہے نا؟''

''ایں۔ ہاں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''پر اللہ قسم پوری کٹھپتی لگے ہے۔...... گٹ پٹ، گٹ پٹ...... گٹ پٹ۔'' اس نے مسخرے انداز میں کمر لچکاتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے لے کر اندر داخل ہو گئی لندن میں کسی ایشیائی کا جیسا گھر ہو سکتا تھا یہ ویسا ہی تھا۔ معمولی سی ڈیکوریشن۔ سادہ سا انداز لیکن ہر چیز موجود تھی۔ جس کمرے میں وہ مجھے لے گئی اسے ڈرائنگ روم کہا جا سکتا تھا۔ فرنیچر صاف ستھرا تھا۔ دوسری چیزیں بھی ٹھیک ٹھاک تھیں۔ وہ کہنے لگی۔

''کیسا خراب حلیہ ہو رہا ہے تیرا پنو۔ نہائے گی؟''

''نہا لوں گی۔ تمہیں کوئی دقت تو نہیں ہو گی۔''

''لے نہائے گی تو۔ اور دقت مجھے ہو گی۔ میرے کپڑے پہن لے گی شلوار قمیض۔''

''تمہارے کپڑے۔ میں نے جھجک کر کہا۔ اس کا بدن مجھ سے بہت بھاری تھا۔ اس نے ایک لمحے مجھے دیکھا۔ پھر ہنس کر بولی۔

''تھوڑے دن پہلے موٹی ہوئی ہوں۔ پہلے تیرے جیسے بدن کی تھی۔ میرے پہلے والے کپڑے میرے نہیں آتے پر تیرے آ جائیں گے۔''

''کتنی پیاری ہو۔ موٹی کیوں ہو گئیں۔'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ واقعی حسین نقوش کی مالک تھی چہرے پر بڑی ملاحت تھی اور وہ چمک رہا تھا۔

''میں کیا بتاؤں۔ کھانے کا بڑا شوق ہے۔ میرے سامنے کچھ بھی رکھ دو بس یہ کہہ دو کہ کھانے کی چیز ہے کھا جاؤں گی۔'' اس نے کہا اور خوب ہنسی۔ پھر ایک قدم چونک کر بولی۔

''ہائے میں مر جاؤں۔ کھانے کی باتیں کر رہی ہوں اور تجھ سے کچھ کھانے کے لیے نہیں پوچھا۔ یوں کر پہلے کچھ کھا پی لے اس کے بعد نہا لینا کوئی جلدی تو نہیں ہے؟''

''تم مجھے کپڑے دے دو۔ میں نہا کر بدل لوں۔ اتنی دیر میں تم کچھ کھانے کا بندوبست کر لینا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔''

جنت لگ رہی تھی یہ جگہ۔ بالکل جادو نگری۔ کچھ بھی نہیں جانتی تھی اس کے بارے میں۔ پتا نہیں وہ گارڈ کون تھا۔ اور یہ عورت مجھے پنو کیوں کہہ رہی تھی۔ وہ میرا انتظار کیوں کر رہی تھی جبکہ میرا یہاں آنا تو صرف اتفاق تھا۔ گارڈ نے پتا ضرور بتایا تھا لیکن یہ بھی کہا تھا کہ اگر ضرورت پیش آئے تو یہاں آ سکتی ہوں۔ ضرورت پیش آ گئی تھی۔ اس وقت صورت حال عجیب تھی۔ مجھے یہاں اس لیے بھیجا گیا تھا کہ ایک بین الاقوامی سیٹ اپ میں کوئی بگاڑ آ رہا تھا۔ کور ڈیل آرگنائزیشن کے ان بڑے ملکوں کا مشترکہ ارادہ تھا جو اس وقت دنیا کی سیاست کے مالک تھے۔ اور

کسی بھی طرح سے حالات بدل سکتے تھے۔ وہ چاہتے تو تیسری جنگ عظیم لمحوں میں شروع ہو سکتی تھی۔ پوری دنیا کے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں انھیں اختیار حاصل تھا۔ ان کا ایک مشترکہ ایجنڈا تھا جس پر وہ سختی سے عمل پیرا تھے۔

لیکن برٹش سیکرٹ سروس کو کچھ ایسے شواہد ملے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ کورڈیل میں کچھ کالی بھیڑیں داخل ہو کر ایسی سازشیں کر رہی ہیں کہ ان مشترکہ ممالک میں پھوٹ پڑ جائے اور وہ من مانا ماحول پیدا کر کے مفادات حاصل کریں۔ اس سلسلے میں خاص طور سے برٹش حکومت نے کارمیل سارترے کی خدمات حاصل کی تھیں اور زبردست معاوضے پر اس کا تعاون حاصل کیا تھا۔

کارمیل سارترے اور ترمووا واچی نے مجھ پر یعنی اینی پارک پر انحصار کیا تھا جس پر انھوں نے زبردست محنت کی تھی اور اسے ون مین آرمی کی حیثیت دے دی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے مجھے دنیا کی بڑی جاسوس عورتوں کی ان صفات سے مرصع کیا تھا جو آج تک نامور جاسوساؤں میں شمار ہوتی تھیں اور میں نے خوشی سے یہ ذمے داری قبول کی تھی کیونکہ خود میری فطرت ایڈونچر پسند تھی۔ اور میں خود کو منفرد پاتی تھی۔

اپنی زندگی کے اس پہلے مشن میں مجھے بہت سے تجربے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس زندگی میں عام انسانی فطرت سے تھوڑا سا ہٹ کر رہنا ہوتا ہے۔ بہت سے جذبوں کو خیر کہنا ہوتا ہے۔ فطرت میں بے رحمی ضروری ہوتی ہے ورنہ پھر خود قابل رحم ہو جانا پڑتا ہے۔ میں خود کو مکمل تو نہیں کہہ سکتی۔ لیکن اب تک کی کارکردگی میں بہت سے مرحلوں پر میں اپنے آپ سے مطمئن تھی اور اپنا کام بہتر طور پر کر رہی تھی۔ میرے ہاتھوں کچھ زندگیاں بھی ختم ہو گئی تھیں اور میں نے یہ قتل پوری بے رحمی سے کیے تھے۔ جس پر مجھے خود حیرت تھی۔ ویسے مجھے دلچسپ تجزیے ہو رہے تھے۔ اب تک بہت سے نیگٹو پوزیٹو کردار مجھے ملے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ انھیں میرے بارے میں معلوم تھا۔ یعنی وہ جانتے تھے کہ برٹش حکومت نے کورڈیل میں ہونے والی سازشوں اور اس میں موجود کالی بھیڑوں کو تلاش کرنے کے لیے ایک خطرناک ایجنٹ کی خدمات حاصل کی ہیں جو غیر متعلق شخصیت ہونے کی وجہ سے دیانت داری سے کام کرے گا اور حقیقت کو منظر عام پر لائے گا۔ اس کے ساتھ میں ان سازشوں کا سلسلہ جاری تھا جن کی وجہ سے حالات بگڑ سکتے تھے۔ اور اس کی تصدیق اس عورت سلوا اسٹارک سے ہو گئی تھی جس نے آبدوز کے اغوا اور اس سے حاصل شدہ میزائلوں کے خطرناک اور تباہ کن استعمال کی تیاریوں کی نشاندہی کی تھی۔

بات یہ نہیں تھی کہ میں نے اب تک ذہانت سے کام نہیں کیا تھا۔ میں نے پوری محنت کی تھی اور بہت سے مسئلے حل کر لیے تھے لیکن جو کمی رہ گئی تھی اس کا مجھے پورا احساس تھا۔ آخر میں، تو میں پوری طرح پھنس گئی تھی اور وہ تو سلوا اسٹارک کی مہربانی تھی کہ اس نے مجھے تھوڑی سی زندگی دیدی تھی ورنہ وہ اگر چاہتی تو راستے کی گھاس کی طرح مجھے کاٹ کر پھینک دیتی اور کورڈیل کی کالی بھیڑوں کے لیے ایک خطرہ ختم ہو جاتا۔

یہ اب تک کا کھیل تھا۔ لیکن یہ گارڈ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں تو ٹھیک طور سے اس کے چہرے کے نقوش بھی نہیں دیکھ سکی تھی بس اس کے لہجے اور کچھ الفاظ سے پتہ چلا تھا کہ وہ مشرقی باشندہ اور پھر یہ گھر۔ یہ عورت۔

میں نے غسل کر کے اس کا دیا ہوا لباس پہنا اور حیران رہ گئی۔ لباس میرے بدن پر بالکل فٹ آیا تھا۔ اسے شاید علم تھا کہ میں اس وقت کس پوزیشن میں ہوں۔ چنانچہ جیسے ہی میں بال وغیرہ درست کر کے تیار ہوئی وہ ناشتے کی ٹرے لیے اندر داخل ہو گئی۔ بڑے سلیقے کا ناشتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ناشتے میں مصروف ہو گئی۔

''تم بھی میرے ساتھ ناشتا کرو۔'' میں نے کہا۔

''نا جی نا۔ ہم تو بس حیران ہیں۔''

''کیوں؟''

''شکل سے تو تم گٹ پٹ لگو ہو پر ہماری زبان بول رہی ہو۔ کتنی اچھی لگ رہی ہے تمہارے منہ سے اپنی زبان۔''

''تمہارا نام بشیراں ہے نا؟'' میں نے کہا تو اس کی خوب صورت آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ہائے میں مرجاؤں۔ کیسا پیارا لگا ہے تمہارے منہ سے اپنا نام...... تمہیں الہ دین نے بتایا ہوگا۔
''الہ دین کون؟'' میں نے کہا۔
''ایں۔ وہی جس نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔''
''ہاں اس نے تمہارا نام بشیراں بتایا تھا لیکن اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ اس کا نام الہ دین ہے۔''
''ہاں جی۔ پر تمہارا نام پینو ہی ہے نا مطلب یہ کہ پروین؟'' اس کے انداز میں کس قدر گھبراہٹ پیدا ہوگئی۔
''کیوں۔ تم گھبرا کیوں گئیں۔''
''بس جی ایسے ہی خیال آیا تھا کہ ہم سے غلطی تو نہیں ہوگئی۔ تم کوئی اور تو نہیں ہو۔ اس نے معصومیت سے کہا۔
''کیا کہا تھا اس نے میرے بارے میں۔'' میں نے ناشتا کرتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔
''لے اس نے کبھی کوئی ڈھنگ کی بات کہی ہے جو اب کہے گا۔'' وہ بولی۔
''پھر بھی کچھ تو کیا ہوگا میرے بارے میں۔''
''کہنے لگا بشیراں ہو سکتا ہے کہ ایک لڑکی یہاں آئے۔ خوب صورت گوری چٹی ہے۔ بالکل میم لگتی ہے۔ اس کا نام پروین ہے۔ اس کے ماں پیو اسے پینو کہتی ہیں۔ اگر وہ آئے تو اس کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔''
''ہوں۔ اور کیا؟''
''اور تو کچھ نہیں کہا۔''
''وہ خود کہاں ہے۔''
''ناجی نا۔ اس کے بارے میں تو آج تک کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔''
''کیا مطلب۔''
''کوئی مطلب نہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔''
''کیا وہ یہاں نہیں رہتا۔؟''
''آج تک نہیں رہا۔''
''تم سے اس کا کیا رشتہ ہے۔''
''بس جی۔ کوئی رشتہ نہیں ہے ہمارا۔ ہم بے یار و مددگار پھر رہے تھے اس موئے گٹ پٹے شہر میں نہ کسی کی بات ہماری سمجھ میں آتی تھی نہ ہماری کسی کی سمجھ میں۔ برے حال تھے۔ سوچ سوچ کر مر رہے تھے کہ اب کیا ہوگا کہ اللہ نے مدد کی اور الہ دین مل گیا۔''
''مگر تم لندن میں کیا کر رہی تھیں۔''
''بس جی۔ ایک صاحب اور بی بی جی ہمیں ہمارے ملک سے یہاں لائے تھے۔ نوکرانی تھے ہم ان کی۔ ان ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ صاحب کی نوکری یہاں لگی تو وہ بی بی صاحب کو بھی لے آئے اور ہمیں بھی۔ دو سال یہاں ساتھ رہے۔ پھر دونوں میں جھگڑا ہوا۔ بی بی نے صاحب کو گولی ماردی اور خود جیل چلی گئیں ہمارا کسی نے کچھ نہیں سوچا۔ اور ہم در بدر ہوگئے۔ اپنے ملک جانے کا بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں تھا کہ کیسے جائیں۔ مارے مارے پھر رہے تھے کہ الہ دین مل گیا اور یہاں لے آیا۔ اس نے کہا ہے کہ ہمیں ملک بھجوا دے گا۔ وہاں جا کر پھر کسی کے ہاں نوکری کرلیں گے۔ وہاں بھی ہمارا کون ہے؟'' بشیراں نے اپنی درد بھری کہانی سنائی۔
میں بہت متاثر ہوئی۔ زندگی کے کتنے پہلو ہوتے ہیں۔ پھر میں نے کہا۔
''کیا تم اس سے محبت کرتی ہو بشیراں۔''
''نہیں جی۔ وہ بندہ بشر ہی کہاں ہے۔'' بشیراں کا لہجہ شکایتی ہوگیا۔

"کیا مطلب؟"

پروگرام کے مطابق میں کلب میں داخل ہوگئی۔ بے حد شاندار عمارت تھی اندر کا ماحول بھی لاجواب تھا۔ اسے جدید ترین پیمانے پر آراستہ کیا گیا تھا۔ میں نے اس کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ اعلیٰ پیمانے پر جوا ہورہا تھا۔

اچانک میں نے ایک عورت کو دیکھا جو ایک خطرناک سی شکل کے لمبے چوڑے آدمی کے ساتھ ناخوشگوار انداز میں بات کررہی تھی۔ سیکرٹ سروس کے ریکارڈ میں اس شخص کی تصویر اور کارڈ بھی موجود تھے۔ یہ جان سیموئل تھا اور اس کلب کا مالک ہی تھا۔ لیکن سب سے زیادہ سنسنی کا شکار میں اس وقت ہوئی جب جان سیموئل نے عورت کو ایشل کہہ کر مخاطب کیا۔ انکل ترمودا واچی نے مجھے آبدوز اغوا کرنے والوں کے وہ نام جو پاپا نے ہیک کیے تھے ان میں ایشل نارمن کا نام بھی شامل تھا۔ یہ عورت بے پناہ حسین اور پرکشش تھی۔

ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ اچانک میں نے سیموئل اور ایشل کو چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو برا کہتے ہوئے سنا۔ دونوں شدت، غضبناک انداز سے ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ آس پاس کے تمام لوگ ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ کچھ لوگ ان کے درمیان بیچ بچاؤ کے لیے بھی کھڑے ہوگئے۔ میں نے بھی اس بارے میں فوری فیصلہ کیا اور تیزی سے عورت کے قریب پہنچ گئی۔ اسے سہارا دینے والوں میں، میں واحد عورت تھی۔ ورنہ سب اس سے ہمدردی کررہے تھے۔

میں نے اس کا بازو پکڑ کر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "پلیز۔ آپ خود کو سنبھالیں آپ کا چہرہ زرد ہورہا ہے۔ مجھے وہ شخص انتہائی بدتہذیب معلوم ہوتا ہے۔ آیئے پلیز۔ میرے ساتھ مشروب کا ایک گلاس لیجیے۔"

پھر وہ میرے ساتھ کھنچی چلی آئی۔ اس نے مجھ پر توجہ بھی نہیں دی تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ وہ ابھی تک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ پھر اس نے پہلی بار لب کشائی کی اور کہا۔

"وہ اس کلب کا مالک ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا۔"

"آپ کے لیے کیا منگواؤں۔"

"شیری پلیز!" وہ بولی۔ اور میں نے ویٹر کو اشارہ کردیا۔

"اس نے مجھے کوئی معمولی شخصیت سمجھا ہے۔ میں امریکی بحریہ کے بہت بڑے افسر کی بیوی ہوں۔"

"یقیناً آپ تو بہت بڑی شخصیت ہیں میڈم۔"

"ایشل نارمن۔" اس نے کہا لیکن اس نے مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا تھا۔

شیری کے کئی پیگ پینے کے بعد اچانک اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ذرا واش روم جاؤں گی۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ وہاں سے آگے بڑھ گئی اور میں اس پر غور کرنے لگی۔ نا جانے کیوں وہ مجھے ایک عام سی عورت لگی۔ ممکن ہے یہ وہ ایشل نارمن نہ ہو جس کا نام آبدوز اغوا کرنے والے گروہ میں شامل ہے۔ اس نام کی کوئی دوسری عورت بھی ہوسکتی ہے۔

میں انتظار کرتی رہی۔ جس طرح اس نے میرے پاس بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکالی تھی اور میری پیش کش کو قبول کرکے شیری پی تھی اس کے تحت اسے واش روم سے نکل کر اخلاقاً میرے پاس ہی آنا چاہیے تھا۔ لیکن دس منٹ، پھر بیس منٹ ہوگئے وہ نہیں آئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ واش روم کی طرف جاکر اسے دیکھوں۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر آگے بڑھی ہی تھی کہ ایک ویٹر میرے قریب آکر جھکا۔

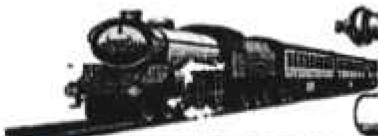
"میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں میڈم۔ مجھے مسٹر میک مینن نے یہاں ڈیوٹی پر لگایا ہے۔"

(اینی پارک...... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تہلکہ مچائے گی۔

اُس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

چوہے





غزالہ نزہت فاطمہ

بلوچستان میں پیش آنے والا ایک قصہ عجب
جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردے گا

چاروں صوبوں کی خاک چھانتی ہوئی جعفر ٹرین ایک دھچکے سے اسٹیشن پر رکی تو میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے لگے بورڈ پر لکھا تھا۔ ''سبی''

مسافر اس طرح ریل کے ڈبوں سے باہر اُبل پڑے، جیسے بارش کے بعد چیونٹیاں بلوں سے باہر آجاتی ہیں۔

یہ مئی کے مہینے کی بات ہے۔ صوبہ بلوچستان کا گرم ترین شہر سبی سرمئی پہاڑوں میں گھرا آگ برسا رہا تھا۔ یہاں پر ٹرین کم از کم ایک گھنٹہ رکتی ہے۔ یہ بڑا جنکشن اسٹیشن ہے۔ یہاں پر انجن تبدیل کیا جاتا ہے۔ اندرونِ ملک بین الصوبائی تجارتی سامان کی لوڈنگ، اَن لوڈنگ کی جاتی ہے۔ مگر مسافروں کی جان پر بن جاتی ہے۔ لوڈشیڈنگ جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے۔ بلب اور پنکھے ویسے ہی ندارد ہوتے ہیں۔

☆☆☆

ایک اچانک افتاد پڑنے کی وجہ سے بحالت مجبوری، ریل گاڑی میں تن تنہا سفر کرنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی کہ دھڑ سے سلیپر کا دروازہ دیوار سے ٹکرایا اور دو چھوٹے چھوٹے بچے ایک لڑکا، ایک لڑکی مع ایک مرد اور عورت (جو غالباً ان کے والدین تھے) ڈبے میں وارد ہوئے۔ سوٹ کیس اور گٹھڑیاں وغیرہ اٹھائے ہوئے۔

میرے متوجہ ہونے پر مرد نے بتایا کہ اس سلیپر میں ان کی چار سیٹوں کی بکنگ ہے۔ اور کوئٹہ تک میرا اُن کا ساتھ رہے گا۔ آپ کو بُرا تو نہیں لگا۔''

''بالکل نہیں۔'' میں نے خوش دلی سے مسکرادی۔

میری توجہ کا مرکز ان کے دونوں بچے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ بات چیت سے پتا چلا کہ کوئٹہ کے کسی پرائیویٹ انگریزی اسکول کے طلبہ ہیں۔ اتنے میں ان کا باپ گاڑی سے اسٹیشن پر اُترا اور تھوڑی دیر بعد حلوہ اور روٹیاں وغیرہ اٹھائے گاڑی میں لوٹ آیا۔ یہ سبی اسٹیشن کا مشہور ناشتا تھا۔ مجھے بھی اپنا ٹفن کیریئر یاد آگیا۔ کھول کر دیکھا تو خالہ جان نے تین عدد ڈبوں میں اُبلے ہوئے چاول، پکی ہوئی پلا مچھلی اور پراٹھے رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب مجھے بے حد اچھا لگا۔ بچوں کی ماں نے مجھے بھی کھانے کی دعوت دی تو میں اپنا سامان لے کر ان کے ساتھ لذتِ کام و دہن میں جٹ گئی۔ وقت اور گرمی کی شدت کا پتا ہی نہ چلا۔ محبت اور اخوت میں اتنی طاقت ہوتی ہے مجھے آج پتا چلا۔

سبی سے قبل روہڑی سے آئے ہوئے تمام راستے

میں اخبار پڑھتی آ رہی تھی۔ مگر اب وہ سیٹ پر پڑا کھڑکی سے آنے والی ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ آتی ہوئی ہوا نے پتا دیا کہ گاڑی چل پڑی ہے۔ چھکا چھک، چھکا چھک اخبار کے کچھ اوراق اڑ اڑ کر گرنے لگے تو سنڈے میگزین (یہ اتوار کا دن تھا) بھی دور جا گرا۔ جو لڑکی نے جو عمر میں لڑکے سے بڑی لگتی تھی بلا اجازت جھپٹ کر اٹھا لیا۔ اور دونوں بہن بھائی اس کو الٹ پلٹ کر با آواز بلند پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

بچوں کی ماں نے بتایا کہ اس دفعہ ہمیں کوئٹہ جانے میں دو ماہ کی تاخیر ہو گئی ہے۔ ہم چھوٹے موٹے کسان خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دفعہ گندم کا سودا بروقت نہ ہونے پر ہم یہیں سبی میں پڑے سڑ رہے تھے۔ وہ تو بھلا ہوا ان چوہوں کا جن کی وجہ سے ہم آج ریل گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ اب ماں کے ساتھ ساتھ لڑکی بھی مجھ سے مخاطب ہو گئی تھی۔

''کیا مطلب! چوہوں کا کیا قصہ ہے۔ انھوں نے کیسے تمھیں گاڑی میں بٹھا دیا۔'' میں ہنس پڑی۔ باپ اور بھائی میری بات سن کر صرف ہنس دیے اور اخبار پڑھنے میں لگے رہے۔ اب دونوں ماں بیٹی نے ملے جلے انداز میں مجھے چوہوں کی یہ حیرت انگیز کہانی سنائی۔

☆☆☆

''آئی...... او آئی۔ اِدھر تو آؤ جلدی سے نیچے



گودام میں۔''

مجھے ذرخاتون (بیٹی) کی آواز کسی کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ماں بولی۔

ہمارا اناج کا گندم دراصل ہمارے بڑے سے کچے پکے گھر کے وسیع وعریض صحن کے دوسری جانب ہے جو گھر کے رہائشی حصے سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ میں نے تو اِسے حسبِ معمول صبح ناشتے میں روٹی پکانے کے لیے آٹا نکال کر لانے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ کیوں پریشانی ہے چلا رہی ہے۔ میں ابھی تک یہ سوچ ہی رہی تھی کہ لڑکی کی آواز دوبارہ ابھری۔

''آئی جلدی پہنچو اس سے پہلے کے یہ کم بخت چوہے مزید بوریاں بھی کتر ڈالیں۔ تم جلدی سے یہاں آجاؤ اور کچھ کرو ان کا۔''

میں جلدی سے جوتی گھسیٹتی ہوئی گودام تک پہنچی تو اندر کا منظر دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

گودان ڈھائی ڈھائی من کی گندم سے بھری ہوئی بوریوں سے چھت تک بھرا ہوا تھا۔ مگر ان میں سے زمین سے لگی دو بوریاں ادھڑی ہوئی تھیں اور بہت سارے گیہوں زمین پر بکھیرے پڑے تھے مگر بوریوں کے پچکے ہوئے حصوں نے بتا دیا کہ بہت سی گندم برآمد کی جا چکی ہے۔ کیونکہ کوٹھڑی میں کوئی بیس تیس موٹے تازے سیاہ، بھورے اور سفید چوہے کد کڑے بھر رہے تھے۔ اور گندم کے دانے منہ میں بھر بھر کے ایک دیوار میں کیے گئے بڑے سے سوراخ کے راستے باہر کہیں اپنے ٹھکانے پر پہنچا رہے تھے۔ گندم کی ترسیل کا عمل مزید جاری رہتا، اگر یہ چور چوہے ہماری آمد کا احساس ہوتے ہی تیزی سے بھاگ نہ جاتے مگر یہ کیا؟ دو عدد سیاہ فام چوہے جو کچھ زیادہ ہی موٹے تھے تیزی سے بھاگ کر باہر نہ نکل سکے مگر ہمارے ڈرانے دھمکانے پر کمرے میں اِدھر اُدھر چکر لگانے لگے۔

ذرخاتون نے جب بڑا سا بانس زور سے زمین پر مارا تو وہ کسی نہ کسی طرح اُس بڑے سوراخ کے راستے باہر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ مگر اس سارے عمل میں دس پندرہ منٹ تو ضرور لگے ہوں گے۔ اس دوران گھر کا مالک بچوں کا باپ بھی وہاں پہنچ چکا تھا اور غصے سے دھاڑ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ان بیوپاریوں کے خلاف جو گندم کے بروقت سودا ہونے کی رکاوٹ بن رہے تھے اور اِن چوہوں کے خلاف مغلظات کا طوفان ابل رہا تھا۔'' پانچ دس ہزار روپے کا نقصان تو کر ہی دیا ہوگا اِن کم بختوں نے۔'' وہ روہانسا ہو گیا۔

ادھر لڑکی اُسی ڈانگ سمیت گھر سے باہر بھاگ گئی۔ وہ چوہوں کے بل تک پہنچنا چاہتی تھی تا کہ ان کا مار مار کر قیمہ ہی تو بنا ڈالے۔ وہ بھاگتے بھاگتے گھر سے بہت دور نکل گئی تھی۔ جہاں جا بجا خاردار جنگلی جھاڑیاں یا گرمی کے مارے ہوئے کچھ خود رو درخت تھے۔ وہ تھک ہار کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئی اور زور زور سے گریہ وزار کرنے لگی۔

''اے اللہ ہم نے ان چوہوں کا کیا کیا بگاڑا تھا جو انھوں نے ہم پر یہ ظلم توڑ دیا۔ ہم تو پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ لگتا ہے ہم اس دفعہ اسکول بھی نہیں جا سکیں گے۔ خدا غارت کرے ان کو، اب کیا ہوگا۔ اے اللہ تو ہمارا یہ نقصان پورا کر دے۔ یہ تو ظالم اور کم عقل جانور ہیں۔ ان کو کسی کے دکھ سکھ سے کیا لینا دینا۔ اے اللہ ہماری مدد فرما۔''

دوپہر سر پر اور لڑکی کو رتی بھر احساس نہ رہا تھا کہ وہ تن تنہا گھر سے بہت دور جنگل میں اکیلی نکل آئی ہے۔ جب تھوڑا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ پریشان ہو گئی اور گھر واپس جانے کا سوچنے لگی۔ ابھی وہ اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ اسے اپنے سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر جھاڑیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ جھاڑیاں تیزی سے ہل رہی تھیں اور یہ آواز درخت کی کھوہ میں جا کر ختم ہو جاتی تھی۔

لڑکی کا تجسس بڑھا تو اس نے دبے پاؤں کچھ آگے بڑھ کر نظر دوڑائی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ حیرت سے چیخ پڑی کیونکہ وہاں سرسراہٹ انہی چوہوں کے آنے جانے کی وجہ سے ہو رہی تھی جو اس کے گھر میں صبح گھس آئے تھے اور اب...... اب ایک بل سے نکل کر اپنے اپنے منہ میں ایک ایک نیلے رنگ کا کرنسی نوٹ دبا کر باہر لا رہے تھے اور وہیں درخت کی کھوہ کے قریب

رکھتے جا رہے تھے۔ چوہے اور نوٹ پہلے تو بچی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا مگر یہ سب خواب نہیں حقیقت تھا۔ اور نوٹ دیکھ کر جب وہ فرطِ حیرت سے اچھلی تو آہٹ پاتے ہی سارے چوہے بل میں غائب ہو گئے اور اپنا اپنا نیلا نوٹ وہیں چھوڑ گئے۔ مگر یہ کیا وہ دو عدد ست الوجود سیاہ فام چوہے اب بھی تیزی سے بھاگ نہ سکے تھے۔ نوٹ ان کے منہ سے گر پڑے۔ لڑکی جوان کو مار ڈالنے کے درپے تھی۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جا گرا۔ اِس نے گھبرا کر چوہوں کی طرف دیکھا اب وہ انھیں مار ڈالنے کی بجائے اِن سے متاثر سی کھڑی تھی کہ اسے ان کی چیں چیں کی آوازیں سنائی دیں۔ گویا وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ پھر وہ دونوں بھی بل میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔

☆☆☆

”آئی...... بابا...... کدھر ہو تم لوگ؟“ لڑکی دیوانوں کی طرح گھر کی طرف بھاگ رہی تھی اس کے دونوں ہاتھوں میں کڑکتے ہوئے نیلے نوٹ لہرا رہے تھے۔ وہ مسلسل ماں باپ کو آوازیں دے رہی تھی۔ آخر کار گھر پہنچ کر اس نے بغیر دم لیے ماں باپ کے سامنے جو دالان میں پہلے ہی اس کے لیے فکر مند بیٹھے تھے۔ نیلے نیلے نوٹ بکھیر دیے اور چلا چلا کر بولی۔

”یہ لو بابا تمہارا گندم کا نقصان پورا ہو گیا۔ دیکھو میں کتنے سارے پیسے لے کر آئی ہوں۔ اب ہم ریل کا کرایہ بھی ادا کر سکیں گے اور کوئٹہ پہنچ کر نئے سال کی نئی کتابیں کاپیاں بھی خرید لیں گے۔ ہماری فیس بھی ادا ہو جائے گی۔“

وہ اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور ماں نے پکڑ کر اسے فرش پر بٹھا دیا۔ وہ نوٹوں کی بجائے بیٹی کی طرف متوجہ تھے۔ اور اس کے خود ہی واپس آ جانے پر خدا کے شکر گزار تھے۔ وہ صبح ہی سے اسے مسلسل ڈھونڈ رہے تھے مگر وہ کہیں نہ ملی تھی۔ مگر جب وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے تو وہ خود ہی کہیں سے چلی آئی تھی اور وہ نہ صرف واپس آ گئی تھی بلکہ اپنے ساتھ بہت سے روپے بھی لے کر آئی تھی۔ لڑکی نے انھیں بتایا کہ یہ بہت سارے نوٹ اسے سامنے جنگل میں موجود ایک درخت کی کھوہ میں موجود انہی چوہوں نے دیے ہیں جو صبح ان کے گودام میں گندم چوری کرنے آئے تھے۔ ماں باپ کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ مگر نوٹ بالکل اصلی تھے۔ اور بینک دولت پاکستان کے تصدیق شدہ نیلے رنگ کے ایک ہزار کی مالیت کے کرنسی نوٹ۔ پورے دس نوٹ یعنی دس ہزار روپے۔

باپ نے کہا ہمارے یہاں اردگرد کوئی بینک یا دکان بھی نہیں ہے جہاں سے اس نے یہ نوٹ چرائے ہوں۔ اسے کچھ کچھ لڑکی کی بات پر یقین بھی آ رہا تھا کہ شاید لڑکی کو کسی غیر مرئی طاقت نے یہ دولت تحفے میں دی ہو۔ مگر دینے والے تو چوہے تھے۔ پھر بھی اس نے بیٹی سے کہا۔

”تم مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں سے تم یہ نوٹ لے کر آئی ہو۔ وہ باپ کو ساتھ لے کر ٹھیک اسی راستے پر چل پڑی جہاں سے اسے یہ نوٹ ملے تھے۔ جب باپ بیٹی ٹھیک اسی درخت کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ واقعی وہاں پر ایک کھوہ ہے جس کے اندر باہر بہت سارے چوہے آ جا رہے تھے۔ مگر یہ کیا۔ ٹھیک اس جگہ پر جہاں سے لڑکی کو نوٹ پڑے ملے تھے۔ دو موٹے تازے سیاہ چوہے مرے پڑے تھے۔ جی ہاں وہی ست الوجود سیاہ فام فربہ اندام مہربان چوہے...... اور مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ وہاں پر ایک بار پھر ایک ہزار روپے کی مالیت کے پورے پانچ نیلے کڑک دار نئے نوٹ موجود تھے۔“

جب ماں بیٹی اپنا قصہ ختم کر چکیں تو باپ نے پہلی بار کہانی میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”بائی صاب! حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مجھے ریل کے کرائے بچوں کی فیسوں، کتابوں کاپیوں اور دیگر اخراجات کے لیے فوری طور پر کوئی پندرہ ہزار روپے ہی درکار تھے۔“

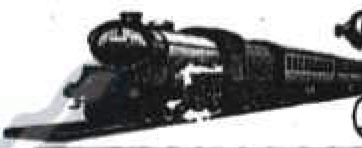
گاڑی پوری رفتار سے اپنے سفر پر گامزن تھی مگر میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ خدا کی قدرت پر نثار ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔

رب کے کھیل نرالے ہیں۔ وہ سب کی سنتا ہے اور اپنا کام کسی بھی صورت، کسی کو بھی وسیلہ بنا کر کر دیتا ہے۔ سبحان اللہ۔

☆☆☆

دوسرا انوکھا رنگ

مقدر کا سکندر



نزہت ناز

قسمت نے اُس سکندر کو مقدر کا سکندر بنا دیا

زندگی کی کچھ یادیں بہت کربناک ہوتی ہیں۔ خوشی اور غم، دکھ اور سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ زندگی کی ریل گاڑی گزرتے سالوں کے ساتھ مختلف پلیٹ فارم پر رکتی ہے۔ پھر چل پڑتی ہے۔ آج ذکر ہے اس ہونہار بچے کا جس نے 17 فروری 1969ء کو ضلع دادو کے نواحی گاؤں ''پھلجی اسٹیشن'' کے زمیندار گھرانے میں ''محمد رمضان'' کے گھر میں آنکھ کھولی۔

بیٹے کی پیدائش پر پورے گاؤں میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں اور تمام ہاریوں کو جو زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے، کپڑے تقسیم کیے گئے۔ پہلی بیٹی کلثوم کے بعد محمد سکندر کی پیدائش پر محمد رمضان بہت خوش تھے۔ محمد رمضان زمیندار تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا ان کی زمینیں سنبھالے اور جانوروں کی دیکھ بھال کرے۔ چنانچہ بچپن ہی سے اس کی ٹریننگ شروع کردی گئی اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ جانوروں کی دیکھ بھال کا کام بھی محمد سکندر کے سپرد کر دیا گیا۔

1985ء میں سکندر نے گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول پھلجی اسٹیشن سے امتیازی نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد سکندر پڑھنے کے لیے شہر جانا چاہتا تھا لیکن محمد رمضان اُسے جانوروں کی دیکھ بھال پر مجبور کرتے اور صبح ہی صبح ساری بھینس اور ڈھور ڈنگر سکندر کے حوالے کرتے کہ ان کو چراؤ۔ سکندر ڈنڈا لے کر جانوروں کو ہانکتا نکل جاتا اور جانور زمینوں پر چرتے رہتے۔

ایک دن شام کو ایک بھینس واپس نہیں آئی۔ جب محمد رمضان نے سختی سے سکندر سے پوچھا کہ تم نے بھینس کی رکھوالی کیوں نہیں کی۔ تو اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا کہ اس کا اس کام میں دل نہیں لگتا۔''

بس پھر کیا تھا سکندر کی خوب پٹائی ہوئی یہاں تک کہ دائیں ہاتھ کی کلائی ٹوٹ گئی۔ سکندر کراہتا رہا لیکن محمد رمضان کو غصے میں کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔

محمد سکندر کو بچپن میں ہی ان کی پھوپی اماں حاجرہ نے گود لے لیا تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔

سکندر روتا رہا اور اس نے اپنی پھوپی کو بتایا کہ اب میں یہاں نہیں رہ سکتا شہر جا رہا ہوں۔''

اماں حاجرہ نے سکندر کو سمجھایا اور اس کی ضد کے آگے ہار گئیں۔ آخر بچے کو انھوں نے کچھ پیسے جوان



کے پاس تھے دے کر کہا۔

”جاؤ بیٹا اللہ تمہاری حفاظت کرے۔“

سکندر نے راتوں رات کوٹری کی ٹرین پکڑی اور پھلجی اسٹیشن چھوڑ دیا۔ کوٹری پہنچ کر محمد سکندر اپنے دوست کے گھر گیا وہاں دوست کی مدد سے اسے ایک ٹیکسٹائل مل میں ہیلپر کی جاب مل گئی۔ چار سال محمد سکندر نے خوب دل لگا کر کام کیا آخر کار اس کی ترقی ہوگئی اور 1990ء میں وہ فورمین بن کر نوری آباد آ گیا۔ یہاں اس کے چند اچھے دوست بنے اور پڑھائی کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ آخر کار اس کی مزید ترقی ہوئی اور اس کی پوسٹنگ فضل مل کراچی میں ہوگئی۔

یہاں آ کر سکندر نے اسٹیل مل میں درخواست دی تو پائپوں پر کلر کرنے کے لیے پینٹر کی ضرورت تھی اور سکندر کا انتخاب ہوگیا۔

1992ء میں اسٹاف Access ہونے کی وجہ سے اسے اسٹیل مل سے نکال دیا گیا۔ محمد سکندر بہت پریشان ہوا۔ آخر اس کا ایک دوست اسے وزیر تعلیم کے پاس لے گیا۔ وزیر تعلیم نے سکندر کی تعلیمی قابلیت اور صلاحیت دیکھتے ہوئی پرائمری ٹیچر کی حیثیت سے اس کا تقرر کر دیا۔

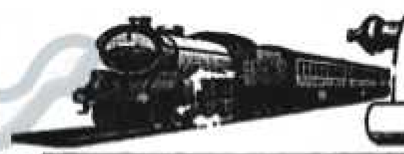
اب محمد سکندر نے ایم اے، ایم ایڈ کر لیا ہے اور ایک تعلیمی ادارے میں 17 گریڈ کے عہدے پر فائز ہے۔

محمد سکندر کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہے۔ اپنی ہمت اور کوششوں سے اور اچھے دوستوں کی مدد اور اللہ کی رضا سے آج وہ ایک مقام پر ہے۔ حقیقت ہے کہ زندگی کی ٹرین کا سفر خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو اگر ہم ہمت اور محنت سے کام لیں اور اللہ سے مدد مانگیں تو مدد ضرور آتی ہے اور اللہ اپنے بندوں کے ذریعہ بہترین مدد کے ساتھ کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی زندگی کی ٹرین کو بہ احسن وخوبی منزل تک پہنچائے جہاں اس کی رضا اور انعام واکرام ہمارا مقدر بنے۔ آمین۔

☆☆☆

تیسرا انوکھا رنگ

دیوانہ



سید عامر حسین

ریل کے سفر میں ملنے والا وہ دیوانہ آج بھی مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے

کچھ سفر ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ یاد رہ جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں میں حیدر آباد سے لاہور جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر ایک شخص ایک پاگل مگر خوبصورت لڑکے کو ہمارے حوالے کر گیا کہ اس کو ''اوکاڑہ'' اتار دینا۔ وہ لڑکا میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ کبھی زور زور سے ہنستا تو کبھی رونے لگتا، کبھی ٹرین سے چھلانگ لگانے کی کوشش کرتا، اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی جس میں اس کی ایک تصویر اور کپڑے کا ایک جوڑا تھا۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔ کسی نے کہا کہ یہ لٹیرا ہے اور بہروپ بھر کر آیا ہے۔ کسی نے اسے سرکاری ایجنسی کا آدمی قرار دیا کسی نے اسے مظلوم کہا، مگر میرا دل کہتا تھا اس کے ساتھ یا تو کوئی حادثہ ہوا ہے یا یہ کوئی گہری روحانی چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ بہر حال میں نے اس کو کھانا کھلایا اور پیار سے سمجھایا کہ وہ آرام سے بیٹھے میں اسے اس کے گھر پہنچا دوں گا۔ وہ آہستہ آہستہ مجھ سے مانوس ہوتا گیا۔

جب میں نے اس سے اس کے ماضی کے بارے میں پوچھا تو اس نے ٹوٹی پھوٹی پنجابی اور اردو میں اپنی کہانی سنائی جسے میں اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ شاید میرے بہن بھائی اس سے سبق حاصل کریں۔

میرا نام رستم خان بلوچ ہے۔ میں اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ میرے والد کا نام اللہ دتہ ہے۔ میں پیشے کے اعتبار سے کسان ہوں۔ میرے والد نے کچھ عرصے ایک زمیندار کے ہاں جابری (منشی) کا کام بھی کیا تھا۔ زمیندر کی پچاس کلے زمین تھی۔ میں نے اپنی زمین پر ٹریکٹر کی ڈرائیوری سیکھی تھی۔ گھر میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے معاش بھی میرے ہی ذمہ تھا اس لیے گھر کا خرچہ اور اپنا خرچہ چلانے کے لیے میں زمیندار کے پاس ڈرائیور لگ گیا۔ زمیندار مجھے پانچ سو روپے ماہانہ کھانے پینے کے علاوہ ہر فصل پر دو من اناج بھی دیتا تھا مجھے اس نے اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔ اس کی بیٹی رضیہ بھی میری بہن بنی ہوئی تھی۔ زمیندار کا ایک گہرا دوست تھا جس کی بیٹی رضیہ کی سہیلی تھی اور اکثر اپنے باپ اور سہیلی سے ملنے آیا کرتی تھی ایک دن میں کھیتوں میں ٹریکٹر چلا رہا تھا اور ہلکی آواز میں کوئی گیت گنگنا رہا تھا شاید اس وقت اس نے میرا گانا سن لیا شام کو جب میں حویلی پہنچا تو وہ چوبارے پر آ گئی۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی مگر میں اسے دیکھ کر گھبرا گیا تھا وہ عجیب لڑکی تھی اسے کسی کا خوف نہیں تھا وہ مجھ سے گانا سننے آئی تھی۔ اس کے اصرار پر میں نے اس سے کہا ''اچھا اب تو جا کل یا بار سنا دوں گا۔'' یہ سن کر وہ چلی گئی۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی اس کے بعد ہم روزانہ ملنے لگے، پہروں بیٹھ کر ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے۔ اگر ہم

ایک دو روز نہیں ملتے تو ایسا لگتا جیسے صدیوں بعد ملے ہوں۔ اس سے ہی مجھے پتا چلا کہ وہ ذات کی شیخ اور آٹھ جماعتیں پاس تھی جبکہ میں بلوچ اور تین جماعتیں پاس تھا۔

وہ آخری بار مجھے بس اسٹاپ پر ملی اور کہا کہ ''میں جلدی واپس آؤں گی میرا دل یہاں سے جانے کو نہیں چاہ رہا مگر مجبوری ہے۔''

مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہم اب ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ ایک مہینے تک نہیں آئی میں نے اس کا بہت انتظار کیا ایک مہینے بعد ''رضیہ'' کے پاس اس کا خط آیا۔

رضیہ نے مجھے بتایا کہ ''جنی (جنی اس کا پیار کا نام ہے اصلی نام جنت ہے) کی شادی فیصل آباد میں ہوگئی ہے۔'' یہ سن کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بھاری چٹان میرے دل پر آگری ہو۔ اس کے بعد میرا دل اس دنیا سے اٹھ گیا۔ پتا نہیں میرے دل کو کیا ہوگیا تھا میں محبت پر یقین نہیں رکھتا تھا مگر جب میرے دل پر گزری تو پتا چلا۔ میں نے زمیندار کے پاس سے کام بھی چھوڑ دیا تھا اور واپس اپنے گھر آگیا تھا۔ لوگ مجھے پاگل کہنے لگے اور دوسروں کی باتوں میں آکر میرا باپ مجھے لاہور پاگل خانے لے گیا اور وہاں چھوڑ کر خود واپس آگیا۔ جہاں میں چار دن رہا ان دنوں میں تو مجھے ایسا لگا جیسے میں واقعی پاگل ہوگیا ہوں کیونکہ وہاں کے پاگل سارا دن ساری رات چیختے تھے۔ کوئی سیٹیاں یا باجے بجا رہا ہے۔ کوئی لڑ رہا ہے۔

چار دن ٹیکے لگانے کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ اب تم ٹھیک ٹھاک ہو اور گھر جا سکتے ہو۔''

میں لاہور میں اپنے نانا کے پاس گیا مگر نانا نے مجھے پاگل کہہ کر گھر سے نکال دیا۔ میں ویسے ہی دنیا اور گھر سے بیزار تھا نانا جان اور دیگر خاندان کے اس رویے سے میں اور دل برداشتہ ہوگیا اور اپنے ایک پنڈ والے کے ساتھ کراچی آگیا۔ کراچی میں پندرہ دن کھدائی کا کام کیا (اس نے مجھے ہاتھوں اور چھالوں کے نشان بھی دکھائے) پندرہ دن کی تنخواہ تقریباً سات سو روپے بنی جو میرے پنڈ والے نے مجھ سے لے لیے اور مجھے حیدر آباد چھوڑ کر خود بھاگ گیا۔ وہاں میں دو دن بھوکا پیاسا در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ کئی بار چاہا کہ خودکشی کرلوں مگر پتا نہیں کیوں رک گیا۔

اب حیدر آباد سبزی منڈی میں مجھے ایک مولوی صاحب نے چندہ کر کے ٹکٹ دلایا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جنت سے کبھی دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ ہاں میں ایک بار زمیندار سے ملنے گیا تو رضیہ نے بتایا کہ جنی آئی ہوئی ہے اور تم سے ملنا چاہتی ہے مگر میرے منع کرنے کے باوجود وہ مجھ سے ملنے چلی آئی اور رونے لگ گئی اور اس نے خدا کی قسم کھا کر کہا میرے والدین کو کسی نے بتا دیا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں تو انہوں نے میری زبردستی شادی کردی۔

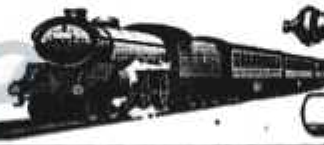
''رستم خان تو اپنی کہانی سنا کر پھر ہنسنے لگا اور پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا تھا مگر میں اب تک یہ سوچ رہا ہوں کہ اس کو پاگل بنانے میں قصور کس کا ہے؟ والدین اور خاندان والوں کا، دنیا اور زمانے کا، یا اس لڑکی کا جس کی وجہ سے وہ پاگل ہوا۔

☆☆☆



چوتھا انوکھا رنگ

ایک رشتہ مہک رہا ہے



مومینہ بتول

آزادی کے وقت لٹی پٹی ٹرین کی اسٹیشن پر آمد ہوئی اور ایک رشتہ بن گیا

اس تلخ اور دل خراش داستان کا سبب۔ اللہ کی رحمتِ خاص ہماری جائے اماں، ہماری دھرتی ملنے کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا۔

1947ء کا ہی کا زمانہ تھا جب مسلمان کئی کئی صعوبتیں، جان و مال' آبرو، اولاد گھر بھر کی خون ریزی قربانی کے بعد تشکر احسان اٹھائے پلیٹ فارم کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اپنی سرزمین، اپنی دھرتی پر جانے کے لیے بے تاب۔ لٹے پٹے مہاجرین، جن کی عظمت کو آج بھی سلام کہ، سب کچھ لٹا کر بھی دل و جان سے مطمئن صرف اسلام کے نام پر حاصل کیے ملک پاکستان کی طرف دوڑ رہے تھے۔

ان ہی میں میرے پاپا بھی شامل تھے جو بس اپنے بڑے بہنوئی کے ساتھ، مسلمانوں کی ٹرین کے ساتھ واہگہ سے لاہور کی سمت سفر کرتے، اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرتے کہ اس وقت زورِ بازو جواں تھے، ہمتِ مرداں، اسلام کے نام پر جو خدمت میسر آتی۔ وہ لٹے پٹے قافلوں والوں کے لیے کرتے۔ کبھی ان کے زخموں کی مرہم پٹی کرواکر، کبھی ان کا سامان اُتارتے کبھی بھوکے بچوں کے لیے، دودھ روٹی، پانی کا انتظام کرتے، غرض راستے میں جو بن پڑتا وہ اور دیگر اسی طرح حوصلہ دیتے، سہارا دیتے، آخر لٹ پٹ کر سرزمین لاہور تک آ ہی پہنچتے تھے۔

جس وقت لٹی پٹی ٹرین، لاہور پہنچتی۔ مسافروں کو منزل تک پہنچا کر، روانہ ہورہی تھی۔ تب واپس جاتے ٹرین میں چڑھتے اچانک ہی ایک مدہم، اُمید بھری، آواز' رونے جیسی آواز سنائی دی تھی۔

''میرا بیٹا ارے وہ رہا میرا بچہ۔'' اور بس پھر ٹرین نے رفتار پکڑلی۔ انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ چاروں طرف خون میں نہائے بھوکے پیاسے مہاجرین خالی ہاتھ خالی پیٹ حدِ نگاہ ہجوم، نارسا، وہ پکارنے والے کو دیکھ نہ سکے مگر وہ امید بھری آواز۔ وہ بچھڑ کر مل جانے والی کیفیت' وہ ماں باپ کا تڑپ کر انھیں پکارنا، پورے راستے پریشان کرتا رہا۔ حالانکہ جس جس طرح کے دل خراش واقعات وہ دیکھ چکے تھے وہ اسی الگ خون رنگ داستاں تھی مگر اُس مامتا کی آواز میں یا باپ کی پکار میں ایسا کچھ تھا کہ وہ اپنے واپسی کے سفر کو اپنی غلطی تسلیم کرنے لگے حالانکہ ابھی دوسرے دن پھر یہی ٹرین اپنے فراخ سینے میں تشنہ کام لوگوں کو لے کر سرزمین پاکستان پہنچنے والی تھی۔ وہ رات وہ، سوچ وہ پکار۔



سندھ میں مدد کرنے کے لیے آواز دینے والی اس عورت کی آواز ثابت ہوگئی تھی جس کی صدا پر لبیک کہتا محمد بن قاسم سرزمین سندھ کو دوڑتا چلا آیا تھا۔ تقدیر ایک حسین ملاپ کا انتظام کرچکی تھی۔ لہٰذا اپنے پورے خاندان کے باوجود جو کہ ہجرت نہیں کررہا تھا کو چھوڑ کو وہ اس ماں تا کی داستان سننے کا فیصلہ کرچکے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن وہی منظر تھا۔ وہی سکھوں کی کرپانیں، جو خون مسلم چاٹ رہی تھیں۔ وہی خون میں نہائے تربتر، چھپتے چھپاتے مہاجرین، وہی ملٹری جوانوں کے ساتھ رضا کار اور ان رضا کاروں میں شامل میرے والد محترم کتنی مشکلوں کے بعد ٹرین پھر لاہور پہنچی تو لٹے پٹے مہاجرین نے سجدہ شکر بجالائے۔ لوگ ابھی بھی بے آسرا بے مددگار بیٹھے تھے۔ کچھ لوگوں کو راتوں رات کیمپ منتقل کردیا گیا تھا۔ کچھ وہیں تھے اب تلاش آواز شروع کی گئی۔ کوئی سرا کوئی Clue نہ تھا۔ نہ کوئی پہچان، نہ کوئی شناخت، بس دل کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے ان مسافروں کی دادرسی شروع کردی گئی، لوٹ کر انڈیا نہ گئے۔ پندرہ سے بیس دن بعد وہ دوسرے مہاجروں کی طرح لاہور سے کراچی چلے آئے۔ اب بھی وہی منظر تھا۔ وہی ریل گاڑیاں، سٹی اسٹیشن کا جنکشن، وہی تباہ حال مسافر، وہی اقامت کا مسئلہ، وہی لوگوں کا اژدھام، اور ایک بار پھر، وہی ممتا بھری دردناک آواز اس بار بہت قریب سے سنائی دی ہے۔

''آہ میرا بچہ...... بچاؤ اس کو گولی لگی تھی، یا اللہ تیرا شکر میرا ـــ بیٹا زندہ ہے مجھے ملا دیا تُو نے۔'' وہ تیزی سے پلٹے۔ اک بکھرے بالوں، پھٹے کپڑوں میں ملبوس خاتون جس کے سینے پر لگی گولی نکالی جاچکی تھی اور پٹی کے بعد بھی وہ خون خون ہورہی تھی وہ دیوانہ وار لوگوں کو چیرتی اپنے زخم کی پروا نہ کرتی ان کے گلے آ لگی۔ انھوں نے اس عورت کو تھام لیا جو بے ہوش ہوچکی تھی مگر اس طرح کہ اس کے ہاتھوں میں والد محترم کا ہاتھ تھا۔ لوگ باگ جمع تو تھے ہی اور قریب آ گئے بھی ایک نو دس سالہ خوف زدہ سی بچی اماں اماں کہتی اس عورت کے پاس آ گئی تھی۔ خون پھر بہنا

شروع ہوگیا تھا لہٰذا وہ دیگر رضا کاروں کی مدد سے ان ماں بیٹی کو قریبی قائم ڈسپنسری میں لے گئے پھر اسی پلیٹ فارم کے قریب سٹی اسٹیشن پر قائم عارضی ڈسپنسری میں وہ خاتون ہوش میں آنے کے بعد اپنی لہو لہو داستان سنا رہی تھیں کہ وہ اور ان کا اکلوتا بیٹا بیٹی اور شوہر بلوائیوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔

''بولو مہان ہندوستان، (آگے گالی) پاکستان۔''

''نہیں یہ کبھی نہیں ہوسکتا جس ملک کو قائداعظم سمیت ہزاروں لوگوں نے جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا اور اللہ کے نام پر حاصل کیا۔ اسے گالی نہیں دیں گے۔'' ان خاتون کا نوعمر بیٹا جوش میں چیخا۔

''ہاں مگر قائم پاکستان زندہ باد پاکستان اور پھر گولیاں میرا بچہ میرے سامنے میرے ہاتھوں میں میرے خون بھرے سینے سے آ لگا اک گولی یہ دیکھو۔ مجھے بھی لگی ہے جانے شوہر کس سکھ کی کرپان کا لقمہ بنے۔ بس یہ بچی...... شاید اس کی زندگی باقی تھی جو زخمی ہوئی نہ بچھڑی۔ لیکن خدا گواہ ہے میری مامتا جھوٹ نہیں بولتی۔ تم ہو بہو میرے بیٹے کی کاپی ہو، وہی لمبا قد وہی جاندار صحت وہ ہی تمہاری طرح سنہری چمکتی رنگت، جس کی وجہ سے اسے اصل نام کے بجائے، ہم بھورو کہہ کر بلاتے تھے۔ وہی شربتی بادامی آنکھیں اب تم میرے بیٹے ہو۔ خدا نے میری مامتا کو سکون دینے کے لیے تمہیں ہم سے ملایا۔ خدا کے لیے مجھے نہ چھوڑنا۔''

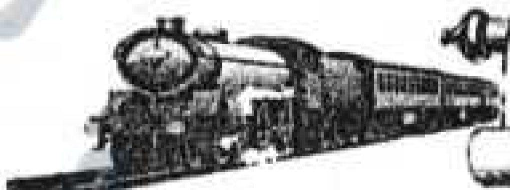
اور پھر انھوں نے ایک بیٹے کی طرح بلکتی ماں کو یقین دلایا کہ آج سے وہ ان کے بیٹے ہیں ان کے بھورو، اتنے میں سٹی اسٹیشن اور وہاں کے لوگ اور وہ پلیٹ فارم گواہ بن گئے۔ امین ہو گئے ایک ماں اور بیٹے کی لازوال محبت کی داستان کے۔ پھر وقت نے دیکھا انھوں نے کس طرح ایک بیٹا بن کر اس حرماں نصیب ماں کی خدمت کی۔ علاج معالجہ سے لے کر جھگی الاٹ کروانے کے بعد اعلیٰ خاندان کا پڑھا لکھا چشم و چراغ اپنا اور اپنی ماں بہنوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کراچی کی سڑکیں ناپ رہا تھا، پسینہ بہا کر مزدوری کر کے رات کو پیٹ بھرنے کا انتظام علاج معالجہ، گھر کا انتظام کرنا بہن کی حفاظت کرنا، اور ان کے ساتھ دوسروں کی خدمت بھی۔ خدمت رنگ لائی لوگوں نے بغیر ووٹ دیے انھیں اپنا رہبر تسلیم کر لیا اب ان کی اولین خواہش تھی کہ سٹی اسٹیشن پر قائم جھگی نشینوں کو کسی بھی علاقے میں اراضی دی جائے۔ سو انھوں نے نئے نئے بننے والے محکمے تک رسائی حاصل کی تعلیم یافتہ تھے۔ قانونی سقم جانتے تھے سو جداگانہ جدوجہد کے بعد وہ اک بستی جہاں تمام مہاجروں کو گھر الاٹ کیے گئے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور اس نئی بستی کے صدر منتخب ہو کر فلاحی کام انجام دیے۔ اور اس ایک مامتا پر اپنے تمام رشتے قربان کر دیے۔ حتیٰ کہ گھر بسانے پر والدہ محترمہ سے بھی یہی وعدہ لیا کہ خون کا رشتہ نہ سہی مگر محبت کا جو بندھن انھوں نے باندھا ہے بحیثیت بہو انھیں بھی اس رشتے کو قائم رکھنا ہے۔

اور آفرین ہے میری فرشتہ صفت والدہ محترمہ کو کہ انھوں نے ایک ساس اور نند کی دل و جان سے خدمت کی اسے پڑھایا لکھایا گھریلو کاموں میں طاق کیا اور مرتے دم تک بیمار پڑ جانے والی ساس کو سنبھالا۔ ان کی بیٹی کو ہم تمام بہن بھائیوں پر فوقیت دی۔ اچھے گھر میں رشتہ کیا اور آج اتنا عرصہ گزر گیا جبکہ وہ زندہ رہے نہ دادی اور پھوپھو مگر میری ماں اپنے شوہر کی طرح احترام واہتمام کر رہی ہیں۔ نور جہاں پھوپو کے بچوں کا اسی طرح خیال کیا جاتا ہے جیسے کسی ننھیال میں بچوں کا، آج میرے والد محترم کے لگائے اس گلشن میں ہم ہماری اولاد سب شیر شکر ہیں۔ بلکہ ہمارے بعد کے بچوں کو یہ علم نہیں کہ دادی اور پھوپو کے بچوں سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں مگر زندگی کے پلیٹ فارم پر قدرت نے جس محبت سے یہ نیا رشتہ قائم کیا تھا۔ اس رشتے کی آبیاری اسی طرح کی گئی ہے کہ آج بھی وہ گلشن مہک رہا ہے اور امید ہے کہ یہ محبت کا سفر آگے کئی نسلوں تک ریل کی پٹریوں کی طرح سنگ سنگ چلتا رہے گا پلیٹ فارم کی اس شجر کاری کا ہر گل مہک رہا ہے۔

☆☆☆

محبت اور نفرت کی دھیمی دھیمی آنچ
میں لو دیتی ہوئی شعلہ ساماں تحریریں

میرا دامن تار تار



سعدیہ سیٹھی

لندن سے بطورِ خاص اُس دوشیزہ کی داستانِ الم جسے ایک عامل نے ڈس لیا تھا

ہم لوگ بھی عجیب لوگ ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں لٹتے ہیں، ٹی وی شوز کر کے ان کی دھوکے بازی سے پردے اٹھاتے ہیں۔ اخبارات میں انہی کے اشتہارات چھاپتے ہیں، الیکٹرونک میڈیا پر بھی اُن کی پبلسٹی کرتے ہیں۔ مارننگ شوز میں اُن کے کرشمے دکھا کر سادہ لوح عوام کو بے وقوف بناتے



ہیں۔شہر کے متوسط علاقے میں میرا گھر ہے۔خدا نے مجھے اپنی تمام نعمتوں سے نوازا ہے اور دو بچے ہیں اور بہت اچھے اور سلجھے ہوئے شوہر ہیں۔میں بھی ایسے ہی ایک عامل کی ڈسی ہوئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ میری کہانی سے دوسروں کو سبق ملے اور کوئی بھی ان ڈھونگی عاملوں کے چکر میں نہ پڑے۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں، میرے والد ایک چھوٹے کاروباری انسان تھے یوں ہمارا گزر بسر بہت اچھی طرح ہو رہا تھا۔میری والدہ بہت نرم خو خاتون تھیں۔

دونوں ماں باپ میں بہت محبت تھی اور میری پرورش بھی بہت محبت سے کی جا رہی تھی۔پھر وقت بدلا اور میری ماں چند دن بخار میں رہ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔میں اور ابا اکیلے رہ گئے۔ابا اپنا سارا وقت اپنے کاروبار کو دینے لگے اور جب گھر آتے تو مجھے اپنی نظروں کے سامنے رکھتے۔میں انہی کے ساتھ سوتی تھی۔صبح وہ مجھے تیار کر کے اسکول چھوڑتے ہوئے کام پر چلے جاتے دوپہر میں مجھے لیتے ہوئے گھر آتے۔گھر کے کام کاج کے لیے محلے کی ایک بیوہ خاتون موجود تھیں۔میں سارا دن بی بی کے ساتھ رہتی رات میں ابا کے ساتھ کھانا کھا کر اپنا ہوم ورک چیک کرواتی اور وہ میرا کام دیکھ کر خوش ہوتے اور روز مجھے ایک چاکلیٹ دیتے مگر اس شرط پر کہ میں یہ چاکلیٹ صبح کھاؤں گی اور میں ایسا ہی کرتی۔

ہمارے کچھ رشتے دار جو ہم سے کبھی کبھی ملتے تھے اب روز چکر لگانے لگے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ ابا خاندان کی کسی خاتون سے شادی کر لیں۔

مگر میرے ابا کسی طور تیار نہ تھے وہ ایک مال دار خوش شکل انسان تھے۔خاندان میں جس کو ضرورت ہوتی خوب مدد بھی کرتے تھے مگر وہ مجھ پر سوتیلی ماں مسلط کرنے کے حق میں نہیں تھے۔اس وقت میری عمر سترہ سال تھی جب ابا نے اپنی فیکٹری میں ایک نیا سپروائزر رکھا۔وہ بہت شریف النفس انسان تھے۔اُن کی دو جوان بیٹیاں تھیں۔اُن کی نیک نیتی اور کام میں دلچسپی نے جلد ہی ان کو ابا کے بہت قریب کر دیا تھا۔وقت تیزی سے گزرتا رہا۔اب زاہد صاحب ہمارے گھر کا فرد ہی محسوس ہوتے تھے۔میں بھی کئی بار ان کے گھر گئی۔ان کی بیٹیاں بہت ملنسار تھیں مجھ سے کچھ بڑی تھیں مگر بہت اپنائیت سے ملتی تھیں۔ان کے گھر کا ماحول بھی بہت سادہ تھا مجھے وہاں جا کر سکون ملتا تھا۔ایک دن زاہد صاحب ابا کے پاس گھر پر آئے وہ بہت خوش تھے اور انہوں نے بتایا کہ ان کی بڑی بیٹی کی جلد بات طے ہونے والی ہے۔

وہ مجھے اور ابا کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ابا نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ مجھے لے کر ضرور آئیں گے۔زاہد صاحب نے ابا سے درخواست بھی کی کہ آپ اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے لڑکے کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔

ابا نے حامی بھر لی۔یوں زاہد صاحب مطمئن ہو کر چلے گئے۔ابا نے کچھ لوگوں سے جب لڑکے کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ عیاش لڑکا ہے اور کسی طور اس قابل نہیں کہ شریف خاندان کی لڑکی اس کے حوالے کی جائے۔زاہد صاحب کے لیے یہ خبر بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی۔ان کے خاندان میں اس رشتے کے حوالے سے بات پھیل چکی تھی۔تیاریاں بھی تقریباً مکمل تھیں۔مگر اس خبر نے انہیں توڑ کر رکھ دیا اور انہیں شدید دل کا دورہ پڑ گیا۔جب ابا کو پتا چلا تو وہ فوراً اُن کی عیادت کے لیے گئے مگر اُن کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔زاہد صاحب چند دن میں ہی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے۔وہ ابا کو دیکھ کر رو پڑے۔

’’میری بچیوں کا کیا ہوگا؟‘‘ وہ نم آنکھوں سے ابا کے سامنے بیٹھے تھے۔

’’زاہد پریشان کیوں ہوتے ہو اللہ نے برے لوگوں سے بچایا ہے آگے بھی وہ ہی کرم کرے گا۔‘‘ ابا نے انہیں تسلی دی۔

’’رحیم صاحب ایک بچی کا رشتہ ٹوٹ گیا مانو اب باقی دوسری کو بھی کوئی اپنے گھر نہیں لے جائے

گا۔ میں کب تک انہیں سنبھالوں گا بن ماں کی بچیاں ہیں میرے بعد اُن کا کیا ہوگا؟'' یہ کہہ کر وہ بلک بلک کر رو پڑے۔ ابا بھی گم صم سے بیٹھے جب انہوں نے اچانک ابا کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ارے زاہد یہ کیا کر رہے ہو؟'' ابا پریشان ہو گئے۔

''رحیم صاحب آپ میری بیٹی سے نکاح کر لیں میری دوسری بیٹی کا بھی مستقبل سنور جائے گا اور میں سکون سے مر سکوں گا۔'' وہ ابا سے التجا کر رہے تھے۔

پھر ابا نے ان سے کچھ وقت مانگا تاکہ وہ مجھ سے بات کر سکیں آخر میں ہی تو اُن کی سب کچھ تھی۔ ساری تفصیل بھی مجھے ابا نے ہی بتائی مجھے زاہد صاحب پر بہت ترس آیا اُن کی بیٹیاں مجھے پسند تھیں پھر وہ بھی میری طرح بن ماں کی تھیں لہٰذا میں نے ابا سے کہہ دیا کہ وہ یہ شادی ضرور کر لیں۔ میں بھی اکیلے رہ رہ کر تھک گئی ہوں۔ ابا میرے جواب سے مطمئن ہو گئے۔

یوں میمونہ میری ماں بن کر ہمارے گھر میں آ گئی۔ وہ مجھ سے چند سال ہی بڑی تھی۔ ابو کی شادی پر جہاں میں خوش تھی وہاں خاندان والوں کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ وہ تو اپنی بیٹیاں ابا کو دینا چاہتے تھے مگر یہاں تو صورت حال ہی بدل گئی۔ مرتے کیا نہ کرتے۔ جھوٹے منہ مبارکباد دینے پہنچ گئے۔ کرید کرید کر میمونہ سے باتیں پوچھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر وہ بہت کم گو تھی ایسے میں انہیں آسان شکار میں نظر آئی اور آہستہ آہستہ انہوں نے میرے دل و دماغ میں میمونہ کے خلاف باتیں بھرنا شروع کر دیں۔ شروع میں تو میں نے توجہ نہیں دی مگر پھر آہستہ آہستہ ان باتوں نے اپنا کام دکھانا شروع کیا۔ میں بلاوجہ ہی میمونہ سے بدتمیزی کرنے لگی ابا کے سامنے تو بہت سیدھی ہی رہتی مگر اکیلے میں اسے بہت تنگ کرتی۔ ایک دن اس نے تنگ آ کر مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

''طاہرہ میری جان مجھ سے کیوں خفا رہتی ہو۔'' میں نے بڑی حقارت سے اس کی جانب دیکھا اور بنا جواب دیے اپنے کمرے میں آ کر زور سے دروازہ بند کر لیا۔

اس کے بعد اُس نے کئی بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار میں نے اسے جھڑک دیا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنی اچھی تھی کہ اُس نے کبھی ابا سے کچھ نہیں کہا حالانکہ ابا اس سے بہت محبت کرنے لگے تھے۔ وہ تھی ہی ایسی خاموش خاموش سی بس کاموں میں مگن رہتی۔

ابا بھی بہت خوش رہنے لگے تھے۔ جلدی گھر آ جاتے پھر ہم دونوں کو لے کر اکثر ہی باہر نکل جاتے، کھانا باہر کھلاتے شاپنگ کرواتے۔ وہ ہم دونوں میں بہت توازن رکھتے تھے مگر میں تو اندر ہی اندر جل رہی تھی۔ مجھے ابا سے بھی حسد ہونے لگا تھا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ پھر ہمارے پڑوس میں نئے لوگ آ گئے اُن کے چار بچے تھے تین بیٹے اور ایک بیٹی بتول۔ بہت لاڈلی تھی اس لیے کچھ سرچڑھی بھی تھی بہرحال میری اس سے جلد ہی بہت اچھی دوستی ہو گئی۔ یہ تو مجھے بہت پسند میں پتہ چلا کہ بتول طلاق یافتہ تھی۔ اُس کی بدزبانی کی وجہ سے اس کے شوہر نے اُس کو طلاق دے دی تھی مگر بتول کو کوئی دکھ نہیں تھا۔ بس اس دوستی کے بعد میری بربادی کے دن شروع ہو گئے۔ پہلے تو میں نے اس کی شہ پر اس کے بڑے بھائی سے خوب فلرٹ کیا پھر محلے کے لڑکوں کو بھی خوب مسکرا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ہم دونوں کمرے میں گھسی ہر وقت الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتیں۔ ایک دن میں سرخ لپ اسٹک لگا کر اور پرفیوم کی آدھی بوتل اپنے اوپر چھڑک کر بتول سے ملنے جا رہی تھی تب میمونہ نے مجھے ٹوکا وہ ویسے تو مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی مگر اس دن میں اُس کی جرأت پر حیران رہ گئی جب اس نے مجھے لپ اسٹک ہلکی کرنے کو کہا۔

''طاہرہ اچھی لڑکیاں اتنی گہری لپ اسٹک نہیں لگاتیں۔''

''تم کون ہوتی ہو مجھے سمجھانے والی۔'' میں نے چلا کر جواب دیا اور دھم دھم کرتی گھر سے باہر نکل گئی۔

رات میں کھانے پر جب ابا نے مجھے بتول کے

گھر جانے سے منع کیا تو میرا دماغ گھوم گیا میں سمجھ گئی کہ میمونہ نے ابا سے میری شکایت لگائی ہے بس اس دن سے میں نے میمونہ کے خلاف محاذ بنالیا۔ اب تو ابا کے سامنے بھی اکثر بدتمیزی کر جاتی تھی۔

میرے دل میں میمونہ کے لیے نفرت پروان چڑھنے لگی اور بتول اس ساری صورت حال کو مزید بگاڑتی۔ میں اس سے گھر کی ہر بات کرتی تھی اور وہ مجھے نت نئے طریقے بتاتی بدتمیزی کرنے کے، میمونہ کو دق کرنے کے اور میں وہ سب کرتی اور بہت خوش ہوتی پھر ایک دن بتول نے مجھے ایک عامل کے بارے میں بتایا جو فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں جاکر اُسے میمونہ کے بارے میں بتاؤں اور میمونہ کو گھر سے بھگادوں۔

''طاہرہ کل پیر ہے جمعرات کو میں تمہیں عامل شاہ جی کے پاس لے جاؤں گی۔ وہ تمہارا کام کردیں گے۔'' ایک دن جب میں اس کے گھر گئی تو اس نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی۔

''لیکن بتول اگر ابا کو پتہ چل گیا تو؟''

''کچھ نہیں ہوتا اور انہیں کیسے پتہ چلے گا۔ ہم لوگ دوپہر کو جائیں گے اور شام تک واپس آجائیں گے۔'' وہ مکاری سے بولی۔

میں تو دل سے چاہتی تھی کہ میمونہ سے جان چھوٹ جائے لہٰذا حامی بھرلی۔ طے یہ ہوا کہ کالج سے واپس آنے کے بجائے بتول میرے پاس آجائے گی اور ہم وہاں سے عامل کے پاس چلے جائیں گے۔ بتول نے مجھے میمونہ کی قمیض لانے کو بھی کہا۔ اگلے دن صبح میں نے ابا کو بتایا۔

''کالج میں میلاد ہے لہٰذا میں مغرب تک آجاؤں گی۔'' وہ مطمئن ہوگئے۔ یوں میرے لیے راستہ کھل گیا۔

دوسرے دن پلان کے مطابق بتول میرے پاس آگئی اور ہم لوگ پیر صاحب کے آستانے کی جانب چل پڑے۔ میرا دل مسرت سے دھڑک رہا تھا کہ واقعی پیر صاحب کوئی ایسا عمل بتادیں گے جس سے میری گلوخلاصی ہوجائے تو لطف ہی آجائے گا۔

پیر صاحب کے آستانے سے تھوڑے فاصلے پر ہم نے اپنے برقعے نکال کر پہن لیے اور ان کے آستانے میں داخل ہوگئے۔ عجیب سی عمارت بنی ہوئی تھی اوپر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ عمارت کے احاطے کے باہر چند افراد آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔ سیڑھیوں سے اوپر پہنچنے کے بعد بتول نے اپنے جوتے اتار دیے۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی اور اس کے بعد ہم ایک دالان نما جگہ میں داخل ہوگئے۔ یہاں ایک بوڑھا سا آدمی خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے قدموں کی آہٹ پاکر اس نے گردن اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور بولا۔

''کیا چاہتی ہو بچیو؟''

''شاہ صاحب کی زیارت کرنا چاہتے ہیں ہم۔''

''یہ وقت تو نہیں ہے ان سے ملنے کا لیکن تم...... تم آئی ہو تو اگر اجازت دو تو میں انہیں اطلاع دے دوں۔''

''ضرور آپ کی نوازش ہوگی۔ ہمیں ان سے ملاقات کا وقت نہیں معلوم تھا۔ لیکن ہم بڑی دور سے آئے ہیں۔'' بزرگ صورت آدمی اُٹھ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر اس نے ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اندر پہنچے تو پر میں نے ایک تنومند شخصیت کو بیٹھے دیکھا۔ لمبی داڑھی تھی بڑی بڑی آنکھیں، سر پہ امامہ اطراف میں امبر سلگ رہا تھا جس کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی میں نے خوامخواہ اپنے دل میں ان کے لیے عجیب سی کیفیت محسوس کی۔

پیر صاحب ہزار دانوں والی تسبیح کے دانے گراتے جارہے تھے اور کچھ پڑھتے جارہے تھے۔ چند لمحات کے بعد انہوں نے تسبیح پر پھونک ماری اور تسبیح ایک طرف رکھ دی۔ پھر ان کی آنکھیں کھلیں۔ بلاشبہ بتول نے غلط نہیں کہا تھا۔ بڑا جلال ہے ان کی آنکھوں میں۔ وہ ہم دونوں کو دیکھنے لگے۔ پہلے اُن کی نگاہیں بتول کی جانب اٹھیں اور پھر میری طرف

اور مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ میں ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکی تھی۔ تب ان کی آواز آہستہ سے ابھری۔

''آگے آؤ بیٹی! تمہارا نام طاہرہ ہے۔'' اس پہلے ہی جملے نے مجھے شدید حیرت میں ڈال دیا تھا۔ میرے دل کو ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا جو شخص اپنے علم سے یہ معلوم کر لے کہ میرا نام کیا ہے وہ معمولی نہیں ہو سکتا۔

''بیٹھ جاؤ میرے سامنے۔'' شاہ صاحب نے کہا اور میں بیٹھ گئی۔ شاہ صاحب دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

''تمہارے مصائب کی داستان طویل ہے ہاں بے شک تمہاری زندگی میں جو بھونچال سوتیلی ماں کی شکل میں آیا ہے اس نے تمہارے دل و دماغ کو تہہ و بالا کر دیا ہے بیٹی انسان بہت بڑا شیطان ہوتا ہے۔ انسان ہی انسان کا دشمن ہوتا ہے ورنہ خدا نے اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ مخلوق میں اور کوئی نہیں ہے جو انسان کو نقصان پہنچا سکے۔ لیکن جب انسان ہی انسان کا دشمن بن جائے تو پھر وہ تکلیفوں کا شکار کیوں نہ ہو۔'' شاہ صاحب نے تو میرے سارے دکھ میرے سامنے کھول کر رکھ دیے تھے۔ ان کے روشن ضمیر ہونے پر اب مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا جو شخص میری ذات کے متعلق اتنا کچھ بتا دے وہ معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ چند لمحات خاموشی رہی پھر میں بولی۔

شاہ صاحب! میں اپنے منہ سے کچھ نہ کہوں گی آپ نے تو سب کچھ ہی کہہ کر میری زبان بند کر دی ہے۔

''تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے بیٹی۔ لیکن ہر برائی کو دور کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ کچھ ایسا وقت درکار ہوتا ہے جو انسان اپنی مرضی سے نہیں دے سکتا لیکن مجبوریاں ایک حیثیت رکھتی ہیں۔''

''یقیناً شاہ صاحب......''

''کیا تم کل شام کو چار بجے میرے پاس آ سکتی ہو؟''

''چار بجے میرا آنا مشکل ہوگا کیونکہ اس وقت ابا واپس آ جاتے ہیں۔''

''صبح دس بجے آ سکتی ہو؟''

''ہاں، یقیناً، دس بجے اتنی مشکل نہیں ہو گی۔''

''تو تم تنہا آؤ گی سمجھیں، تنہا آنا میرے پاس، صبح دس بجے۔'' شاہ صاحب نے کہا اور میں خوشی سے سرشار ہو گئی واپسی میں جب میں نے بتول سے اس بارے میں سوال کیا تو اس نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تم خود سوچ سکتی ہو۔''

''بتول میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ تو نے واقعی میری زندگی کے لیے اتنا بڑا کام کیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی ہوں۔''

''کل صبح دس بجے شاہ صاحب کے پاس پہنچ جانا اور سنو بزرگوں کا احترام فرض ہوتا ہے جو کچھ وہ کہیں اس پر بلا چوں چرا عمل کرنا۔ اس طرح عمل کامیاب ہو سکتا ہے۔''

''اب تو میرا رواں رواں ان کی عقیدت سے سرشار ہو گیا ہے تو فکر نہ کر۔'' میں نے جواب دیا۔

دوسرے دن میں نے تمام تیاریاں مکمل کیں اور صبح نو بجے ہی نکل کھڑی ہوئی تاکہ مقررہ وقت پر شاہ صاحب کے پاس پہنچ جاؤں۔ آج بتول میرے ساتھ نہیں تھی۔ اس وقت دوسرے لوگ موجود نہیں تھے۔ البتہ ڈیوڑھی پر وہ بوڑھا ضرور موجود تھا۔ جس نے پہلے دن ہمیں شاہ صاحب کے پاس پہنچایا تھا۔ شاہ صاحب بھی آج اپنی جگہ موجود نہیں تھے بلکہ ایک اندرونی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے کچھ کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ ان کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے نگاہیں اٹھائیں اور ان کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''طاہرہ بیٹی آ گئیں تم؟''

''جی شاہ صاحب۔'' میں نے ادب سے گردن جھکا کر کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے ایک سمت اشارہ کیا اور میں عقیدت سے بیٹھ گئی۔

"میں تمہیں کچھ تعویذ دوں گا۔ یہ تعویذ تمہیں میری ہدایت کے مطابق استعمال کرنا ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے شاہ صاحب آپ جو حکم دیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔" شاہ صاحب اپنی جگہ سے اٹھے ایک طرف رکھی ہوئی صراحی سے کٹورے میں تھوڑا سا پانی انڈیلا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور پھر وہ پانی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"اسے پی لو، یہ تمہیں سکونِ قلب مہیا کرے گا۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے کٹورا تھاما اور نہ چاہنے کے باوجود وہ پانی پی گئی۔ میں اپنی زندگی میں خاصی نفاست پسند تھی اور کسی دوسرے کے برتن میں کبھی پانی وغیرہ نہیں پیتی تھی لیکن پیر کا دیا ہوا پانی میرے لیے متبرک تھا۔ چنانچہ میں نے جس طرح بھی ممکن ہوسکا۔ اسے اپنے سینے میں اتار لیا۔ اور اس کے بعد کٹورا اسی احترام سے اس کی جگہ رکھ دیا۔ جہاں سے شاہ صاحب نے اسے اٹھایا تھا لیکن جب میں واپس اپنی جگہ پہنچی تو میرے قدموں میں ایک ہلکی سی لرزش پیدا ہوگئی تھی۔ میرا سر چکرا سا گیا تھا تاہم میں اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ اور اس کے بعد آہستہ آہستہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پورے بدن نے پسینہ چھوڑنا شروع کر دیا ہو اور چند ہی لمحات کے بعد میرا ذہن میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میں بالکل بے حال ہوگئی اور میرے حواس میرے ساتھ نہ رہے لیکن یہ کیفیت بہت دیر برقرار نہیں رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ہوش میں آ گئی میں نے چکراتے ہوئے ذہن سے دیکھا شاہ صاحب گردن جھکائے دوزانو بیٹھے کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے اور تسبیح کے دانے ان کے ہاتھ میں مسلسل گر رہے تھے۔

گردوپیش کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میرے اوپر ایک گھبراہٹ سی طاری تھی۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی مجھے اپنا لباس بے ترتیب محسوس ہو رہا تھا۔ بس ایک عجیب سا احساس تھا۔ میرے رگ و پے میں، میں نے شاہ صاب کے پاس دیکھا اور آہستہ سے ان کے قریب پہنچ گئی۔ اب میری کیفیت کافی بہتر تھی۔ چند لمحات کے بعد شاہ صاحب نے پھر تسبیح پر پھونک ماری اور ان کی نگاہیں میری طرف اٹھیں اور انہوں نے کہا۔

"کہو کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"مجھے...... مجھے کیا ہو گیا شاہ صاحب؟ مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

"یہ آبِ حیات ہے جو میں نے تمہیں پیش کیا یہ زندگی کو تمام الجھنوں سے پاک کر دیتا ہے ابھی تو تم پر گھبراہٹ کا یہ بھوت سوار رہے گا لیکن آہستہ آہستہ تم معتدل ہو جاؤ گی۔ اور اس کے بعد تمہیں جو سکون قلب مہیا ہوگا۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہوگی۔ یہ تعویذ میں نے تمہارے لیے تیار کر دیے ہیں۔ انہیں لے جاؤ اور ان میں سب سے پہلا تعویذ جس پر یہ نشان بنا ہوا ہے اپنی ماں کی مسہری کے نیچے میرا مطلب ہے پائے کے نیچے دبا دو جس پر وہ سوتی ہے۔"

میں نے دونوں تعویذ لے لیے۔ لیکن اپنی زندگی کے ان کھوئے ہوئے لمحات کے بارے میں، میں کچھ نہ جان سکی۔ جنہوں نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ میرے بدن میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ بس غالباً بے تکے پن سے لیٹ جانے کی وجہ سے لباس بے ترتیب ہو گیا تھا۔ بہر طور میں کسی نہ کسی طرح گھر تک پہنچی۔

میمونہ کہیں گئی ہوئی تھی۔ چنانچہ مجھے کام کرنے کا بہتر موقع مل گیا اور میں نے وہ تعویذ بڑی احتیاط سے مسہری کے نیچے دبا دیے۔ میں مسلسل اس بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ شاہ صاحب کا اثر میرے اوپر بہت زیادہ تھا۔ لیکن میں بے ہوش کیوں ہوگئی تھی۔ میں ہوش و حواس سے عاری کیوں ہوگئی تھی اور اس دوران کیا ہوا۔ لیکن مجھے کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بس ممکن ہے یہ بھی کوئی کرامت ہو۔ کوئی کرشمہ ہو میرا ہوش و حواس سے عاری ہو جانا ممکن ہے میرے آئندہ مستقبل کے لیے سود مند ہو، یہی سوچ کر میں خاموش ہوگئی۔ شام کو بتول مجھ سے ملنے کے لیے آئی اور میں نے وہ تمام واقعات اسے

سنا دیے۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب پہلی بار شاہ صاحب کے سامنے میں گئی تھی اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے تو انہوں نے مجھے وہی آبِ حیات پیش کیا تھا اور اس کے بعد میرا کام بن گیا تھا۔"

اس کی گفتگو سے میرا دل مطمئن ہو گیا۔ میں تنہا ہی ان کے واقعات سے نہیں گزری تھی۔ بلکہ بتول بھی اس عمل کا شکار تھی ممکن ہے شاہ صاحب کا طریقہ کار یہی ہو۔

بہرحال اس کے بعد میں اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب میمونہ اور ابا کے درمیان نفاق پیدا ہو۔ تین دن گزر گئے لیکن میں نے ایسی کوئی خاص بات نہیں محسوس کی۔ ان کے درمیان وہی یگانگت وہی محبت تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ شاہ صاحب جیسا بزرگ جس نے میری شکل دیکھتے ہی میرا نام' میرے مسائل معلوم کر لیے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسا کام کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکا تھا جو میرے لیے کارآمد ہو۔ بتول سے تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ شاہ صاحب سے ملاقات کرتی رہو۔ وہ تمہیں کچھ نہ کچھ دیتے رہیں گے۔" چنانچہ اس دن ہم پھر شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔

اس وقت وہاں عقیدت مندوں کا رش تھا۔ اس لیے زیادہ گفتگو نہیں ہو سکی۔ شاہ صاحب نے دو ہی وقت مقرر کیے تھے یا تو صبح دس بجے تک اور یا اس کے بعد شام سات بجے کے بعد لیکن شام میں میرا عموماً جانا ممکن نہیں تھا۔ ایک آدھ بار بہانہ کر کے تو جا سکتی تھی۔ مسلسل سات بجے گھر سے باہر نکلنا میرے لیے ممکن نہیں تھا اور پھر میمونہ جیسی ڈائن میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اگر اسے کوئی موقع مل گیا تو مجھے یقیناً چت کر دے گی۔ وہ ضرور کسی ایسے کام کی تاک میں رہے گی جس سے میں ابا کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو جاؤں۔

شاہ صاب نے اس دن پھر مجھے کچھ تسلیاں دیں اور روانہ کر دیا۔

اشتہار

پطرس بخاری نے اپنے مشہور مضمون' لاہور کا جغرافیہ' میں دیواروں کی سطح پر لکھے ہوئے اشتہاروں کے فوائد بیان کیے ہیں۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے تک وہاں اہلِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بہ حروف جلی' محمد علی دندان ساز' لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں' بجلی' پانی' بھاپ کا بڑا اسپتال' لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔' خالص گھی کی مٹھائی امتیاز علی تاج کا مکان ہے' کرشنا بیوٹی کریم شالامار باغ کو اور کھانسی کا مجرب نسخہ جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

حسنِ انتخاب: محمد عزیز مئے۔ لڈن' وہاڑی

پھر دو تین دن بعد مجھے دس بجے کے قریب شاہ صاحب نے بلایا اور میں وہاں پہنچ گئی اس دن بھی میں تنہا ہی آئی تھی۔ جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو شاہ صاحب کے پاس ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ شکل و صورت سے عجیب نظر آتا تھا۔ میں گھبرا کر واپس پلٹ گئی تو شاہ صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں بیٹی اندر آ جاؤ یہ غیر نہیں ہیں یہ فاضل صاحب ہیں، بڑے آدمی ہیں اور میرے عقیدت مندوں میں سے ہیں۔" فاضل صاحب نے مجھے سلام کیا اور میں خاموشی سے ایک طرف گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔

"بیٹی! بعض اوقات کچھ ایسے کام کرنے ہوتے ہیں۔ جو کسی اہم مقصد کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ میں نے فاضل میاں سے تمہارا تذکرہ کیا تھا۔ کیا خیال ہے تمہارا فاضل میاں؟"

''شاہ صاحب! میں تو عقیدت مند ہوں قدموں کی خاک ہوں آپ کے، جو آپ کا حکم۔''
''تو پھر تم اس بچی کا یہ کام کر ڈالو۔''
''جو حکم، لیکن اس کے لیے جو بھی وقت یہ مجھے دیں۔''
فاضل نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کون سا کام، میں اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکی اور میں نے شاہ صاحب سے یہ سوال کر ڈالا۔
''میں تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ رات کو آٹھ بجے یا نو بجے تک فاضل کے پاس پہنچ سکتی ہو۔''
''کہاں؟'' میں نے سوال کیا۔
''میں آپ کو ابھی واپسی میں اپنا مکان دکھا دوں گا۔''
''لیکن شاہ صاحب مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہوگا اور پھر رات کو آٹھ یا نو بجے کا وقت؟''
''یہ وقت تمہیں نکالنا ہی ہوگا۔ بس یوں سمجھ لو تمہارے مقصد کے لیے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔'' شاہ صاحب نے کہا اور میں سوچ میں پڑ گئی ایک اجنبی آدمی کے گھر تک جانا اور وہ بھی رات کے وقت کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیا کیا مصیبتیں گلے لگ جائیں۔ لیکن شاہ صاحب کا حکم تھا انکار نہ کر سکی۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ کوئی بہانہ کر کے ہی آنا ہوگا اور شاہ صاحب نے جواب دیا کہ یہ میرا مسئلہ ہے۔
بہر طور وہ تو صرف خادم ہیں اور خدمت ہی کر سکتے ہیں چنانچہ میں تیار ہوگئی۔ راستے میں فاضل صاحب نے مجھے اپنا مکان دکھایا تھا۔ اس کے پاس کار نہیں تھی۔ البتہ مکان شہر کے گنجان علاقے میں تھا اور خاصا خوبصورت تھا اس نے مجھے صرف مکان دکھایا تھا۔ اور یہ کہا کہ رات کو آٹھ یا ساڑھے آٹھ بجے تک وہ میرا انتظار کرے گا۔ اور اس کے بعد مجھے انتہائی شرافت سے رخصت کر دیا۔ میں نے بتول سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ کہنے لگی کہ شاہ صاحب جو کچھ کہتے ہیں اس میں کوئی رمز ہوتی ہے۔ تمہیں بہر طور وہاں جانا ہوگا ممکن ہے وہ شخص تمہاری اس سلسلے میں کوئی ایسی مدد کر سکے جس سے تمہارا مستقبل بن جائے۔
''لیکن میں گھر سے کیا بہانہ کروں گی؟''
''یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ آج رات تم میرے پاس آ رہی ہو۔ کوئی مجھ سے پوچھے گا تو بتا دوں گی کہ ہاں میرے گھر میں ایک چھوٹی سی تقریب ہے۔'' بتول نے میری مشکل حل کر دی۔
چنانچہ فاضل کے ہاں جانے میں مجھے کوئی وقت نہ ہوئی اور میں مقررہ وقت پر اس کے مکان پر پہنچ گئی۔ البتہ کئی بار میں نے سوچا تھا کہ پیرزادہ اور شاہ صاحب اپنے اس مرید سے میرے لیے کس طرح کا کام کرانا چاہتے ہیں۔ فاضل نے اپنے مکان کے برآمدے ہی میں میرا استقبال کیا تھا اور بڑے احترام سے پیش آیا تھا۔
''آپ کے اہل خانہ فاضل صاحب؟ کیا وہ موجود ہیں؟''
''آپ تشریف تو لائیے ان سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔''
فاضل نے مؤدب انداز میں کہا۔ چند لمحات کے لیے میرے دل پر گھبراہٹ طاری ہوئی تھی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ جن بزرگ کا وہ مرید ہے انہوں نے مجھے اس کے پاس بھیجا ہے چنانچہ یہاں میری ذات کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ فاضل مجھے لیے ہوئے اندرونی کمرے میں آ گیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ عمارت میں مکمل طور پر خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ کسی بچے تک کے بولنے کی آواز نہیں تھی۔ نہ ہی مجھے کوئی نظر آیا تھا۔ ایک ہلکے سے خوف کا احساس میرے ذہن و دل میں جا گزیں ہو گیا۔ جس کمرے میں فاضل مجھے لے کر گیا تھا وہ بہت عجیب تھا۔ دیواروں پر اداکاروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں عجیب عجیب تصاویر تھیں یہ لیکن یہ کسی اچھے ذوق کے حامل شخص کی خواب گاہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔
پھر جب فاضل نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کیا تو میری آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے تاریکی

سی چھا گئی۔ مجھے اس کی نیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''تشریف رکھیے خاتون، آپ کی تمام الجھنوں کا حل میری مٹھی میں ہے۔''

''لیکن آپ نے دروازہ بند کیوں کر دیا؟''

''یہ ضروری تھا طاہرہ صاحبہ۔'' فاضل نے جواب دیا۔

''براہ کرم مجھے وحشت ہو رہی ہے۔''

''ابھی چند لمحات میں آپ کی یہ وحشت مسرت میں تبدیل ہو جائے گی۔ دراصل شاہ صاحب بہت ہی بامروت انسان ہیں اس کے علاوہ دنیا کے اصولوں کے قائل کہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔''

''آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔''

''آپ بیٹھیے تو سہی۔'' اس نے آگے بڑھ کر میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھے اور میں چونک پڑی۔

''میں، میں جانا چاہتی ہوں فاضل صاحب۔''

''آپ اپنی مصیبت سے چھٹکارا نہیں حاصل کرنا چاہتی ہیں جس کے لیے آپ کو پہلے شاہ صاحب تک اور پھر مجھ تک آنا پڑا۔''

''لیکن آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

''بہت کچھ...... پورا کیس میرے علم میں آ چکا ہے میں آپ کو ایک بات بتا دوں طاہرہ صاحبہ میں کوئی نیک نام آدمی نہیں ہوں۔ لوگ مجھے برے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کے یہاں آنے کی اطلاع تو صرف چند ہی افراد کو ہے اور انہی تک محدود رہے گی۔ آپ کی سوتیلی والدہ سے میرے گہرے تعلقات ہیں کیا سمجھیں؟ کام کرنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ یہ تعلقات لوگوں کی زبان پر آئیں گے اور ان کی اتنی تشہیر ہو گی کہ آپ کے والد صاحب کو بھی اس کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ اور میں ایسے ثبوت پیش کروں گا کہ ان کی تردید کوئی نہ کر سکے اور اس کے بعد آپ جانتی ہیں کہ اُس کا انجام کیا ہو گا۔''

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں مسرت کی لہر اٹھی تھی لیکن دوسرے لمحے بجھ گئی۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن فاضل کے چہرے کی شیطانیت اور اس کے الفاظ میرے ذہن میں چکرا رہے تھے۔

''تو فاضل صاحب اس سلسلے میں مجھے آپ کی کیا خدمت کرنا ہو گی؟''

''وہی جو ازل سے عورت مرد کی کرتی چلی آئی ہے۔''

''کک...... کیا مطلب؟''

''واضح الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے محترمہ۔'' فاضل نے کہا۔

اور اب میرے لیے مزید سوچنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ خوف سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ جس مصیبت میں آ پھنسی تھی اس سے بچنا میرے لیے ممکن تھا۔ فاضل کی شکل دیکھتی رہی۔ ذہن میں دہشت اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی پھر میری نگاہ بستر کے پچھلے حصے پر سجے ہوئے پیتل کے گلدان پر پڑی اور ایسے موقع پر جو کچھ کیا جاتا ہے وہی میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔ فاضل بے پناہ طاقتور آدمی تھا۔ بھاری بھرکم بدن کا ہونے کے باوجود پھرتیلا اور محتاط نظر آتا تھا۔ اگر میں کسی اور طرح سے اس کے خلاف جدوجہد کرتی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میں آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی اور مسہری پر جا بیٹھی۔ فاضل کو مجھ سے اس تعاون کی امید نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر اس نے کہا۔

''طاہرہ صاحبہ زندگی میں انسان کو ہمیشہ عقل سے کام لینا چاہیے۔ جذباتیت اور نا سمجھی بے شک عمر کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن جس نے آپ جیسی چھوٹی عمر میں اس پر قابو پا لیا یوں سمجھ لیجیے کہ میری زندگی اسی کی ہے۔ میں آپ پر آپ کے سنہرے مستقبل کا آغاز کرتا ہوں۔'' وہ مسہری پر میرے قریب آ گیا اور پھر میرے لیے یہ مشکل نہ رہا کہ پیتل کا گلدان اس کے سر پر دے ماروں۔ میں نے فاضل کے سر پر دو ضربیں لگائیں اور وہ کراہ کر مسہری

سے نیچے جا پڑا اور اس کے بعد دروازہ کھول کر باہر نکل آنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی میں بے تحاشا دوڑتی چلی گئی۔ اس طرح بھاگی کہ پلٹ کر نہ دیکھا۔ فاضل کے بارے میں مجھے اندازہ نہیں تھا کہ زندہ ہے یا مر گیا۔ گلدان میں نے پوری قوت سے ہی مارا تھا۔

بہر طور گھر آنے کے بعد میں خاموشی سے اپنی خواب گاہ میں گھس گئی۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ کیا شاہ صاحب نے جان بوجھ کر یہ سب کچھ کیا تھا یا صرف یہ فاضل کی کمینگی تھی۔ یہ بات میرے ذہن میں خلش بنی ہوئی تھی۔ صبح بتول سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے پوری کہانی سنا دی تو وہ دھک سے رہ گئی۔

''ارے! یہ تم نے بہت برا کیا۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے بتول، کیا میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی؟''

''کیا حرج تھا کسی مقصد کو پانے کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔''

''وہی فضول باتیں تم بھی کر رہی ہو۔ جو وہ کرتے رہے۔''

''آنے والا وقت تمہیں بتا دے گا طاہرہ کہ میری یہ باتیں فضول نہیں تھیں بلکہ ان میں ایک ٹھوس حقیقت تھی۔'' بتول نے جواب دیا۔ میں کچھ تلخ ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ تھوڑی دیر بعد چلی گئی۔ میں غصے سے پھنکارتی رہی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ شاہ صاحب کو جا کر خوب جلی کٹی سناؤں۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ ممکن ہے اس تمام کارروائی میں ان کی غلطی نہ ہو۔

کم از کم انہیں صورت حال سے آگاہ تو کر دیا جائے۔ چنانچہ دن کو تقریباً ساڑھے دس پونے گیارہ بجے کے قریب میں تیار ہو کر باہر نکلی اور شاہ صاحب کی درگاہ کی جانب چل پڑی۔

شاہ صاحب حسب معمول اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔ دیکھتے رہے اور پھر مسکرا کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر پہنچ گئی تو انہوں نے کہا۔

''طاہرہ مقصدِ حیات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں؟''

''میں آپ کو اس شخص کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں بزرگ؟''

''ہاں...... ہاں کہو۔'' شاہ صاحب مسکرا رہے تھے۔

''اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی کوشش کی تھی۔''

''کوشش کی تھی؟ کیا مطلب کامیاب نہیں ہو سکا۔'' شاہ صاحب کی مکروہ آواز ابھری اور اس کی اصل شکل میرے سامنے آ گئی۔ ان کے چہرے سے تقدس کا نقاب اتر گیا۔ اب وہ مجھے ایک مکروہ شیطان کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔

''طاہرہ زندگی کی حقیقتیں یہی ہیں۔ کوئی کسی کے لیے کچھ کرتا ہے تو دوسرا اس کے لیے کچھ کرتا ہے۔ فاضل بہت اچھا آدمی ہے لوگ اُسے برا کہتے ہیں لیکن وہ انسانوں کے کام آتا ہے۔''

''گویا آپ نے جان بوجھ کر مجھے وہاں بھیجا تھا۔''

''ہاں بھئی یہ ضروری تھا وہ تمہیں پسند کرنے لگا تھا اور اس نے مجھ سے درخواست کی تھی۔ میں نے اس سے یہی کہا تھا کہ طاہرہ کا ایک کام کر دو وہ تمہارا کام کر دے گی۔''

''میں نے اس کا کام تمام کر دیا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور شاہ صاحب چونک پڑے۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ آپ کے چہرے سے بھی وہ نقاب اتر گئی ہے۔ شاہ صاحب جسے پہن کر آپ لوگوں کو دھوکا دیتے تھے۔''

''اس دور میں بی بی ہر شخص ایک نقاب پہنے ہوئے ہے اس نقاب کے نیچے جھانکوں تو اس کے نقوش اچھے نظر نہیں آتے بعض لوگ فطرتاً برے نہیں ہوتے لیکن وہ مصلحت انہیں یہ نقاب پہننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تم نے جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا۔ فاضل تم سے انتقام لے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ تمہاری ذمہ داری ہو گی۔ میں تمہیں ایک بہتر مشورہ

دے سکتا ہوں۔ جاؤ فاضل سے معافی مانگو اور اس کی خواہشات پوری کر دو۔‘‘

’’آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔‘‘ میں چیخ پڑی۔

’’زیادہ شور کرنے کی ضرورت نہیں تم کتنی پارسا ہو اس کے ثبوت ہیں میرے پاس۔‘‘ پھر عامل شاہ نے الماری کھول کر ایک لفافہ میرے سامنے پھینک دیا۔ لفافے کے گرتے ہی بے شمار تصاویر اِدھر اُدھر پھیل گئیں۔ آنکھیں خود بخود انہیں دیکھ کر بند ہوئی جاتی تھیں۔ یہ تصویریں کب اور کہاں کھینچی گئی تھیں۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ معلومات نہیں۔ میں نے البتہ اپنے لباس سے اندازہ لگالیا کہ اس وقت بنائی گئی تھیں جب میں پہلی بار شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی اور انہوں نے مجھے آبِ حیات پینے کے لیے دیا تھا۔

’’بی بی...... میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس دور میں ہر انسان تھوڑا بہت کمینہ ضرور ہے۔ غور کر لینا کہ یہ تصویریں کہاں تک پہنچ سکتی ہیں۔ اس کا اندازہ لگالینا۔ لیکن اس کے بعد تمہاری اور تمہارے والد صاحب کی جو عزت ہوگی۔ اس کا اندازہ تمہیں خود ہو جائے گا۔ جاؤ میں تم سے پھر بات کروں گا۔ کل نہیں کل سوچ لینا پرسوں میرے پاس آنا۔ میں کوشش کروں گا کہ فاضل تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہ کر پائے۔ لیکن اس کی شرط یہی ہوگی کہ تمہیں فاضل سے معافی مانگنا ہوگی۔‘‘

میں واپس آ گئی۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ جو کچھ ہوا تھا میری توقع کے اتنا خلاف تھا کہ میں تصور نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے برباد کر دیا گیا تھا۔ میری زندگی شکنجے میں کس لی گئی تھی۔ اب اتنی احمق بھی نہیں تھی کہ صورتحال کا اندازہ نہ کر سکوں۔ میں جانتی تھی کہ شاہ دراصل ایک جرائم پیشہ انسان ہے اور اس نے یہ روپ دھار کر لڑکیوں کو بے وقوف بنانے کا کاروبار شروع کر رکھا تھا اور بتول اس کا آلۂ کار تھی۔

بس پھر بلیک میلنگ کی ایک طویل کہانی شروع ہو گئی۔ وہ لوگ مجھ سے پیسے بٹورتے رہے مجھے میری ہی نظروں میں ذلیل ورسوا کرتے رہے۔ میں بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

میمونہ سے بھی جھگڑا کرنا بند کر دیا تھا ہر وقت کمرے میں بند رہتی تھی کالج بھی چھوٹ گیا تھا۔ جب عامل کو مجھے بلوانا ہوتا تو وہ بتول کو استعمال کرتا۔ کتنے مہینے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شاید میری قسمت اچھی تھی کہ ایک دن کسی نے عامل شاہ کو اس کے آستانے پر اس کے تین ساتھیوں کے ساتھ گولیوں سے بھون ڈالا اور آستانے کو آگ لگادی۔

ایک مریدنی بھی اندھی گولی کا شکار ہو کر موقع پر ہی ماری گئی۔ ٹی وی پر جب یہ خبر چل رہی تھی تب میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

میں بھاگ کر اپنے کمرے میں گئی اور کتنی دیر سجدہ شکر میں پڑی رہی میرے اللہ نے مجھے عذابِ مسلسل سے نجات دلادی تھی۔ اس واقعہ کے بعد میری زندگی بالکل بدل گئی۔

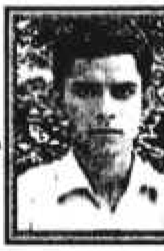
میمونہ اور ابا بھی حیران تھے کہ یکایک مجھے کیا ہو گیا۔ میں نے اپنی پوری توجہ تعلیم کو دی فارغ وقت میں قرآن پڑھتی اور معنی سمجھتی۔ تہجد میں اُٹھ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتی۔

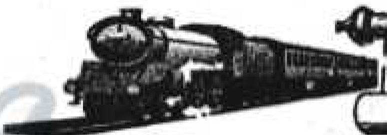
بُری کمپنی چھوٹی تو منظر صاف ہو گیا۔ جی ہاں آستانے پر مرنے والی مریدنی کوئی اور نہیں بلکہ بتول تھی۔ ابا نے کچھ عرصے بعد میری اپنے دوست کے بیٹے سے شادی کر دی۔ رضوان بہترین شوہر ثابت ہوئے اور میں رفتہ رفتہ اپنا ماضی بھیانک خواب جان کر بھول گئی۔

مگر میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ لڑکیوں کو ضرور بتاؤں گی کہ کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالیں۔ گھر میں وہ جتنی محفوظ ہیں باہر اتنا ہی خطروں میں گھرنے کا موقع ہوتا ہے۔ بہت نقصان اُٹھا کر میں تو پھر بھی واپس پلٹ آئی یقیناً میرا رب مجھ پر مہربان تھا۔ میں خوش نصیب ہوں مگر ہر لڑکی اتنی خوش نصیب بھی نہیں ہوتی۔

☆☆......☆☆

آزادی





شفیع محمد مری بلوچ

آج کی آزادیٔ صحافت پر لکھی گئی ایک صحافی کی لہو رنگ داستان

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میرے موبائل فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کال ریسیو کیا۔

"ہیلو مسٹر اکرم خان سپیکنگ" میں نے کہا۔

"خان صاحب میں اسد اللہ بول رہا ہوں۔" اُدھر سے آواز آئی۔

"جی بولو اسد اللہ اتنی رات کو کیسے یاد فرمایا۔" میں نے کہا۔

"اکرم آج خالد صاحب پر نامعلوم مسلح افراد نے حملہ کیا جس سے ان کی موت واقع ہوگئی ہے۔" اسد نے کہا۔

"تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"جی یہی سچ ہے۔" اسد اللہ نے کہا۔ خدا حافظ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

مجھے خالد کی موت کا سن کر ابھی بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ میں اس سے آج صبح کو مل چکا تھا۔ خالد ایک صحافی تھے۔ ان کا تعلق صوبہ بلوچستان کے ضلع پنجگور سے تھا۔ وہ دو ٹی وی چینلوں اور ایک اخباری رسالے سے منسلک تھے۔ وہ اس رسالے کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک سماجی کارکن بھی تھے۔ انھوں نے ضلع پنجگور میں "حقوقِ بلوچ" کے نام سے ایک تحریک کا بھی آغاز کیا تھا۔ خالد بلوچ ایک سادہ مزاج اور خوش اسلوب مغربی بلوچستان والوں کے لہجے میں بلوچی زبان بولنے والا شخص تھا۔ انھوں نے بلوچستان یونیورسٹی سے قانون پاس کیا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے وکیل بننے سے اس بات کو بہتر سمجھا کہ وہ اپنے قوم کی آواز کو دنیا تک پہنچائے۔ ان کے حقوق کے لیے آواز بلند کرے۔ انھوں نے اپنے منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے صحافت کو موزوں سمجھا۔ انھوں نے ہمیشہ یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ بلوچ قوم کو مظالم کا سامنا ہے۔ ایک طرف بلوچوں کو ان کے جائز حقوق نہیں مل رہے ہیں تو دوسری طرف ان پر حملے ہو رہے ہیں۔ ان حملوں کی وجہ سے نہ بلوچستان میں تعلیم اور نہ ہی صحت کی کوئی سہولت موجود ہے۔ بلوچستان کے ضلع پنجگور، کوہلو، ڈیرہ بگٹی اور کئی اضلاع میں خواندگی کا تناسب 50% سے بھی کم ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ بلوچستان میں چلنے والی جنگ ہے۔

اسی بلوچستان میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے جہاں "بابائے قوم" نے اپنی زندگی کے آخری دن کاٹنے کی خواہش کی۔ آج اسی بلوچستان میں جبری گمشدگیوں اور مسخ شدہ لاشوں کا سلسلہ نہیں رکتا۔ ہر سیاست دان کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اس مسئلے کو اپنا انتخابی ایجنڈا بناتا ہے۔ مگر اقتدار ملنے کے بعد اسے بلوچستان اور بلوچ قوم بھول جاتی ہے۔ خالد سچائی سے اپنا فرض سرانجام دینے والے صحافی تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات پاکستان میں صحافیوں پر حملوں کے حوالے سے ہونے والے ایک سیمینار میں ہوئی۔ جہاں



انھوں نے بلوچستان سمیت تمام پاکستان میں صحافیوں پر ہونے والے امتیازی سلوک کا ذکر کیا۔ انھوں نے اُس موقع پر میڈیا ہاؤسز کو یہ پیغام بھی دیا کہ وہ ان کے اداروں میں کام کرنے والے صحافیوں کی حفاظت کو یقینی بنائیں۔
مگر افسوس آج خالد خود سفاک قاتلوں کے ہاتھوں بے گناہ مارا گیا۔ میں یہ سوچتا رہا کہ ان پر حملہ کیوں اور کس نے کیا۔ کیا خالد سمیت آج تک مارے جانے والے صحافیوں کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے لمحہ بہ لمحہ عوام کو ملکی حالات سے آگاہ کیا؟ یا انھوں نے غیر جانبداری سے اپنے فرائض سرانجام دیے؟ خالد نے ہمیشہ عوام تک سچی خبر پہنچائی۔ میرے اندر کے انسان نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ کیا ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے عوام تک سچی خبر پہنچائی۔ یا پھر ان ملک وقوم دشمنوں کے خلاف اپنے ضمیر کی آواز کو لبیک کہہ کر حقیقت کا پردہ فاش کیا۔

☆☆☆

اگلی صبح جب میں آفس گیا وہاں کئی دوستوں کو خالد کی شہادت پر غمگین پایا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں میں خالد بلوچ کی شہادت کی خبر نشر و اشاعت ہوئی۔ ان کے بارے میں ایک دو دوستوں کے کالم بھی پڑھنے کو ملے۔ مجھے بحیثیت ایک صحافی اور دوست کے خالد کی موت کا رنج تھا۔ میں یہ سوچتا رہا کہ کیا خالد کے قاتل گرفتار ہوں گے یا نہیں؟ میں نے اس بات کا تذکرہ چند دوستوں کے ساتھ بھی کیا۔
”آج تک کسی جرنلسٹ کا قاتل گرفتار ہوا ہے جو خالد کے گرفتار ہوں گے۔ اگر گرفتار ہوئے بھی ہیں تو بڑے نام جو عوام تک خبریں پہنچاتے تھے۔ اب وہ خود خبروں میں ہیں۔“ اسد اللہ نے کہا۔
”کیا حکومت صحافیوں کی تحفظ کے لیے کوئی عملی قدم اٹھائے گی؟“ میں نے اخبار پر لگی خالد کی تصویر غور سے دیکھ کر کہا۔
”حکومت کی طرف سے تحفظ تو بعد کی بات ہے کیا اس سے قبل صحافی خود اپنے اور اپنے دوستوں کے تحفظ کے خاطر سڑکوں پر نکلیں گے۔“ ذر داد اسلم جو کہ خالد کے ساتھ

ایک پروگرام کے میزبان تھے نے سوال پر سوال کرتے ہوئے کہا۔

''اسلم درست کہہ رہے ہیں حکومت تب صحافیوں کی تحفظ کے لیے قدم اٹھائے گی، جب ہم صحافی متحد ہوں گے۔

صحافیوں پر حملوں کے معاملے میں، صحافیوں پر حملوں کے مخالفت پر صحافت کے عالم دن 2 نومبر کو جب صحافیوں نے اپنے تحفظات کا اظہار پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنا لگا کر کیا تھا اس میں بہت ہی کم تعداد میں لوگوں نے شرکت کی تھی۔''

☆☆☆

اسی روز خالد کی ہلاکت کے خلاف ''بلوچستان یونین آف جرنلسٹ'' نے احتجاجی مظاہرہ کیا۔ جس میں بہت ہی کم تعداد میں صحافیوں نے حصہ لیا۔ جس پر مجھے اسلم کی یہ بات یاد آئی کہ حکومت تب صحافیوں کی تحفظ کے لیے قدم اٹھائے گی جب ہم صحافی خود متحد ہوں۔''

میں نے سوچا کہ واقعی اسلم نے ٹھیک کہا کہ ہم صحافیوں نے خود متحد ہونا ہے۔ صحافیوں کی ''ٹارگٹ کلنگ'' کے مسئلے کو ہم نے سنجیدگی سے لینا ہے۔ آج اگر ہم کسی صحافی کے ہدف بنا کر مارے جانے کو خبر کے طور چلا رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ایک روز ہم خود خبروں میں ہوں گے۔

احتجاج کے بعد میں نے گھر کا راستہ لیا۔ گھر جا کر میرے ذہن میں خالد سمیت ان تمام صحافیوں کے چہرے یاد آئے۔ جنھیں ہدف بنا کر مارا گیا۔ جنھیں بے گناہ قتل کیا گیا۔ یہ مسئلہ صرف صوبہ بلوچستان کا ہی نہیں بلکہ تمام ملک کا ہے۔

آخر کار کب تک ہم یہ ظلم سہتے رہیں گے۔ میری سوچ زبان تک آ گئی۔

''کیا کب تک'' میری بیوی نے کہا۔ ''آپ اتنے پریشان کیوں ہیں۔'' میرے چہرے میں پریشانی کے آثار دیکھ کر بیگم بھی پریشان ہو گئی۔

''کیا تم نے میری آواز سنی۔'' میں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں آپ کہہ رہے تھے کہ پتا نہیں کیا کب تک۔''

بیگم نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں وہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ بے گناہ صحافیوں کا کب تک قتلِ عام چلتا رہے گا۔ کیا صحافیوں کا قصور یہ ہے کہ وہ عوام کی آواز کو نشر کر رہے ہیں یا پھر ان کا قصور یہ ہے کہ وہ ان سامراجی قوتوں کا پردہ فاش کر رہے ہیں۔ جنھوں نے ملک و قوم کو لوٹا ہے۔'' میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''آپ درست کہہ رہے ہیں اب ملک میں آزادیٔ صحافت پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔ اب تو پاکستان میں کوئی بھی شعبہ محفوظ نہیں ہے حتیٰ کہ راہ چلتا راہ گیر بھی غیر محفوظ سمجھتا ہے خود کو۔'' بیگم نے کہا۔

میری نظروں سے وہ منظر ابھی بھی نہیں گیا تھا جو میں نے خالد کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس کے چھوٹے بچے اپنے والد کی لاش پر زار و قطار رو رہے تھے۔ آخر کار ان بچوں کو کس نے یتیم کیا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ میڈیا ہاؤسز (جنھوں نے اس بات کی بالکل پروا نہیں کی کہ صحافیوں کا تعلق کہاں سے ہے۔) حکومت یا پھر وہ سفاک قاتل جنھوں نے خالد کو نشانہ بنایا۔ میڈیا دو دن غم کرے گا پھر انھیں خالد کی جگہ اور صحافی مل جائیں گے۔ حکومت کے نمائندے کیمرے کے سامنے آ کر جھوٹے وعدے کر کے جائیں گے کہ وہ جلد سے جلد قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے اور آئندہ کے لیے صحافیوں کے تحفظ کو یقینی بنائیں گے۔ اور تیسرے وہ لوگ جن کی راہ میں صحافی کانٹا ہیں۔ ان کے ہاں جشن کا ماحول ہو گا وہ خوش ہوں گے کہ ان کے کالے کرتوتوں پر سے پردہ فاش کرنے والوں میں سے ایک کم ہو گیا ہے۔ حقیقی نقصان تو خالد کی اہلیہ کو ہوا۔ اس کی بیوی بیوہ ہو گئی۔ بچے یتیم ہو گئے۔ والدین کا نوجوان بیٹا انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔ آخر کار ان کو نہ کیے ہوئے کی سزا کیوں مل رہی ہے۔ ہنستا مسکراتا گھر چند لمحوں میں کیسے اجڑ گیا۔ آخر کار کب تک ہم یہ ظلم سہتے رہیں گے۔ آج خالد کو نشانہ بنایا گیا ہے کل ہمیں بھی نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ کیا اس ملک میں قانون نافذ کرنے والے ادارے نہیں ہیں۔ عدلیہ نہیں ہے۔ اگر یہ سب ہیں تو کیا کر رہے ہیں۔ ستمبر کا مہینہ اوپر سے کوئٹہ کی سخت سردی کے باعث بھی میری پیشانی سے پسینہ آ گیا۔ صحافت کے شعبے پر ایسے بے رحمانہ حملے، اب ہمارے لیے ناقابلِ برداشت

ہیں۔ کبھی ہمارے دفتروں پر حملے ہوتے ہیں تو کبھی ہماری ضروری اشیاء جلائی جاتی ہیں۔ کبھی ہمیں اغوا کیا جاتا ہے تو کبھی سڑک پر گولیوں سے چھلنی کیا جاتا ہے۔"

یہ باتیں میں نے اگلے روز کچھ دوستوں کے ساتھ کیں۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے بشمول شعبۂ صحافت اور عوام سب کو مل کر اس کی مخالفت شروع کر دینی چاہیے۔ تب جا کر یہ مسئلہ حل ہو جائے۔" اسلم نے کہا۔

"ہم تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے مسئلہ حل ہونے ہی والا ہے۔ بس صرف پولیس کے آنے کی دیر ہے۔" اسلم نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"ہم کب تک خوف کے سائے میں زندگی گزاریں گے۔ کب تک ان قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہیں گے۔ اب ہم خاموش بیٹھ کر تماشائی نہیں بنیں گے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے دوست بے گناہ مارے جاتے ہیں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تماشائی بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن اب ہم نے اپنے اندر کے انسان کو جگانا ہے۔ اگر ہم خود اپنے حقوق کی بات نہیں کریں گے تو کون ہمارا پرسانِ حال ہوگا۔ آج بلکہ ابھی سے ہم نے خوف کا چولا اتارنا ہوگا۔ خالد سمیت ہمیں اپنے تمام ساتھیوں کے خون سے انصاف کرنا ہے۔" میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم صحافیوں کا تحفظ کر سکیں۔" اسد نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"ہم نے سب سے پہلے ان صحافیوں کی فہرست بنانی ہوگی جن پر ماضی میں حملے ہوئے ہیں۔ یا پھر انھیں دھمکیاں موصول ہوئی ہیں۔" (میری بات ابھی جاری ہی تھی کہ اسلم نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا) "مگر سب سے اہم بات اکرم یہ ہے کہ ہم نے ان صحافیوں سے بات کرنی ہوگی۔ ان کے تحفظات حکام بالا کو پہنچانا ہوں گے۔ میڈیا ہاؤسز کے مالکان سے تمام صحافیوں نے یہ شرط رکھنا ہے کہ کون سی خبر وہ کس صحافی کو دے رہے ہیں۔ کیا اس جرنلسٹ کا تعلق کسی ایسے علاقے سے تو نہیں ہے۔ جہاں جنگ کی صورتِ حال ہے۔ جیسے فاٹا، KPK، بلوچستان، پنجاب اور کراچی کے کچھ علاقے (جہاں لینڈ مافیا کا قبضہ ہے)

ہم نے "پاکستان یونین آف جرنلسٹ (بشمول حکومت پاکستان اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے) کی مدد سے ہر اس علاقے میں جہاں صحافت کو خطرات لاحق ہیں ان جرنلسٹوں کے لیے خصوصی سیکیورٹی کا انتظام کرنا ہوگا۔ جس کو پاکستان یونین آف جرنلسٹ او رقانون نافذ کرنے والے ادارے کور کر رہے ہوں گے۔ جس طرح صحافی اپنے اور اپنے علاقہ مکینوں کے حالات کا ذکر کھلے لفظوں میں کریں۔ اگر انھیں کہیں بھی خطرہ لاحق ہے تو قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنے تمام تر تجربات کو بروئے کار لا کر صحافیوں کو مشکلات سے نکال سکتا ہے۔ میں نے اپنی ادھوری بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی تب ممکن ہے جب ہم متحد ہوں۔ آزادیٔ صحافت کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے صحافیوں نے عام آدمی کا دل جیتنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ ہر ٹی وی چینل اور اخبار سرداروں، وڈیروں، جاگیرداروں، پیروں اور میروں کو مشہور، معروف اور نامور جیسے القاب سے نوازے اور غریب کا ذکر بھی نہ کرے۔ ہم نے ان صحافیوں کو بھی اپنے ساتھ کرنا ہوگا۔ جو کہ اپنے محلے کے غریب آدمی کی خبر نہیں رکھتے مگر کہیں پر کوئی سیاست دان یا سردار آتا ہے تو اس کے باتھ روم اور بیڈ روم جانے کے وقت کا بھی انھیں پتا ہوتا ہے۔ ہم نے اسی طرح غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔" اسلم نے جذباتی لہجے میں کہا۔ اس کے بعد ہر کوئی اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا۔

آج میں پُر امید ہو کر لوٹا تھا کہ شاید ہم اپنے بے گناہ دوستوں کی خون سے انصاف کر سکیں۔ رات کے جانے کون سے پہر میرا موبائل بجنے لگا۔ میں نے پُر سکون نیند سے آنکھیں کھولیں۔

"ہیلو!"

"اکرم! یار اسد پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ وہ ICU میں ہے۔ پلیز دعا کرنا۔" یہ کہہ کر اسلم نے فون بند کر دیا اور میرا ذہن مسلسل تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہر طرف یہی الفاظ میرے ارد گرد ناچ رہے تھے۔

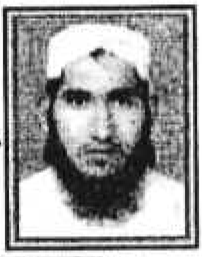
"آزادیٔ صحافت۔"

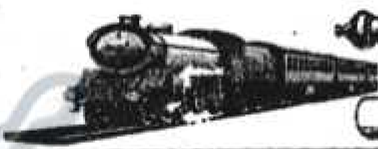
"شخصی آزادی۔"

"تحفظاتِ صحافی برادری۔"

☆☆☆

اوور ٹائم





محمد ابوہریرہ بلوچ

اس دوشیزہ کی کتھا، جس نے اپنے شوہر کی عزت کو پامال کر دیا

گھر کے تین افراد پر مشتمل مدثر کی فیملی پسماندہ زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ جن میں اس کی پچیس سالہ بیوی حمیرا، پانچ سالہ بیٹا آصف اور وہ خود شامل تھا۔ اس کی بیوی کسی زمانے میں خوب صورتی میں بے مثال ہوا کرتی تھی۔ سفید رنگت، لمبے سنہری بال، موٹی نیلی آنکھیں پرکشش جوانی کی مالک حمیرا کئی نوجوان لڑکوں کے دلوں کی دھڑکن تھی۔ مگر شادی کے بعد اس کی ساری خوب صورتی پر جیسے خزاں آ گئی۔ بالکل ایسے جیسے چاند کو کالے بادلوں نے ڈھک لیا ہو...... مگر اب تک اس کی نسوانی کشش برقرار تھی۔

آصف بھی سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ ان کی معاشی حالت اس قدر کمزور تھی کہ وہ بمشکل اپنے گھر کا خرچہ پورا کرتے۔ اس تنگدستی اور فقر کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ کرا سکتے تھے۔ وہ ہر ماہ اپنی آمدنی سے بچت کرنے کی کوشش کرتے مگر کوئی نہ کوئی مصیبت آڑے آ ہی جاتی۔ اوپر سے بڑھتی مہنگائی اور نت نئی ضرورتوں نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کر سکتے تھے۔

شادی سے پہلے بھی مدثر معاشی بحران کا شکار تھا لیکن شکل وصورت سے وہ رئیس زادہ لگتا اور اسی صورت پر گھائل ہو کر حمیرا پیار کے گہرے اور اندھے کنویں میں گر پڑی۔ وہ پیار میں اس حد تک بڑھ گئی کہ رشتے ناتے، عزیز و اقارب اور عزت سب اس کے سامنے بے معنی ہو کر رہ گئے۔

مدثر ایک فیکٹری میں نائٹ ڈیوٹی کرتا تھا۔ جہاں سے اسے بارہ ہزار روپے تنخواہ ملتی۔ اکیلا ہونے کی وجہ سے یہ پیسے مہینے بھر کے لیے بھی کافی ہو جاتے وہ جتنا بھی خرچ کرتا مہینے کے آخر میں پھر بھی بچ رہتے لیکن اپنی تنخواہ کا اکثر حصہ وہ خود کو سنوارنے میں لگاتا۔

حمیرا نے بہت کوشش کی کہ اپنے گھر والوں کو شادی کے لیے آمادہ کر سکے لیکن وہ ناکام رہی۔ اس کے گھر والوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور وہ ہاں بھی کس برتے پر کرتے۔ لڑکے کی نہ تو کوئی فیملی تھی اور نہ ہی باپ دادا کا کوئی بزنس۔ جس کے بل بوتے پر ان کی بیٹی اس کے گھر خوش رہ پاتی۔ اس کے پاس خود کا گھر بھی نہیں تھا اور نہ کوئی اچھی جاب۔

حمیرا نے جب دیکھا کہ اس کی دال نہیں گل رہی اور کوئی اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں اور پانی ہے کہ سر سے اوپر جاتا جا رہا ہے تو اس نے ایک سنگین اور گھناؤنا قدم اٹھایا۔ اور اس منصوبے کی تکمیل کے لیے رات جب تمام گھر والے شب خوابی کے مزے لے رہے تھے گھر سے چپکے سے مدثر کی رفاقت میں بھاگ نکلی۔

بھاگنے کا یہ آئیڈیا مدثر ہی کا تھا۔ پہلے پہل تو وہ اسے ناں کہتی رہی لیکن جب ملاپ کی کوئی اور صورت نظر نہ آئی تو اس نے یہ قدم بھی اٹھالیا اور یہیں سے اس کی بربادی کے دن شروع ہوگئے۔

گھر والوں کو صبح جب اپنی بیٹی کے کرتوت کا پتا چلا تو انھوں نے اسے جائیداد سے عاق کرتے ہوئے تمام رشتے بھی توڑ دیے اور وہ کرتے بھی کیا جس اولاد نے اپنے خاندان، ماں باپ کی عزت کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا۔ محلے میں بدنامی اور رسوائی سے ہمکنار کروایا ایسی اولاد کو وہ مرے ہوؤں میں شمار کرتے تو یہ ان کے نزدیک صحیح تھا۔ اور یوں گھر کے دروازے بھی اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہوگئے۔

مدثر اسی لیے دوسرے شہر چلا آیا۔ یہاں آ کر اس نے ایک کوارٹر کرائے پر لیا اور وہیں مل میں ملازمت ڈھونڈ کر سیٹل ہوگئے۔ ڈیوٹی مسلسل آٹھ گھنٹے کی تھی اور تھی بھی نائٹ لیکن اس نے باس سے سفارش کروا کر شفٹ بدلوالی۔

اٹھائیس سالہ اس کا باس ریحان علی ایک عیاش طبیعت کا مالک تھا۔ روپے پیسے کو پانی کی طرح بہاتا، اس نے تین شادیاں کیں۔ لیکن ایک کے ساتھ بھی نباہ نہ کر سکا اس نے ان کی آرائش کا خوب خیال رکھا ہوا تھا۔ مگر عورت کے لیے صرف پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اسے صرف پیار کی طلب ہوتی ہے۔ جتنا پیار سے کرو گے وہ اتنا ہی پاؤں میں بچھتی چلی جائے گی۔ اور یہ پیار وہ انھیں نہ دے پایا۔ اس کی وجہ کئی کئی دن گھر نہ آنا اور بیویوں کو وہ ٹائم نہ دیتا جن کی وہ حقدار تھیں، شامل تھا۔

وہ بے چاری کب تک صبر کرتیں آخر تنگ آ کر ایک ایک کر کے سب طلاق لے لی۔ اپنی غلطیوں پر نادم ہو کر



باوجود اس کے کہ وہ سنبھلتا وہ گناہوں کی دلدل میں اور بھی دھنستا چلا گیا کہتے ہیں کہ گناہ ابتدائی طور پر لذیذ ہوتا ہے اور یہی لذت ریحان علی کو برائی کے راستے میں پیش قدمی پر مددگار تھی...... وہ اپنی ذاتی زندگی میں جیسا بھی تھا لیکن اپنے مزدوروں کے ساتھ اس کا رویہ مخلصانہ تھا۔ وہ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔ ہر ملازم کو ایک کوارٹر میسر تھا اور علاج معالجے کی فری سہولت تھی۔

باس ریحان علی کی اس مل کے علاوہ اور بھی کئی فیکٹریاں اور جائیداد تھی یعنی اگر یوں کہا جائے کہ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا تو بے جا نہ ہوگا اسے یہ سب خاندانی وراثت میں ملا تھا۔ مدثر نے جب باس کو یہ بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے تو اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی تنخواہ بڑھا دی اور ساتھ اس کے کوارٹر کا کرایہ بھی معاف کروا دیا۔ وہ باس کے اخلاق و رویے سے بہت متاثر ہوا اور مل میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اب اسے خود کے علاوہ گھر کا خرچ اُٹھانا تھا۔ دن گزرتے گئے اور وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا جس کا نام آصف رکھا گیا۔

ایک دن وہ اپنے باس کو گھر آنے کی دعوت دے بیٹھا۔ اس نے باس کے اکرام میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس سے جس قدر اور جو ہوسکا سب اس کے روبرو حاضر کر دیا۔ اس نے حمیرا سے بھی اسے ملوایا۔ ریحان نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا مگر وہ بے خبر رہا۔ البتہ حمیرا اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئی۔

پھر کیا تھا اس دن کے بعد مدثر پر باس کی طرف سے نوازشات کی بارش ہونے لگی۔ وہ دنوں میں ہی تمام ملازموں پر افسر مقرر کر دیا گیا۔ سب اس کی روز بروز ہوتی ترقی سے جلنے لگے۔ وہ حیران تھے کہ آخر اس نے ریحان پر ایسا کیا جادو کر دیا ہے جو وہ اس پر اس قدر مہربان ہیں۔ لیکن مدثر اس ترقی کا سارا کریڈٹ اپنی لگن، محنت اور ایمانداری کو دیتا۔ حقیقت حال کچھ اور ہی تھی جس کا انکشاف اسے جب ہوا تو وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔

دراصل باس تو اس کی بیوی حمیرا کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ جس میں وہ بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ لیکن رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر اس نے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے خود کو مظلوم ثابت کروا لیا اور بولی۔

تمہارا باس کس قدر گھٹیا اور نیچ آدمی ہے تمہاری غیر موجودگی میں جب تم گھر پر نہیں ہوتے آ دھمکتا ہے اور مجھے چھیڑتا ہے۔ لیکن میں جب اسے منع کرتی ہوں تو مجھے دھمکی دیتے ہوئے بولتا ہے کہ تیرے شوہر کو نوکری سے فارغ کر دوں گا اور اس کوارٹر سے بھی چھٹی کروا دوں گا پھر تم سڑکوں پر بھیک مانگتے پھرو گے۔ صرف اسی ڈر سے اس سے دو چار باتیں کر لیتی ہوں۔"

لیکن اصل کہانی کچھ اور ہی تھی۔ خود حمیرا بھی باس کی دولت پر مرمٹی تھی وہ کب تک اس کنگال مدثر کے ساتھ دھکے کھاتی...... اسے زندگی کی ہر آزائش کی خواہش تھی اور ظاہر ہے یہ سب خاوند سے ملنا تو ناممکن تھا اسی لیے اس نے ریحان کو اپنا نشانہ بنایا۔

پہلے ہی دن جب وہ دعوت پر مدعو تھا تو نظروں سے ہی اس کی خصلت جان گئی اس لیے اسے رسپونس دینے لگی۔ لیکن جب بازی پلٹی تو وہ ایک دم کنارے پر ہو گئی اور اپنی مظلومیت ظاہر کی......

مدثر اپنی بیوی کے بہتے آنسوؤں سے دھوکا کھا گیا اور اسے بے قصور جان لیا۔ اور ریحان کی سب کے سامنے بے عزتی کی لعن طعن اور جو جو کچھ اس کے منہ میں آیا کہتا گیا۔ ریحان خود چونکہ مجرم ثابت ہو چکا تھا اس لیے اس کی دلیلیں رائیگاں گئیں۔ پھر اس نے خاموشی میں ہی عاقبت سمجھی۔ لیکن دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور مدثر کو حقیقت سے روشناس کروائے گا اور یہی اس کا بدلہ ہوگا۔

اس نے گاؤں والوں کے سامنے اس سے معافی مانگی اور اپنی غلطی تسلیم کر لی...... لہٰذا اسے معاف کر دیا گیا۔ اب مدثر کی یہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت تھی۔ لوگ اس کی بیوی پر طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔

وہ حمیرا اور بیٹے آصف کو لیے لاہور آ گیا۔ خود کا گھر نہیں تھا اس لیے اس بار بھی کرائے کے مکان میں رہنا پڑا۔ شہر میں کرایہ بہت زیادہ تھا۔ اب ان کے پاس ایک ہی چارہ رہ گیا کہ وہ دونوں مل کر مزدوری کریں۔ لیکن اس فیصلے پر مدثر قطعی تیار نہ ہوا کہ اس کی بیوی کسی اور کی نوکری کرے۔ حمیرا نے دلیل دیتے ہوئے کہا کہ جب تم ڈیوٹی پر جاتے ہو تو میں گھر میں بور ہو جاتی ہوں۔ اس

تنہائی سے پیچھا چھڑانے کا واحد حل یہی ہے اور ویسے بھی ہمیں زیادہ پیسوں کی ضرورت ہے۔"

بات واقعی صحیح تھی اس لیے اس نے حامی بھرلی۔ اس نے کاٹن فیکٹری میں اسے بھرتی کروادیا۔ وہاں کے موجود افسر نے بتایا کہ ان کا باس ایک دوسرے شہر میں رہتا ہے اور کبھی کبھار چکر لگانے آجاتا ہے اور بہت دیالو انسان ہے۔

اب چونکہ کمانے والے دو ہوگئے تھے اس لیے ضرورتیں احسن انداز سے پوری ہونے لگیں اور زندگی کی گاڑی اچھے سے چل پڑی۔

چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس پر خدا کا شکر کرتے لیکن کہتے ہیں حریص کا پیٹ نہیں بھرتا کبھی بھی سوائے قبر کی مٹی کے ۔ یہی حال ان کا تھا۔ ان دونوں نے اوورٹائم لگانا شروع کردیا۔ آہستہ آہستہ محنت نے ان کے دن پھیر دیے۔ اور وہ امیر ہوگئے۔ بیٹا ایک اچھے اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ مدثر نے کبھی حمیرا سے یہ پوچھنے کی زحمت محسوس نہ کی کہ وہ اوورٹائم کہاں کرتی ہے اور وہاں اس کی کیا مصروفیات ہے۔

کہتے ہیں کی مصیبت کبھی بتا کر نہیں آتی روزی اور موت کی طرح بس اچانک دستک دے دیتی ہے۔ ہوا یوں کہ ایک بار وہ خلاف معمول جلدی گھر آگیا آج صبح سے ہی اس کی طبیعت کچھ بے چین تھی۔ اسے آتے ہی یہ جان لیوا خبر سننے کو ملی کہ اس کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے جس میں اس کی ٹانگ بُری طرح ٹوٹ گئی ہے۔ خبر کے سنتے ہی جیسے وہ سکتے میں آگیا۔ اس نے بچے کو ایمبولنس کے ذریعے ہسپتال روانہ کیا اور خود فیکٹری کی جانب چل پڑا۔ جہاں اس کی بیوی اوورٹائم پر تھی اس وقت وہ جلدی سے فیکٹری کے دروازے کے پاس پہنچا تو اسے گارڈ نے روک لیا۔

"کہاں گھسے جارہے ہو بھائی صاحب؟ خیر تو ہے۔"

"وہ جی میں اپنی بیوی کو لینے آیا ہوں۔ وہ یہاں کام کرتی ہے۔" اس نے کپکپاتی زبان سے اسے بتایا۔

"ارے صاحب! آپ بھی کیا کمال کرتے ہیں یہ تو ہینڈی کرافٹ کی ایک چھوٹی سی فیکٹری ہے۔ اس میں بھلا کوئی کیسے اوورٹائم لگا سکتا ہے۔"

"مگر...... میری وائف یہاں پر اکثر ہی دیر تک ورکنگ کرتی ہے۔ آپ مجھے جانے تو دیں۔"

"بھائی صاحب آپ کو سمجھ میں بات کیوں نہیں آتی۔ اس وقت بڑے صاحب اور ان کے پرسنل کام ہیں۔ آپ قطعاً اندر نہیں جاسکتے۔ اب آپ جائیں صبح آٹھ بجے تشریف لائیے۔"

"مگر وہ...... اوورٹائم۔" وہ گھگیایا۔

"میں تمھیں شکل سے بے وقوف لگتا ہوں۔ جب کہہ دیا کہ آج کسی کا اوورٹائم نہیں ہے تو بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔" گارڈ چلاتے ہوئے بولا۔ "جاؤ گھر جاچکی ہوگی۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں۔"

بے چارہ مدثر چپ چاپ سائیڈ پر ہوگیا۔ وہ حیران تھا کہ اس کی بیوی یہاں نہیں تو آخر کہاں گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے جاتا اس نے سوچا کہ اندر جا کر دیکھنا چاہیے ہوسکتا ہے وہ اندر ہی ہو اور گارڈ جان بوجھ کر اس سے جھوٹ بول رہا ہو...... مگر اندر جائے تو کیسے گارڈ تو اسے جانے نہیں دے رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ گارڈ کسی ضرورت کے لیے گیٹ سے اِدھر اُدھر ہوا ہے تو اُسے مناسب موقع لگا تھا فیکٹری میں داخل ہونے کا۔

وہ جلدی سے اندر گھس گیا۔ ادھ کھلے دروازے سے جب وہ آگے بڑھا تو اسے اندر سے عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں آواز مانوس تھی وہ پہچان گیا۔ یہ اس کی بیوی تھی۔ سمت کا تعین کرتے ہوئے جب وہ آگے بڑھا تو ایک دم جیسے اسے سانپ سونگھ گیا اس کی بیوی اس کے پرانے باس ریحان کے ساتھ تھی۔

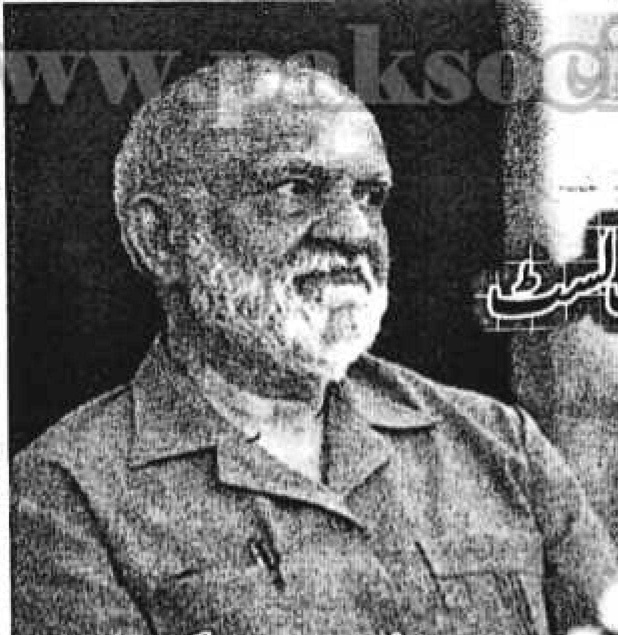
ساری حقیقت اس پر آشکار ہوگئی۔ حمیرا کا پردہ فاش ہوگیا۔ وہ شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں دھنس جائے۔ اچانک اُدھ کھلا دروازہ پورا کھلا اور وہ دونوں اٹھلاتے ہوئے باہر آنکلے۔

مدثر فقط اتنا ہی کہہ پایا۔

"بیگم صاحبہ! اوورٹائم ختم ہوچکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمھیں کسی جاب کی ضرورت بھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ریحان کے قدموں پر گرگیا۔

ریحان کا بدلہ پورا ہوچکا تھا۔

☆☆☆



بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفرنامہ بھارت

چھٹا حصہ

دہلی کی صبح

نئی دلی اور پرانی دلی میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔
دلی کی صبح...... نئی دلی میں کوئی خاص نہیں لگتی۔
آج دس محرم ہے۔ مجھے ایک سیکولر لیکن ہندو اکثریت کے دیش میں شعیہ بھائیوں کو دیکھنا ہے کہ یہاں عزاداری حسین کا کیا عالم ہے۔ میرے ساتھ ترکی کی ایک بزرگ خاتون صحافی بھی تعزیے اور ماتم دیکھنے جا رہی ہیں۔ مسز ادیبہ دلوکردار۔ پاکستان بھی آچکے ہیں، ہمارے دفتر میں بھی آئی تھیں، دشمن ملک میں اپنے ایک دوست ملک کی خاتون صحافی سے ملنا کافی دلچسپ ہے اس ترک خاتون کے لیے تو یہ ایک خبر ہے کہ ہندوستان میں ایک پاکستانی صحافی۔ جبکہ دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات نہیں ہیں۔ وہ مجھے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہیں، ہم جامع مسجد میں جا پہنچے ہیں۔ لال قلعہ، عظمت رفتہ کی یادگار۔ اب جس پر ہندوستان کا ترنگا لہرا رہا ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کا تصور میرے ذہن میں بچپن سے تھا۔ میں یہاں آیا تھا۔ اب سیڑھیاں، جھونپڑیوں میں چھپ گئی ہیں۔ سامنے کی طرف جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں ہیں، یہ کون لوگ ہیں، مسلمان ہیں، جامع مسجد کے میناروں کے سائے میں پناہ لے رکھی ہے۔ جامع کی خوبصورتی بھی اس سے متاثر ہو رہی ہے اور اتنے بڑے شہر کے عین قلب میں جھونپڑیوں میں لوگ کیوں رہتے ہیں۔ میں نے بعد میں ایک مسلمان سے ہی پوچھا ہے کہ یہ کیا مسئلہ ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ حکومت انہیں متبادل جگہ تو دینے کو تیار ہے۔ لیکن یہ کہتے ہیں کہ اس طرح مسلمان بکھر جائیں گے۔ ایک سیکولر ملک میں بھی اقلیت کو بکھر جانے کا خوف کیوں ہے۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی عقلمندی ہے یا حماقت۔
اِدھر مسلم مملکت میں مسلمان اکٹھے رہتے ہوئے بھی کس طرح بکھرے ہوئے ہیں۔
میں اور ترک خاتون جامع مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ سیڑھیاں، ہماری تاریخ کے باب، دروازے پر اس ترک خاتون کو ایک جمپر پہنا دیا جاتا ہے تاکہ گھٹنے ننگے نہ رہیں، یہ انتظام وقف بورڈ کے ذمے ہے۔ کیمرہ اندر لے جانے کے پچاس پیسے دینے پڑتے ہیں۔ مسجد میں مرمت ہو رہی ہے۔ یہ مسجد جس سے کتنی صدیوں کی تاریخ وابستہ ہے اس مسجد کے میناروں نے جانے کتنے دور، کتنے بحران، کتنے حادثے، کتنے سانحے گزرتے دیکھے ہیں، کبھی

یہ صحن سجدہ گزاروں سے معمور رہتا ہوگا، آج یہاں غیر ملکی سیاح، ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے ہندو، سکھ، مسلمان سب گھوم رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے۔ سب گھوم پھر رہے ہیں، جیسے پکنک کی جگہ ہو۔ وسیع صحن میں حوض کے پاس نمازیوں کے لیے صرف ایک صف بچھی ہے۔ باقی پوری مسجد۔ تفریح گاہ بنی ہوئی ہے۔ مینار پر اور اِدھر گیلری میں بھی ٹورسٹ گھوم رہے ہیں۔ مسجد کا احترام کیا ہوا۔ یہ کس کا قصور ہے۔ ہندوؤں کا، مسلمانوں کا لیکن مسجد کا انتظام تو دہلی وقف بورڈ کے ذمے ہے، دونوں دروازوں پر اسی بورڈ کے نگران ہیں، جو داخلے کا ٹکٹ دیتے ہیں، مینار پر چڑھنے کا ٹکٹ الگ ہے۔ دوسری یادگار عمارتوں کی اتنی اچھی حالت ہے اور جامع مسجد کی اتنی دل آزار کیوں اس کا جواب تو دہلی وقف بورڈ ہی دے سکتا ہے؟

ہم ٹکٹ لے کر مینار پر چڑھ رہے ہیں ترک خاتون ہانپ رہی ہیں۔ مینار سے نئی اور پرانی دلی کتنا فرق ہے دونوں میں۔ دلی، عظیم دلی، قدیم دلی، ہندو، جین، مسلمان، تغلق، غلاماں، خلجی، لودھی، عظیم مغل شہنشاہ، برطانوی سامراج اس فضا نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔

ہم مینار سے نیچے اُتر کر گیلری سے عزادارانِ حسین کو ماتم کناں دیکھ رہے ہیں، تعزیے برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا اور اردو کا علاقہ ہے۔ اردو بازار حمید ریسٹورنٹ، ٹیسن ریسٹورنٹ، اِدھر سے ہو کر ہم جور باغ کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں تعزیہ برداروں کے جلوس پہنچیں گے۔ ایک خلقت جمع ہے۔ پولیس بھی بھاری تعداد میں ہے۔ یہاں تعزیوں کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہ مقام کربلا کہلاتا ہے۔ اب ہم اندرونِ دہلی، تنگ تنگ گلیوں سے ہوتے حسینی یتیم خانے پہنچے ہیں، جہاں مجلس برپا ہے۔ عزادارانِ حسین ماتم کر رہے ہیں۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیلؑ

ہندو اکثریت کے سیکولر ملک میں مجلس، جلوس، تعزیے اور ماتم حسین۔ کچھ اور ہی کیفیت رکھتے ہیں۔ چند نوجوان لہولہان ہاتھوں میں زنجیریں لیے کھڑے ہیں۔ کچھ نوجوان زارو قطار رو رہے ہیں۔

ایک صاحب بیمار کربلا حضرت زین العابدین کے چہلم کے سلسلے میں اشتہار بانٹ رہے ہیں۔ ایک طرف نیاز کی دیگیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ہم یہاں سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل کا رخ کرتے ہیں۔ ایک طرف نیاز کی دیگیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ہم یہاں سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل کا رخ کرتے ہیں۔ راستے میں بھارت کے مہاتما گاندھی، پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو، دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی سمادھیاں پڑتی ہیں، سمادھی ہندوؤں کے لیے اتنی ہی قابلِ احترام جگہ ہے، جیسے ہمارے لیے مزار، سمادھی بھی مزاروں کی طرح کافی جگہ گھیرتی ہے، لیکن یہاں جسم کی بجائے صرف راکھ دفن ہوتی ہے۔ بھارتی قوم نے اپنے رہنماؤں کی راکھ کو نہایت عقیدت اور احترام سے دفن کیا ہے اور اس کے اِرد گرد، باغیچے، گھاس کے لان اور بہت کچھ بنایا ہے۔ اسکولوں کے بچے بچیاں یہاں عقیدت کے اظہار کے لیے بھی آتے ہیں اور پکنک منانے بھی۔

اپنے ہوٹل سے تازہ دم ہو کر ہمیں لال قلعے میں صوت و نور (Light And Sound) کا پروگرام دیکھنے جانا ہے۔ صبح سے محکمہ خارجہ کے مسٹر اشفاق محمد خاں میرے ساتھ ہیں، لال قلعے میں ان کے ساتھیوں مسٹر سپرا، اور مسٹر پوری سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ بیلجیئم کے دو صحافیوں کے ہمراہ آئے ہوئے ہیں۔ صوت و نور کا پروگرام ہمارے ہاں بھی لاہور کے قلعے میں ہوتا ہے۔ لال قلعہ مغلیہ دور کی تاریخ کا مرکزی مقام رہا ہے، اس لیے اس پروگرام میں زیادہ جامعیت ہے۔ یہ پروگرام ہندی اور انگریزی میں ہوتا ہے۔ میں چونکہ غیر ملکی ہوں، اس لیے مجھے انگریزی والا پروگرام دکھایا جاتا ہے۔ کافی محنت سے یہ پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک اکبر سب سے اچھا شہنشاہ تھا۔ اورنگ زیب سب سے تنگ نظر۔ صورت و نور میں بھی ان کا

اندازِ بیاں یہی ہے۔ شاہجہان کے ذکر اور قلعہ معلیٰ کی تعمیر میں شاہجہاں کے کارناموں، دیوان خاص، دیوان عام' مینا بازار ہر شے کا ذکر کرنے کے بعد جب اورنگ زیب کا ذکر آتا ہے تو انتہائی افسوس اور مذمت بھرے لہجے سے بتایا جاتا ہے کہ اورنگ زیب تنگ نظر مسلمان تھا۔ موسیقی کا اس کے عہد میں گلا گھونٹ دیا گیا، سختیاں کی گئیں اور یہ کہ مغلیہ دور کے زوال کی بنیاد اورنگ زیب نے ڈال دی۔ پھر محمد شاہ رنگیلا کا زمانہ بھی خوب دلچسپی سے بیان کیا جاتا ہے۔

بار بار موسیقی کی دھنوں کے ساتھ مغنیہ کی آواز ابھرتی ہے۔

رس بھرے نین تورے۔

نادر شاہ کی فوجیں دہلی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

ہنوز دہلی دور است۔

اور گاؤ۔ جام لاؤ۔

پھر قلعے کے چاروں طرف گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی ہیں۔

دلی میں قتل عام۔

محمد شاہ رنگیلا کی اس رنگیلی داستان کے دوران مجھے دہلی کے لال قلعے میں بیٹھے ہوئے سابق صدر یحییٰ خاں کی جانے کیوں یاد آتی رہی۔ لال قلعے کی صوت ونور کی یہ داستان انگریزوں کے ظلم وتشدد کے واقعات بیان کرتی ہوئی تحریک آزادی کے تین انقلابی کارکنوں پر اس قلعے میں ڈھائے جانے والے مظالم بھی بیان کرتی ہے۔ ان تینوں کارکنوں میں ایک ہندو' ایک سکھ' ایک مسلمان بتایا جاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی المناک داستان' پھر انگریزوں کا دور۔ پھر دلی لٹنے اور اجڑنے کی کہانیاں اور بالآخر لال قلعے کے باہر بھارت کے پہلے وزیراعظم جواہر لعل نہرو کی پہلی تقریر۔ یہ ہے لال قلعے کا صوت ونور کا پروگرام جو بھارت کی سیاحتی کارپوریشن کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ مجھے بعد میں ایک صاحب نے بتایا کہ 1971ء کے بعد اس میں 'بنگلہ دیش' کا کچھ ڈرامہ بھی شامل کردیا گیا تھا۔ لیکن معاہدہ شملہ کے فوراً بعد اسے حذف کردیا گیا ہے۔ صوت و نور کے ایسے مظاہرے دہلی کے علاوہ احمد آباد اور سری نگر میں بھی دکھائے جاتے ہیں۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد محکمہ خارجہ کے یہ صاحبان مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ پروگرام آپ کو کیسے لگا۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ یہ تو میری اپنی تاریخ ہے۔ کچھ آپ نے مسخ کردی ہے، کچھ ٹھیک بیان کردی ہے۔ یہ عمارتیں، یہ عظیم یادگاریں، ہمارے آباؤ اجداد نے ہی تو تعمیر کی تھیں، یہ ہماری نشانیاں ہی تو ہیں۔ کیا ہوا آج ہم ان سے دور چلے گئے ہیں، مگر ہم اپنی تاریخ کے اوراق کو کیسے بھلا سکتے ہیں۔

یہ موتی محل ہے۔ پرانی دلی کا مشہور ریستوران۔ جو لاہور کے نعمت کدے کی طرح پھیلتا چلا جارہا ہے۔ ہندوستانی کھانوں کے لیے مشہور ہے۔ سیاحت کارپوریشن والے لال قلعے سے مہمانوں کو سیدھے یہاں لیے آتے ہیں، یہاں کے کھانے میرے لیے تو کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ البتہ نئی بات یہ ہے کہ یہاں قوالیوں کا اہتمام ہے۔ لوگ کھانا کھاتے رہتے ہیں، قوال، قوالی گاتے رہتے ہیں۔ ان قوالوں کی وجہ سے بڑا گاہک ٹوٹتا ہے۔ واقعی جگہ نہیں رہتی موتی محفل میں کھانا ایسے ہی فیشن بن گیا ہے، جیسے کراچی میں چینی ریستوران میں کھانا بے چارے غیر ملکیوں کی سمجھ میں قوالی کیا آئے گی، پھر بھی وہ سر دھنتے ہیں، اور مرچوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں میں بھارتی میزبانوں سے بات چیت کررہا ہوں۔ ہم کھانا بھی ایک سا کھا رہے ہیں۔ بیلجیئم اور ترکی کے صحافی ہمیں حیرت سے دیکھتے ہیں۔ بیلجیئم کے عمر رسیدہ صحافی مجھ سے کہتے ہیں۔

تم ایک ہی زبان بولتے ہو۔

تم ایک سے کھانے کھاتے ہو۔

تمہارے چہرے ایک سے ہیں۔

پھر بھی ......

میں نے کہا کہ اس "پھر بھی" کی داستان بہت طویل ہے۔ اس کے پیچھے سینکڑوں برس کی تاریخ ہے اور اب ایک طویل اور خون سے لالہ فام سرحد اس کا جواب ہے۔ ویسے ہم کیا، سبھی انسان ایک

ہیں۔ سیاستوں نے دیواریں کھینچ دی ہیں۔ یہ دیواریں وقت کے ساتھ ساتھ اور بلند اور پختہ ہوتی جاتی ہیں۔

بھارتی اخبارات اور پاکستان کی خبریں

یہ 15 فروری کی صبح ہے۔ مجھے ابھی تک بھارت سرکار نے وی آئی پی ٹورسٹ بنا رکھا ہے۔ ایک اسٹیشمین گاڑی دے رکھی ہے۔ ایک سردار جی اس کے ڈرائیور ہیں۔ ایکسٹرنل پبلسٹی کے ڈائریکٹر ابھی پنجاب سے نہیں لوٹے ہیں۔ اس لیے میرا کوئی صحافیانہ پروگرام نہیں بن پا رہا ہے۔ فارن آفس کے سی ڈی شرما مجھے اپنے ڈپٹی سیکریٹری سے ملوا رہے ہیں۔ میں نے اپنا پروگرام انہیں لکھ کر دے دیا ہے۔

ملاقاتیں:

وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات۔

وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ سے انٹرویو۔

فیلڈ مارسل مانک شا سے انٹرویو۔

مختلف مقامات کا دورہ:

جنگی قیدیوں کے کسی کیمپ میں کچھ دیر کے لیے جانے کی اجازت۔

دوسرے شہر:

سری نگر (دو روز)

بمبئی (ایک روز)

راجپورہ پٹیالہ (ایک روز)

کلکتہ (دو روز)

آگرہ (ایک روز)

دہلی میں:

مرزا غالب، جامعہ ملیہ، مولانا ابوالکلام آزاد کے مزار پر، پارلیمنٹ کے اجلاس میں۔ وزیر اعظم سے ملاقات کے سلسلے میں مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا کہ یہ مشکل سے ہوگی کیونکہ اس وقت وزیر اعظم کے پاس کسی پاکستانی صحافی سے کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

میں پہلے سے ہی سوچ رہا تھا کہ اصل تو وہ تاثرات اور مشاہدات ہیں۔ جو میں یہاں قیام کے دوران کروں گا، اور وہ ہمارے قارئین کے لیے دلچسپی اور معلومات کا باعث ہوں گے۔ وزیر اعظم تو بے چاری وہی باتیں کہیں گی، جو پہلے سے کہتی آ رہی ہیں۔

آج کے اخبارات میں گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور کے مستعفی ہونے کی خبر شائع ہوئی۔ ہندوستان کے وقت کے مطابق صبح آٹھ بجے میں نے لاہور ریڈیو لگایا ہے۔ انگریزی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرحد اور بلوچستان کے گورنر برخاست کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو کی ہر ایک گھنٹے بعد کے بلیٹن میں یہ خبر پہلی خبر کے طور پر آ رہی ہے۔ بھارت کے لیے ظاہر ہے یہ بہت بڑی خبر ہے۔

کراچی سے چلتے ہوئے اس وقت کے گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور نے کہا تھا کہ ان کے ایک بھائی، جامعہ ملیہ دہلی میں پڑھتے تھے، دورانِ تعلیم ان کا انتقال ہو گیا تھا، اور وہ وہیں دفن ہیں، ان کے مزار پر فاتحہ ضرور پڑھ آیئے گا۔ آج میں اِدھر جانا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ فارن آفس کے مسٹر سپرا ہیں مدن سپرا تقسیم سے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان میں رہتے تھے۔ اب دہلی میں ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں یونیورسٹی بننے کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔ مجھ سے پورا پورا تعاون کر رہے ہیں۔ جامعہ ملیہ میں پہنچتے ہیں تو چھٹی کا وقت ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا مزار بھی یہیں ہے۔ جامعہ ملیہ مسلمانان ہند کی عظیم درس گاہ بلکہ تربیت گاہ مزار کا پتا پوچھتے پوچھتے ایک بہت پرانے استاد جواب ریٹائرڈ ہیں۔ جناب عبدالغفار سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ مزار پر ہمارے ساتھ آئے ہیں۔ آس پاس جناب ڈاکٹر انصاری اور ہمایوں کبیر بھی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ میں نے مرحوم تالپور کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ جس وقت فاتحہ پڑھ رہا تھا اس وقت میر رسول بخش تالپور سابق گورنر بن چکے تھے اور پھر اس عظیم درس گاہ کو سلام کرتا ہوا لوٹ آیا ہوں۔ اب مجھے امام الہند مولانا

ابوالکلام آزاد کی آخری آرام گاہ پر حاضری دینا ہے، وہ اسی جامع مسجد کے میناروں کے سائے میں سو رہے ہیں، جہاں انہوں نے ایک تاریخی تقریر کی تھی۔

''مسلمانو! جامع مسجد کے مینار تم سے جھک کر یہ سوال کرتے ہیں......'' جھونپڑوں' پان بیڑی بیچتے، خوانچہ برداروں' تاش کھیلتے بے فکروں میں سے ہوتے ہوئے مزار تک پہنچنا پڑتا ہے۔ جامع مسجد کے سامنے کے کھلے اور فراخ حصے کا حسن گئے زمانوں کی یاد بن گیا ہے۔

اب مجھے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی آخری آرام گاہ پر حاضری دینا ہے، وہ اسی جامع مسجد کے میناروں کے سائے میں سو رہے ہیں، جہاں انھوں نے ایک تاریخی تقریر کی تھی۔

''مسلمانو! جامع مسجد کے مینار تم سے جھک کر یہ سوال کرتے ہیں۔''

جھونپڑیوں، پان بیڑی بیچتے، خوانچہ برداروں، تاش کھیلتے بے فکروں میں سے ہوتے ہوئے مزار تک پہنچنا پڑتا ہے۔ جامع مسجد کے سامنے کے کھلے اور فراخ حصے کا حسن گئے زمانوں کی یاد بن گیا ہے۔ سڑک کے ساتھ جھونپڑیاں ہیں۔ اس کے بعد گھاس کے لانوں میں بے کار لوگوں نے ڈیرے لگا رکھے ہیں۔ اس میں ایک کونے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا مزار ہے۔ مزار کیا ہے۔ ایک قبر ہے اس پر چھولداری نما چھت ہے اس مزار نے گاندھی جی، نہرو اور شاستری کی سمادھیوں کی طرح جگہ نہیں گھیر رکھی ہے۔ کچھ روز بعد مولانا کی برسی ہے، اس لیے سفیدی وغیرہ ہو رہی ہے۔ میں فاتحہ پڑھ کر واپس ہوتا ہوں۔ راستے میں اخبارات کے دفاتر ہیں۔ انڈین ایکسپریس، ٹائمز آف انڈیا، ملاپ، پرتاپ، لنک۔ ان کے باہر اسکور بورڈ کی طرح اہم خبریں لگائی جاتی ہیں۔ آج ہر دفتر کے باہر یہی خبر ہے۔

صدر بھٹو نے بلوچستان اور سرحد کے گورنروں کو نکال باہر کیا۔

یہ بستی نظام الدین اولیا ہے۔ جدید عمارتوں میں گھری ہوئی قدیم بستی...... ادھر ایک پرانی چار دیواری میں گھرا ہوا سنگ مرمر سے بنا سادہ مزار۔ یہاں غالب مرحوم ابدی نیند سو رہے ہیں، عظیم، غالب۔ اردو کا جلیل القدر شاعر۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کوئی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کتنے ہنگامے،
کتنے خیالات،
کتنے استعارے،
کتنی تشبیہیں،
کتنے مضامین۔ اس قبر میں سمٹے ہوئے ہیں۔ مزار کے پیچھے غالب اکیڈمی کی عمارت ہے۔ آڈیٹوریم۔ جہاں ادبی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ اس کے نیچے تہ خانے میں چائے اور کھانے کے لیے کمرہ، اوپر لائبریری، دیوان غالب کے قدیم نسخے غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ مخطوطات۔ یہ میوزیم ہے جہاں غالب کے نوادرات جمع ہیں۔ غالب جو لباس پہنتے تھے، غالب جو کھانے کھاتے تھے وہ محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ مرغ مسلم، کوفتہ، قورمہ، دال ماش، غالب کے ہمعصر۔ غالب اکیڈمی کے خادم سلامت خان گائیڈ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ میں بتا بھی رہا ہوں کہ میں پاکستان سے آیا ہوں، وہ اسے سنے بغیر مجھے گائیڈ کرنے میں منہمک ہے۔ اپنا سبق رٹا ہوا ہے وہ شعر جو آپ کو یاد ہے۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

گو شعر بہادر شاہ ظفر کا ہے، مگر یہ اس وقت لکھا تھا جب وہ معزول ہو گئے تھے۔ یہ آتش ہے، یہ ناسخ ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔

اُردو ادب سے واقف ہوں مگر سلامت خان مصر ہیں کہ وہ مجھے ایک ایک تفصیل بتائیں گے کہ غالب نے کیا کچھ لکھا، ان سے پہلے اُردو کے شاعر کون کون تھے، ان کے بعد کون کون آئے۔ یہ آڈیٹوریم ہے۔ یہاں جلسے وغیرہ ہوتے ہیں کرائے پر لیا دیا جاتا ہے۔ یہاں لاؤڈ اسپیکر لگتا ہے۔

خالص ٹکسالی زبان میں سلامت خان کی باتیں لطف تو دے رہی ہیں، مگر اتنا وقت کہاں سے لاؤں۔ میں غالب اکیڈمی کے بارے میں کچھ معلومات کے لیے متعلقہ آفس سیکریٹری سے بات کرتا ہوں۔ غالب اکیڈمی کی زمین ۱۹۳۷ء میں غالب کے نام پر خریدی گئی تھی۔ مگر اس کی تعمیر ۱۹۶۹ء میں ہوسکی۔ بھارت کے اس وقت کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ گورننگ کونسل کے اولین ممبر تھے حکیم عبدالحمید کرنل بشیر حسین زیدی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، قاضی عبدالودود، مالک رام، کنور مہندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد فاروقی اور مسٹر پرتھوی چند۔

مزار غالب کے سامنے کافی بڑا حصہ ہے۔ اسے فرشی قوالی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ عظیم فکری شاعر ابدی نیند سو رہا ہے۔ لیکن اس کی غزل اس کی فکر، اس کی سوچ، خوشبو بن کر احساس بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی یاد میں قائم کی ہوئی غالب اکیڈمی، ادب اور علم کی روشنی پھیلا رہی ہے۔

ہوٹل واپسی پر جی این بھٹ صاحب سے ملاقات ہوتی ہے، وہ آج ہی لدھیانہ وغیرہ سے واپس آئے ہیں۔ تھکے ہوئے ہیں، اگلے روز ملنے کا پروگرام بنتا ہے۔

دہلی میں تین روز گزر چکے ہیں۔ رات کو ۲۶۳ نمبر کمرے کی کھڑکی ویران روشنیوں کا منظر پیش کرتی ہے۔ ریڈیو سے خبریں گانے اور پاکستان کی یادیں۔ میں یہاں سے کوئی خط لکھ سکتا ہوں نہ کوئی اور وسیلہ ہے۔ سوائے ریڈیو کے۔ بلوچستان سرحد کی خبریں چل رہی ہیں۔

۱۶ فروری کی صبح۔ ہندوستان کے تمام اخبارات کی شہ سرخی بلوچستان اور سرحد کے گورنروں کی برطرفی ہے۔ سب نے پاکستان کا نقشہ بھی شائع کر رکھا ہے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے اخبار ''ٹائمز آف انڈیا'' نے تو آٹھ کالمی سرخیاں لگائی ہیں۔ پہلا صفحہ نصف سے زیادہ اسی خبر کے لیے وقف ہے۔ کارٹون، خبریں، یوں لگتا ہے کہ پاکستان میں سخت گڑبڑ ہوگئی ہے۔

بلوچستان، سرحد میں انقلاب آگیا ہے۔ ولی خان کا دھمکیوں بھرا بیان بھی خوب بڑھا چڑھا کر شائع کیا گیا ہے۔ بزنجو صاحب بھی کہہ رہے ہیں کہ مزاحمت کی جائے گی۔''

میں پردیس میں ہوں گھبرا رہا ہوں، کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ میں جب پاکستان سے چل رہا تھا، اس وقت بھی کچھ ایسی توقعات تھیں کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے، لیکن اتنی جلدی امید نہ تھی کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ میں اخبارات پڑھ رہا ہوں۔ ریڈیو لاہور سے صبح کی انگریزی کی خبریں سنتا ہوں۔ کوئی اور خطرناک خبر سننے میں نہیں آئی۔ شاستری بھون میں جے این بھٹ صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوتی ہے۔ پھر ایکسٹرنل پبلسٹی کے انچارج اور وزارتِ خارجہ کے جوائنٹ سیکریٹری مسٹر ایس کے سنگھ سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری طرف سے آپ کو آزادی ہے۔ جہاں چاہے جائیں اور پھر جا کر جو مرضی لکھیے۔ شخصیتوں سے انٹرویوز میں زیادہ دلچسپی نہ لیجیے گا، کیونکہ یہ اتنے مفید نہیں ہیں جتنا آپ کے مشاہدات۔ ہم پاکستانی اور بھارتی ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوئی بھی دوسرے کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گا اور نہ آپ پر پابندی لگاؤں گا کہ آپ یہاں جائیں۔ وہاں نہ جائیں۔ آخر میں جا کر جو پروگرام بنا اس میں مجھے سرینگر جانے کی اجازت مل رہی ہے اور نہ جنگی قیدیوں کے کسی کیمپ کے مشاہدے کا موقع دیا جا رہا ہے باقی پروگرام البتہ ٹھیک ہیں۔

اس دوپہر کو میں پہلی بار'' پریس کلب آف

انڈیا'' بھی جاتا ہوں، دہلی کا پریس کلب۔ کراچی کے پریس کلب کی طرح پرانی سی بلڈنگ میں ہے۔ فرق یہ ہے کہ پریس کلب آف انڈیا، کراچی پریس کلب کی طرح خشک نہیں ہے۔ باقی صحافی اسی بے فکری سے یہاں بھی بیٹھے ہیں۔

چونکہ ناؤنوش کا انتظام ہے، اس لیے اور بھی دیر تک بیٹھتے ہیں اور یہاں کچھ پرانے صحافیوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ کئی صحافیوں کو پاکستانی صحافی سے مل کر اپنے پرانے شہر یاد آ گئے ہیں، ان میں کچھ لاہور سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ انھیں بے ساختہ لاہور یاد آ گیا ہے۔ پنجابی زبان میں پھر لاہور کی یادیں تازہ ہوتی رہیں۔ میں تین روز کے لیے پریس کلب کا عارضی رکن بھی بن گیا ہوں۔

یہ آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس ہے

آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس سے کے کے نیئر میری تلاش میں ہیں۔ ان سے فون پر بات ہوئی، مجھے اب ان کی طرف جانا ہے۔ میں نے آتے ہی دوسرے روز ان لوگوں سے رابطے کی کوشش کی تھی، مگر ملاقات نہ ہوئی۔ اب اچھا ہے سب سے مل لوں گا۔ انھوں نے میری شکل نہیں دیکھی 'اخبار جہاں' میں تصویر دیکھی ہے۔ اخبار جہاں، دو ہفتے بعد ان تک پہنچ جاتا ہے، کیسے...... یہ سوئزرلینڈ کے سفارت خانے کو معلوم ہے۔ میں گیٹ پر پہنچتا ہوں تو وہ مجھے پہچان لیتے ہیں۔ نیئر، عمیق حنفی، محمود ہاشمی میں پہلی بار ان سے ملا ہوں، کتنا خلوص، پیار ملا ہے۔ یہ اخبار جہاں کے مستقل قاری ہیں، میرا ان سے صحافت کے علاوہ ادب کا رشتہ بھی ہے۔ عمیق حنفی اور میں مولانا صلاح الدین احمد کے 'ادبی دنیا' میں کئی بار اکٹھے چھپے ہیں۔ میں ان کے لیے اجنبی نہیں ہوں اور لوگ بھی آ گئے ہیں۔ اناؤنسر، اسکرپٹ لکھنے والے۔ ایک بزرگ آرٹسٹ ملتے ہیں دینا ناتھ زتشی۔ وہ پاکستان میں مجید ملک صاحب کے لیے یہ پیغام پہنچانا چاہتے ہیں کہ میں بالکل بخیریت ہوں، اب بھی آپ یاد آتے ہیں۔ یہ ادیب، شاعر اور فنکار پاکستان کے ادب اور فن کے بارے میں مجھ سے بہت کچھ پوچھنا اور جاننا چاہتے ہیں۔ کون کون لکھ رہا ہے۔ کیا لکھا جا رہا ہے۔ کون سی کتابیں چھپی ہیں، رسالے کون کون سے شائع ہو رہے ہیں۔ پھر یہی کچھ انٹرویو میں بھی پوچھا جاتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے لیے عمیق حنفی انٹرویو کر رہے ہیں۔ ایک دشمن ملک کے مرکزی ریڈیو اسٹیشن کے ایک اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے میں کتنا عجیب محسوس کر رہا ہوں۔

پاکستان کے ادیب کیا لکھ رہے ہیں۔

موجودہ جمہوری حکومت کے آنے سے ادیب اور صحافی کچھ لکھنے کی آزادی محسوس کرتے ہیں؟

گزشتہ دو تین برس میں پاکستان پر جو کچھ گزری۔ اس پر اہل قلم نے کچھ قابل ذکر ادب پارے لکھے۔

گفتگو ادب اور صحافت کے آس پاس ہی رہتی ہے۔ سیاست نہ وہ چھیڑتے ہیں اور نہ میں وہاں جواب دینے کو تیار ہوں۔ ان دوستوں کا کہنا ہے کہ انٹرویو اچھا رہا ہے مجھے بہر حال اُردو کے اتنے لکھنے والوں سے ملنے کا موقع مل گیا ہے۔ انٹرویو کا کیا ہے۔ ہوٹل پہنچتا ہوں۔ ایک اور انٹرویو، ہندوستان ٹائمز کے ''ایوننگ نیوز'' کے لیے۔ راجندر کمار پاکستان کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔ مانک شا نے کہا کہ پاکستان اب بھی ہندوستان کے لیے خطرہ ہے۔ میرا کیا ردعمل ہے!'' ایک دس گنا بڑا ملک، تمیں اسلحہ ساز فیکٹریاں، اپنے ٹینک، اپنے طیارے بنانے والا۔ اس کے لیے ایک چھوٹا سا ملک جو چھوٹے چھوٹے اسلحے کے لیے بھی دوسرے ملکوں کا محتاج ہے، وہ کیسے خطرہ بن سکتا ہے۔ بھارت کو یہ واویلا چھوڑ دینا چاہیے۔ اس سے کبھی فائدہ نہ ہوگا اور نہ اس سے کبھی دوستی ہو سکے گی۔ کیونکہ پاکستان کے عوام سمجھ لیتے ہیں کہ ہندوستان یہ واویلا کر کے کچھ اور مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

میں نے دہلی پہنچ کر شمع والوں کو فون کیا تھا۔ ماہنامہ ''شمع'' دہلی ہندوستان میں اب بھی اردو کو

زندہ ہی نہیں بلکہ مقبول رکھے ہوئے ہے۔ اتنی اشاعت کسی انگریزی یا ہندی ماہنامے کی بھی نہیں ہوگی۔ ڈیڑھ لاکھ سے اوپر۔ خوب صورت فوٹو آفسٹ طباعت، دیدہ زیب کتابت، تصاویر، ادریس دہلوی صاحب کا فون آتا ہے ان کا گھر ہوٹل سے قریب ہی ہے۔ وہ آ رہے ہیں۔ میری ان سے یہ پہلی ملاقات ہے۔ لیکن میں انھیں ان کی رسالے کے ذریعے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ مجھے برسوں سے جانتے ہیں، اہل قلم اجنبی ہوتے ہوئے بھی اجنبی نہیں ہوتے، اس ادارے نے مسلسل محنت کے بعد اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے۔ ادریس صاحب بتا رہے ہیں کہ انھوں نے ''اخبار جہاں'' سے صدر بھٹو اور ولی خان کے انٹرویو لے کر اپنے دوسرے ماہنامے ''شبستان ڈائجسٹ'' میں شائع کیے تھے۔ وہ دونوں اشاعتیں انھوں نے مجھے دی ہیں۔ ''شبستان'' نے اپنے ہندوستانی قارئین کو پاکستان سے باخبر رکھنے کے لیے ایک مستقل سلسلہ ''آئینہ پاکستان'' شروع کر رکھا ہے۔ جس میں پاکستان کی مختصر مختصر، دلچسپ خبریں دی جاتی ہیں، جو زیادہ تر غیر سیاسی ہوتی ہیں۔ ادبی، ثقافتی اور صحافتی خبریں۔ یہ سلسلہ پریس ایشیا انٹرنیشنل کے تعاون سے چل رہا ہے ہندوستان والے پاکستان کے بارے میں کتنا تجسس رکھتے ہیں یہ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے۔

راجپورہ پٹیالہ۔ بچپن کی یادیں

اگلی صبح مجھے اپنے آبائی شہر راجپورے کے لیے روانہ ہونا ہے۔ وہاں اس وقت میرا کوئی نہیں ہے، صرف بچپن کی یادیں ہیں۔ میں پانچ برس کا تھا، جب میرے خاندان نے آگ اور خون کے درمیان پاکستان کی طرف سفر اختیار کیا تھا۔ ہم اس وقت انبالے میں تھے، اس لیے بچ گئے تھے۔ ورنہ راجپورے میں ہمارے خاندان کا کوئی فرد بھی تو نہیں بچا تھا، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا، کتنی بے بسی تھی کہ ہم چند میل دُور جا کر اپنے خون کے رشتوں کو بھی دریافت نہیں کر سکتے تھے، کہ کس حال میں ہیں۔ میرے تایا، چچا، بھائی بہنیں، جن کے بغیر کبھی وقت نہیں گزرتا تھا۔ آج ان سب کو چھوڑ کر ہم جا رہے تھے۔ ایک الگ مملکت کی طرف۔ جہاں ہندوستان کی مسلم اقلیت اکثریت میں ہوگی۔ جہاں مسلمان اپنے مستقبل کے خود مالک ہوں گے۔ ہم ایک مال گاڑی کے کھلے ڈبے میں بیٹھے تھے۔ بس اتنا یاد ہے، شور، گولیاں۔ لاہور کا ریلوے اسٹیشن۔ جہاں زخمی، کٹے پھٹے ہاتھ پیروں والے انسان۔ یہ سب بیسویں صدی کی باتیں ہیں۔ یہ ہمارا ماضی قریب ہے۔

جس شہر میں میرے آباؤ اجداد صدیوں سے رہ رہے تھے۔ اس سے میری چند دھندلی سی یادیں وابستہ ہیں۔ ایک منزلہ مکان، اس کے پیچھے ایک پیپل کا بوڑھا درخت اور اس سے ذرا دور ریلوے پلیٹ فارم کا پل۔ اسٹیشن کے دروازے کی مخالف سمت میں ہمارا گھر تھا۔ آج ۲۵ سال بعد میں اس طرف جا رہا ہوں۔ میرے گھر میں سے بھی کوئی اس طرف نہ آیا تھا، آتے کیسے، کیارہ گیا تھا۔

آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

معلوم نہیں رابطہ بھی یاد رہے کہ نہیں۔ چلو اپنا آبائی شہر تو دیکھ لوں گا۔ میرے ساتھ مسٹر مدن سپرا ہیں۔ ٹورزم کارپوریشن کی نئی امپالا گاڑی۔ صبح سویرے دہلی چھوڑ کر ہم ہریانہ کی سمت رواں ہیں۔ دہلی کی حدود ختم ہوں گی، تو ہریانہ آئے گا۔ پھر پنجاب ظالموں نے پنجاب کے کتنے حصے کر دیے ہیں۔ پنجاب والوں سے لوگ اِدھر بھی خوف زدہ ہیں اور اُدھر بھی۔ اِدھر والوں نے پنجاب کو پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش میں بانٹ دیا ہے۔ ہم گرانڈ ٹرنک روڈ پر رواں تھے، جسے جرنیلی سڑک بھی کہتے ہیں۔ شیر شاہ سوری نے اپنے مختصر سے عرصہ اقتدار میں کتنا تعمیری کام کیا تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ مقررہ فاصلوں پر کبھی دائیں کبھی بائیں پرانے ستون نظر آتے ہیں۔ یہ مینار نما ستون۔ مغلوں کے زمانے کی ''لائٹ پوسٹیں'' ہیں جو ہر کاروں کی رہنمائی کے لیے ہوتے تھے۔ اس سڑک سے جانے کتنے قافلے کتنے لشکر گزرے ہیں۔ سونی پت، پانی

پت کرنال، پانی پت آتا ہے تو میں پانی پت کے میدان کی تلاش میں ہوں۔ مسٹر سپرا بتاتے ہیں کہ میدان تو اب کہیں نہیں ہے۔ صرف دروازے بنے ہوئے ہیں جن سے یہ نشاندہی کی جاتی ہے کہ بابران دروازوں سے داخل ہوا تھا۔ سڑک کافی کھلی اور اچھی ہے۔ صبح صبح ٹریفک بھی زیادہ نہیں ہے۔ سائیکل والے پریشان کرتے ہیں۔ ایک سائیکل والا اپنے گاؤں سے نکل کر سیدھا سڑک عبور کرنا چاہتا ہے۔ بس عین سر پر ہے۔ بس والا سائیکل کو بچاتا ہے لیکن بس پر قابو نہیں پاسکتا۔ بس نیچے کھڈ سے ہوتے ہوئے کھیت میں گھس جاتی ہے۔ ہماری گاڑی اس بس کے عین پیچھے ہے۔ یہ پورا منظر فلم کی طرح ہمارے سامنے گزرا ہے۔ سائیکل والا اور سائیکل دونوں بچ گئے ہیں۔ بس بھی بچ ہی گئی ہے۔ بالکل سیدھی جاکر نیچے پھنس گئی ہے۔ سواریاں باہر نکل رہی ہیں۔ ڈرائیور نے اتر کر سائیکل والے کی پٹائی شروع کر دی ہے۔ ہم تھوڑی دیر رکتے ہیں پھر چل پڑتے ہیں۔ پنجاب میں داخل ہوتے ہیں، کچھ دور جاکر مسٹر سپرا ایک جگہ دکھاتے ہیں کہ یہاں شیر پنجاب مسٹر پرتاب سنگھ کیروں کو دن دیہاڑے قتل کیا گیا تھا۔ ایک درخت پر ایک کتبہ اس یاد میں لگایا ہوا ہے۔ سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر کے گاڑی رکوالی گئی اور پھر گولیوں سے کیروں کا جسم چھلنی کر دیا گیا ہے۔ سیاسی تشدد ہندوستان میں چلتا رہتا ہے۔

یہ انبالا ہے۔ میرے ننھیالی اس شہر کے ہیں اس سے بھی کچھ تعلق ہے۔ یہاں سڑک کے کنارے رک کر اس یاد میں چائے پیتا ہوں۔ اب اس شہر میں جنگی قیدیوں کا کیمپ بھی ہے۔ کون جانے وہ کن حالات میں ہوں۔ میں راجپورے کے نزدیک پہنچ رہا ہوں، یا راجپورہ میرے نزدیک آرہا ہے۔ راجپورہ آٹھ میل، چھ میل، چار میل، آبادی شروع ہوگئی۔ ریلوے پھاٹک کے قریب جاکر گاڑی رک جاتی ہے۔ کسی سے پوچھ لوں۔ سب تقسیم کے بعد آئے ہیں۔ انھیں کیا خبر۔ پھاٹک عبور کرنے کی بجائے ہم دائیں ہاتھ والی سڑک پر ہولیتے ہیں۔

ریلوے پل سے پکڑ کر پٹائی کرتے ہوئے گھر لایا کرتے تھے۔ پل سے گزر کر زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ وہ سامنے پیپل کا درخت ہے، وہ گھر ہے یہاں گاڑی روک دو۔ یہ گھر اسی حالت میں ہے۔ وقت ٹھہر گیا ہے۔ غریب گھروں میں وقت ٹھہرا ہی رہتا ہے۔ میں نے کراچی سے چلنے سے پہلے اپنے والد صاحب کو جھنگ خط لکھ کر کچھ نام منگوا لیے تھے۔ شاید کوئی جاننے والا مل جائے۔ سامنے ایک ایل ایس ایم ایف قسم کا ڈاکٹر ہے۔ اس سے پوچھتا ہوں، وہ مجھے بڑے شک وشبہ سے دیکھتا ہے مسٹر سپرا اسے بتاتے ہیں کہ یہ ہمارے سرکار کے مہمان ہیں۔ یہاں رہتے تھے، اپنا مکان دیکھنے آئے ہیں۔ شاید ڈاکٹر صاحب کو یقین نہیں آتا ہے۔ شاید ڈر رہے ہوں کہ مکان پر واپس قبضہ کرنے آئے ہیں یا انھیں کچھ اور یاد آرہا ہو بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہہ رہے، میں نے کچھ نام گنوانے شروع کیے۔

یہ بھی سرگباشی ہوگئے۔

یہ بھی چل بسے۔ صرف ایک بڑے میاں سردار پرتاپ سنگھ زندہ ہیں۔ ایک بچہ ہمیں ساتھ لے کر ان کے گھر لے چلتا ہے۔ گھر میں نہیں ملتے، پھر اسی دکان پر آتے ہیں۔ انھیں خبر مل گئی۔ وہ آرہے ہیں اور بھی لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ میرے والد کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ انھیں بھی معلوم تھا کہ ہمارے رشتے داروں میں سے کوئی نہیں بچا تھا۔ میں سب کے چہرے دیکھ رہا ہوں۔ میرے تایا چچا، تایا زاد بھائی بہنیں۔ سب یہیں رہتے تھے۔ یہیں ان کا خون بہایا گیا، شاید ان میں سے بھی کسی نے ان کے خون سے ہاتھ رنگے ہوں۔ میں اپنے ہی قاتلوں کے درمیان ہوں۔ پرتاپ سنگھ نوے کے لگ بھگ ہیں۔ ایک اور لالہ جی آتے ہیں۔ انھیں پتا چلتا ہے کہ میں صوفی شیر محمد کا بیٹا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ مجھے آشیرباد دینے دو۔ وہ تو بہت اچھے آدمی تھے۔ لیکچر شروع کرتے تو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ کانگریس میں تھے جب قہر آیا تو کسی نے نہ

پوچھا کون کانگریسی، کون مسلم لیگی۔ یہ راگ تو کئی برس پہلے آ گیا تھا۔

میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا

لیکن یہ راگ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس قہر میں پورے ہوتے دیکھا۔ ہم صدیوں سے اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جب قہر شروع ہوا تو سب رشتے بھول گئے۔ میرے گھر میں ایک مسلمان لڑکی بھاگتی ہوئی جان بچانے آ چھپی۔ دیہات سے تین چار سوجنے آ گئے تھے کہ باہر نکالو۔ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ ہمارے شہر کی عزت ہے۔ مجھے مار لو۔ پھر بے شک اسے نکال لینا۔ میں نے لڑکی کو نہیں لے جانے دیا۔ لیکن اس شہر میں کیا کچھ نہ ہوا۔

آپ لوگ اب کیسے ہیں۔ گھر والے سب خیریت سے ہیں۔

”یہاں سے تو بہتر حالت میں ہوں گے۔“

”یقیناً یہاں سے ہم وہاں اچھی حالت میں ہیں۔ میں اپنے شہر کا صرف پانی پیتا ہوں۔ اپنے مکان کو سامنے کی دکان پر بیٹھے اجنبی کی طرح تکتا ہوں۔ اس مکان کے آج کل کے مکین گھر میں نہیں ہیں، اس لیے ملاقات نہیں ہوتی۔ مکان اسی حالت میں ہے، گلیاں اسی طرح ہیں۔ دکانیں اسی طرح ہیں، انسان بدل گئے ہیں۔ میں اور زیادہ یہاں نہیں رک سکتا۔ جانے کیا کچھ یاد آئے۔ چلتے چلتے پھر اپنے مکان پڑوسیوں، پیپل کے درخت پر نظر ڈال کر چل پڑتا ہوں۔

ریلوے پھاٹک عبور کر کے ہمارا رخ پٹیالے کی طرف ہے۔

پٹیالہ سکھوں کی ریاست۔ مہاراجہ پٹیالہ۔ اس سے کتنے قصے وابستہ ہیں۔ اب پٹیالہ چھوٹا سا ایک ضلع ہے۔ اپنے پنجاب جیسی سڑکیں، ہرے بھرے کھیت، بیل گاڑیوں پر سبزیاں، چارہ لادے سکھ کسان شہروں کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ پٹیالہ یونیورسٹی ہے۔ پنجابی کے لیے یہاں بہت بڑے پیمانے پر کام ہو رہا ہے۔ پٹیالے میں مجھے کوئی بات معلوم نہیں ہے۔ اندازاً جا رہا ہوں۔ شیرانوالہ دروازہ یاد ہے۔ پٹیالہ اب صرف پرانے دروازوں میں ہی سمٹا ہوا نہیں ہے۔ پھیل گیا ہے۔ بازار میں کتنا رش ہے۔ پٹیالہ سائیکل سوار لڑکیوں کا شہر ہے۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں، سائیکل ہی سائیکل۔ ٹائپ سکھانے کے مرکز۔ یہاں شیرانوالہ گیٹ کے پاس جا کر میں کچھ پتے معلوم کر رہا ہوں۔ ہندو، سکھ، بوڑھے، جوان مجھے نہیں جانتے، لیکن مجھے اپنے پاس بٹھا رہے ہیں۔ ٹھنڈا پلا رہے ہیں۔ پٹیالے کی زبان میں بھول چکا ہوں۔ ایک بار پھر سنائی دے رہی ہے۔ اشفاق احمد کا پروگرام تلقین شاہ اس زبان کی وجہ سے مقبول ہے۔ ایک بڑے میاں کہتے ہیں۔ ”تم ذرا ایتھیں رکو۔ میں ہنی اپنے گھر نوں پچھ کے آندا۔“ وہ اپنے گھر پوچھنے گئے ہیں۔ معلوم نہیں ہوتا۔ میں چوک انار دانہ کی طرف جاتا ہوں۔ سائیکل سوار لڑکیاں اس تنگ بازار میں ہجوم میں سے سائیکل گزار رہی ہیں۔ شفیع عقیل صاحب کے لیے کچھ گورمکھی کتابیں چاہئیں۔ ایک دکان سے کچھ کتابیں ملتی ہیں۔ بہت سستی کتابیں ہیں۔ پٹیالہ یونیورسٹی کے ”لسانیات و ترجمہ وتصنیف“ کے شعبے نے کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بڑا زبردست کام کیا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی پنجاب کے بارے میں شائع ہو، یہ اسے انگریزی میں بھی چھاپتے ہیں، اس کا ترجمہ گورمکھی میں شائع کرتے ہیں۔ پھر انتہائی سستے داموں فروخت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۷۵ روپے کی کتاب ان کے ہاں چھپے تو پانچ روپے میں مل جاتی ہے۔ پنجاب میں گورمکھی کو سرکاری اور دفتری زبان بنانے میں سب سے اہم کردار پٹیالہ یونیورسٹی نے ہی ادا کیا ہے۔ انھوں نے فوراً گورمکھی کے سینکڑوں ٹائپ رائٹر حاصل کیے، دفتری کارروائیوں میں استعمال ہونے والی تمام انگریزی اصطلاحات دفتری نوٹ اور دفتری زبان کے گورمکھی مترادفات تلاش کیے۔ ان کے چارٹ بنائے۔ تمام دفاتر کو لکھا گیا کہ وہ آ کر اپنے انگریزی ٹائپ رائٹروں کو گورمکھی ٹائپ رائٹروں سے تبدیل کر لیں۔ ہر دفتر کے ہر میز کو چارٹ مہیا کر دیا گیا۔

ان کو دیکھ دیکھ کر تمام دفتری کاروائی گورمکھی میں ہوگئی۔ اپنی زبان کو دفتری زبان بنانے والے ایسے کام کرتے ہیں۔ ہماری طرح ترقی اردو بورڈ، انجمن ترقی اردو، تحقیقی ادارے، کمیشن نہیں بٹھائے جاتے، جہاں لوگ تنخواہیں وصول کرتے ہیں اور ایک لغت بھی تیار نہیں کر پاتے۔ پنجابی ادب، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، معاشیات غرض ہر موضوع پر گورمکھی میں پنجاب موجود ہے۔ گورمکھی ٹائپ سکھانے کے لیے جگہ جگہ اسکول کھلے ہوئے ہیں۔ لڑکیاں لڑکے دھڑا دھڑ ٹائپ سیکھ رہے ہیں۔

عدالت بازار سے کچھ کتابیں دیکھتا ہوں۔ یہ سرہندی دروازہ ہے۔ کراچی میں پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر افضال حسین زیدی یہاں رہتے تھے۔ میں اس دروازے کو ان کا سلام پہنچاتا ہوں۔ ہماری گاڑی چوک انارروانہ میں کھڑی ہے۔ سائیکل سائیکل رکشوں، سرداروں اور مریندر گوردوں میں سے گزرتے اپنی امپالا DZL-590 کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں اس شہر میں ۲۵ برس بعد آیا ہوں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی مرتبہ۔ انہی گلیوں میں کہیں میرا بچپن گزرا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہی ہیں۔ میں نے بھی تو ان گلیوں کو یاد نہیں رکھا۔ راجپورہ مجھے یاد رہا ہے۔ اسی لیے راجپورہ نے مجھے یاد رکھا۔ پٹیالہ میں ہمارے والد صاحب کے دوست سوڈھی دیال سنگھ تھے۔ ان کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ ایک اور دوست تھے مسٹر برش بھان۔ اس کا فون نمبر مل گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ چنڈی گڑھ منتقل ہوگئے ہیں۔ وہیں رہتے ہیں چنڈی گڑھ تو میں جا سکتا۔ کیونکہ اتنا وقت نہیں ہے۔ ایک مسلمان غلام صابر ملتے ہیں۔ ان کے پاس کوئلے کا ڈپو ہے۔ اچھے کھاتے پیتے شخص ہیں۔ ان سے مل کر کچھ لوگوں کی بابت دریافت کرنا چاہا۔ انھیں بھی کچھ پتا نہیں۔ ان کی زبانی علم ہوتا ہے کہ تین چار گھر مسلمانوں کے اب بھی پٹیالے میں ہیں۔ شیرانوالہ دروازے سے ہم شہر سے باہر نکل آئے ہیں۔ پٹیالہ۔ اب بڑا شہر بن گیا ہے۔ ریاست ختم ہوگئی ہے۔ عام ضلعوں سا ضلع ہے۔ پٹیالہ یونیورسٹی، پھر راجپورہ، پھاٹک بند ہے۔ کچھ دیر پھر راجپورہ کی فضا میں سانس لینے کا موقع مل گیا ہے۔ راجپورہ مجھ سے دور ہو رہا ہے۔ جانے پھر کبھی آنا ہو یا نہ ہو۔ اب بھی تو ۲۵ برس بعد آنا ہوا ہے۔ یہ انبالہ ہے۔ میرے ننھیال یہاں رہے تھے۔ انبالے کے عین سامنے گاڑی روک کر ہم نے اپنا لنچ شروع کیا ہے۔ انبالہ، کرنال، پانی پت، سونی پت، دہلی۔ وہی راستے جن سے گزرے تھے۔ رات کے اندھیرے پھیلنے لگے ہیں۔ اشوکا ہوٹل، وہی کمرہ ۲۶۳۔ صبح آگے جانا ہے۔ تاج محل دیکھنے۔ اپنی تاریخ کی ایک عظیم یادگار۔

راجپورے کا تاثر ابھی تک ذہن میں ہے۔ نظم شروع ہوگئی ہے۔

وہی دیوار و در وبام وہی پیڑ مگر
اپنے بچھڑے ہوئے چہروں کو کہاں سے لاؤں
ان کی مٹی ہے نہ خوشبو ہے نہ سایا ہے کہیں
اپنے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو کہاں سے لاؤں
میرے بیٹے، وہ مرے بھائی ہیں اے شہر کہاں
اپنی بانہوں، تری آنکھوں کو کہاں سے لاؤں
چلمنو! یاد تو ہوگی تمھیں ان کی عفت
اپنی بہنوں کی دعاؤں کو کہاں سے لاؤں
اجنبی بن کے میں اپنا ہی مکاں تکتا ہوں
آہ! بیتے ہوئے لمحوں کو کہاں سے لاؤں
مری دھرتی، مری بستی، مرے آبا کی زمیں
میرا بچپن، مری یادیں، مجھے واپس کردے
تجھ سے اب توڑنے آیا ہوں میں سارے رشتے
اپنی بیٹی کے تقدس کی حفاظت نہ کرے
وقت پڑجائے تو بیٹوں کا لہو پی جائے
ایسی دھرتی سے بھلا کیسے تعلق رکھوں
میری یادیں، مرا بچپن مجھے واپس کردے
تجھ سے اب توڑنے آیا ہوں میں سارے رشتے

یکبارگی کتنی تنہائیوں نے مجھ پر حملہ کردیا ہے۔ کاغذ پر لفظ اتر رہے ہیں اور آنکھ سے آنسو۔ کیسا عجیب احساس ہے کہ اس ۵۵ کروڑ کے ملک میں اس وقت ویزے پر آنے والا میں اکیلا پاکستانی ہوں۔

واہگہ سے شیلانگ تک کوئی اور پاکستانی اس طرح یہاں نہیں ہے۔ میں ایک دشمن ملک میں ہوں۔ جہاں میری ۹۰ ہزار بھائی کیمپوں میں قید کاٹ رہے ہیں۔ عالمی اخلاقیات پامال ہیں۔ جنیوا کنونشن سرنگوں ہے۔ اس کے اصول شرمسار ہیں۔ کسی کیمپ میں مجھے جانے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ شاید آتے جاتے کسی کیمپ پر نظر پڑ جائے، انبالے میں بھی ایک کیمپ ہے وہ تو کیمپ دکھائی نہ پڑا۔ آگرے کی طرف بھی ایک کیمپ ہے۔ دیکھیں ادھر جاتے کچھ نظر آ جائے۔

تاج محل میں

رات بیت جاتی ہے۔ صبح ساڑھے سات بجے فارن آفس کے مسٹر سپرا پہنچ جاتے ہیں، مسٹر سپرا۔ بڑے مستعد اور فرض شناس ہی نہیں بلکہ مجھ سے ہر طرح تعاون کر رہے ہیں۔ ان کی اصطلاح میں ''ڈیلی گیٹ'' کہلاتا ہوں۔ ہر روز شام کو وہ اپنے افسر مسٹر سی، ڈی شرما کو رپورٹ بھی کر دیتے ہیں۔ ''ڈیلی گیٹ'' نے اپنا پرانا گھر بھی دیکھا بہت خوش تھے۔ سفران کے اطمینان کے مطابق رہا۔ مجھے فائدہ یہ ہے کہ وہ پنجابی بولتے ہیں، اس لیے پنجابی میں تفصیل سے اور بے تکلفی سے باتیں ہو جاتی ہیں، میرے ساتھ آج ترکی کی صحافی خاتون پھر جا رہی ہیں۔ انھیں لودھی ہوٹل سے لے کر ہم آگرے کی طرف روانہ ہیں۔ یہ فاصلہ دہلی راجپورے سے کم ہے۔ لیکن سڑکیں اور آس پاس کھیت ویسے ہی ہیں۔ اتنی ہریالی اور خوشحالی نہیں ہے۔ صبح کا عالم ہے۔ عورتیں اور لڑکیاں گاؤں سے نکل کر سڑک عبور کر کے کنوؤں سے پانی بھرنے جا رہی ہیں۔ گاگریں ان کے سروں پر رکھی ہیں۔ منہ دوپٹوں میں چھپے ہیں۔ ترک صحافی خاتون ان کی تصویر لینے کے لیے ایک جگہ گاڑی رکواتی ہیں۔ لڑکیاں تصویر بنوانے کے لیے تیار ہیں مگر چھوٹے چھوٹے لڑکے آ جاتے ہیں۔ ایک لڑکا بہت تیز ہے۔ وہ لڑکیوں کو بھگا دیتا ہے اور انگریزی میں صرف ایک لفظ بار بار بول کر اپنی شرط پیش کرتا ہے۔ (Money) وہ تصویر نہیں بن پاتی۔ غیر ملکی سیاحوں نے سڑک کے آس پاس رہنے والے دیہاتیوں کی عادت ڈال دی ہے۔ یہ سڑک آگرے تک جانے کے لیے بہت استعمال ہوتی ہے۔ آگرے کے لیے ریلوے نے ایک اسپیشل ٹرین چلا رکھی ہے۔ جو صبح دہلی سے روانہ ہوتی ہے، شام کو لوٹتی ہے۔ ہوائی جہاز بھی جاتا ہے اور شام کو واپس آ جاتا ہے۔ لگژری بسیں بھی اسی حساب سے چلتی ہیں۔ کار میں جانا چاہیں تو وہ بھی مل جاتی ہے۔ رات کو وہاں قیام کرنا ہو تو اس کا بھی بندوبست ہے۔

590 DZL دوڑ رہی ہے۔ یہ پرانا گاؤں اور یہ قصبہ۔ یہ چھاتہ قلعہ ہے۔ یہاں اکبر کی فوج آتے جاتے ریسٹ کیا کرتی تھی، یہ وسیع و عظیم قلعہ اسی آرام کے لیے بنایا گیا تھا۔ آگرہ نزدیک آ رہا ہے۔ آس پاس مغلوں کے لائٹ ٹاور اب بھی نظر آ رہے ہیں۔ یہ اسکندریہ ہے۔ یہاں مغل شہنشاہ اکبر ابدی نیند سو رہا ہے۔ اکبر ہندوؤں کا اور موجودہ ہندوستان کا پسندیدہ مغل بادشاہ ہے۔ کیونکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے یکساں سلوک کیا تھا ایک ہندو خاتون سے شادی کر کے اسے بھی مہارانی کا لقب دے دیا تھا۔ اکبر کا یہ مقبرہ لاہور میں جہانگیر کے مقبرہ سے ملتا جلتا ہے لیکن مقبرہ جہانگیر کی طرح بے بسی اور کسمپرسی کا شکار نہیں ہے۔ سیاحتی کارپوریشن والے بھی کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ ان کے تحفظ کے لیے مسلسل مصروف ہے۔ ہر مقبرے کے باہر ان کے بارے میں تصاویر اور لٹریچر مل جاتا ہے۔ گائیڈ بھی دستیاب ہیں جو تاریخ دہراتے ہیں ہمارے زاویے سے اگر چہ تاریخ مسخ کرتے ہیں، لیکن غیر ملکی سیاحوں اور اہم شخصیتوں کو تو قائل کر لیتے ہیں۔ بہت وسیع اور فراخ مقبرہ ہے۔ گھاس کے لان، درخت، لنگور، غیر ملکی اور ملکی سیاح، آج اتوار ہے۔ اس لیے رش اور زیادہ ہے قبر پر فاتحہ پڑھتا ہوں۔ گائیڈ بتاتا ہے کہ عمارت کی چار برجیاں چار مختلف طرز ہائے تعمیر کی نشاندہی

کرتے ہیں۔ کیونکہ اکبر کے ہاں چار بیویاں تھیں۔
آگرہ تھوڑی ہی دور ہے۔ یہ پرانا شہر ہے۔ آگرہ صرف تاج محل ہی کے لیے نہیں ایک اور چیز کے لیے بھی مشہور ہے۔ آگرے کا پاگل خانہ۔ جو تاج محل سے پہلے ہی آجاتا ہے۔ ہندوستان میں اگر کسی کو آگرہ بھجوانے کا مذاق کیا جاتا ہے۔ تو مراد شاہجہاں کی تعمیر کردہ تاج محل سے نہیں ہوتی، بلکہ اسی مینٹل اسپتال سے ہوتی ہے۔
آگرہ سادہ سا شہر ہے۔ سادہ سے لوگ ہیں۔ سیاحوں کی اکثر آمدورفت سے ان کے دماغ خراب ہوئے ہیں۔ نہ ان کی تہذیب پر اثر پڑا ہے۔ ٹریفک زیادہ نہیں ہے ٹریفک کا سپاہی، بڑی گاڑی کا رخ دیکھ کر اپنا رخ بدل لیتا ہے۔ بے چارے رکشے والے پریشان ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سپاہی کا پہلا رخ دیکھ کر چل رہے ہوتے ہیں۔ اچانک رخ بدلنے کا انھیں احساس بعدازوقت ہوتا ہے۔ کلارک شیراز ہوٹل پانچ ستاروں والا ہوٹل ہے۔ شہر کے کلکٹر اور ایس ڈی ایم میرے منتظر ہیں۔ اچھے خاصے صحافی کو وی آئی پی بنادیا گیا ہے۔ کیسا سفر گزرا۔ آپ کتنی دیر رکنا پسند کریں گے۔ تکلفات، رسمی باتیں، ہم چائے وغیرہ پی کر تاج محل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک۔ بچپن سے سنتے آرہے ہیں۔ کتنے لوگ اسے دیکھنے کی خواہش لیے چل بسے۔ میرا کوئی پروگرام بھی نہ تھا، پھر بھی اسے دیکھ رہا ہوں۔ ساحر لدھیانوی کا شعر بار بار یاد آرہا ہے۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

دروازے پر تصویریں لٹریچر بک رہا ہے۔ فوٹو گرافر بھی موجود ہیں، جو آپ کو دو تین دن بعد ڈاک سے تصویریں بھیج دیتے ہیں۔ ذرا رکیے۔ ٹائیلوں کی اس لائن پر چلیے۔ تو تاج محل آپ کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ اب واپس چلیے۔ تاج محل بھی آپ سے دور ہورہا ہے۔ میں تاج محل کے سامنے کھڑا ہوں۔ عظیم عمارت، دھوپ میں زیادہ چمک رہی ہے۔ گائیڈ لیکچرر میرے ساتھ ہے۔ اس نے اپنی داستان شروع کردی ہے۔ چاروں مینار باہر کی طرف جھکے ہوئے ہیں، اگر کبھی گریں تو یہ اصل عمارت پر نہیں گریں گے، باہر کی طرف گریں گے۔ اس عمارت کی سب سے بڑی خوب صورتی SIMMITTRY ہے۔ توازن ایک طرف مسجد ہے دوسری طرف بالکل اسی طرح کی عمارت ہے۔ مگر یہ مسجد نہیں ہے۔ بلکہ مہمان خانہ ہے۔ جوتے اتار دیے۔ یہ تاج محل کی اصل عمارت ہے۔ آج سے سینکڑوں برس پہلے کے کاریگروں کے فن کا نادر نمونہ۔ سب ہتھوڑی اور چھینی کا کمال ہے۔ پتھر نصب کرکے اس میں کشیدہ کاری کی گئی ہے، کیسا باریک کام ہے۔ کیسے خوب صورت اور چھوٹے چھوٹے پھول ہیں۔ یہ نقلی قبر ہے اصلی قبر نیچے ہے۔ مرمت ہورہی ہے اس لیے راستہ تنگ ہے۔ یہ ممتاز محل کی قبر ہے۔ یہ اس پوری عمارت کا مرکز ہے۔ باقی ہر چیز کو اس کے حساب سے توازن میں رکھا گیا ہے۔ اس قبر کی سیدھ سے دیکھیے فوارے۔ روشیں پھر مین گیٹ۔ سب اس کی سیدھی میں ہے۔ ساتھ میں شہنشاہ شاہجہان کی قبر ہے۔ وہ بالکل فالتو لگتی ہے۔ اس کو توازن میں شاہ جہاں نے خود نہیں رکھوایا تھا کیونکہ یہ تاج محل تو اس نے اپنی محبوب بیوی کے لیے ہی بنوایا تھا۔ تاج محل کے پیچھے جمنا ندی بہتی ہے۔ آج کل خشک ہے۔ یہ دریا صدیوں سے بہہ رہا تھا۔ کتنے زمانے اس سے گزرے ہیں۔ دریا کی دوسری طرف ایک قدیم دیوار کے آثار ہیں۔ یہاں شاہ جہاں نے سیاہ سنگ مرمر سے اس طرح کے ایک اور تاج محل کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تھا۔ مگر عمر نے وفا نہ کی۔ سیاہ سنگ مرمر کے اس تاج محل سے اس سفید تاج محل کا حسن اور بھی چمک اٹھتا۔ گائیڈ بتا رہا ہے۔ شاہجہان کے بیٹے اورنگ زیب نے شاہجہان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اسے قید میں ڈال دیا تھا۔ اورنگ زیب بڑا ظالم بادشاہ تھا۔ وہ سامنے دریا کے کنارے آگرے کا قلعہ ہے۔ یہاں شہنشاہ شاہجہان کو قید کیا گیا تھا۔ ہم اس قلعے میں بھی جاتے

ہیں۔ میں ''وی آئی پی'' ہوں اس لیے گاڑی قلعے کے اندر چلی جاتی ہے۔ اس قلعے میں کچھ ہندو طرزِ تعمیر کے نمونے بھی ہیں، دیوانِ خاص، دیوانِ عام۔ شاہجہان نے اپنے آخری ایام جس دیوان میں گزارے۔ ایک طرف اس کی ایک بیٹی رہتی تھی۔ دوسری طرف دوسری۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں شاہجہان کو لیٹے لیٹے ایک آئینے کی مدد سے تاج محل کا عکس دکھائی دے جاتا تھا۔ نقاہت کے مارے وہ اٹھ کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے دکھ بھی بڑے دکھ بن جاتے ہیں اور تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہم غریب لوگوں کے بڑے بڑے دکھ بھی معمولی ہی رہتے ہیں۔

چاندنی رات کو تاج محل کا حسن کچھ اور ہی بڑھ جاتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی اونچی عمارت نہیں ہے، رات میں یہ عمارت سفید بادلوں کی طرح لہراتی ہے۔ ہم کلارک شیراز ہوٹل میں لوٹتے ہیں جہاں دوپہر کا کھانا ہمارا منتظر ہے۔ مغل روم بھرا ہوا ہے۔ امریکی، یورپی سب مغلیہ دور کی یاد میں مغل کھانوں کے لیے بیٹھے ہیں۔ افغانستان کے چیف جسٹس بھی ہندوستان کے دورے پر آئے ہوئے تاج محل دیکھنے آئے ہیں۔ کھانا بہت لیٹ آتا ہے۔ کیونکہ رش بہت ہے۔ ہم چھت سے ایک مرتبہ پھر تاج محل کی آخری جھلک دیکھ کر واپس دہلی کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔

بھارت اور ہماری سوئی گیس

ابھی تک میں وی آئی پی ٹورسٹ بنا ہوا ہوں۔ اگلی صبح سے کچھ باقاعدہ کام شروع ہونے کا خیال ہے۔ اشوکا ہوٹل۔ بھارت کے محکمہ سیاحت کا ہوٹل ہے۔ بے شمار ریستوران ہیں۔ مغربی کھانوں کا الگ، دیسی کھانوں کا الگ، لاؤنج ہی لاؤنج ہیں۔ سپر کلب، مے خانہ، سرکاری مہمانوں کو اکثر یہیں ٹھہرایا جاتا ہے۔ دوسرا ہوٹل جنپت ہے۔ پانچ ستاروں والے ہوٹل۔ یہاں بھارت کی خبررساں ایجنسی یو این آئی (یونائیٹڈ نیوز انٹرنیشنل) نے پاکستان کی خبروں میں خصوصیت حاصل کر رکھی ہے۔ اس لیے میرے لیے یہ خاص طور پر انتہائی مفید ہے۔ رات کو بارہ ایک بجے تک کی خبریں دیکھ کر سوتا ہوں۔ تاکہ رات کروٹیں بدلتے نہ گزرے۔ ہوٹل کے استقبالیہ پر تلک لگائے ہندو دیویاں مسکراتی رہتی ہیں۔ کرنسی تبدیل کروانے والے کاؤنٹر پر جاتا ہوں۔ واؤچر بھرتے وقت میں اپنی نیشنلٹی پاکستانی لکھتا ہوں تو کاؤنٹر انچارج کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔

''اچھا جی آپ پاکستانی ہیں۔ میں بھی پاکستانی ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''میں لائل پور میں پیدا ہوا تھا۔''

''میں راجپورے میں پیدا ہوا تھا۔ جھنگ میں آباد ہوں۔''

''آپ کسی وقت آئیں میرے پاس بیٹھیں میری چائے پئیں۔''

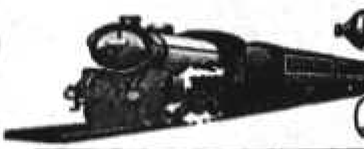
ایک یورپی ہماری گفتگو غور سے سن رہا ہے۔ اور بہت دلچسپی لے رہا ہے۔ اچھا تم ادھر پیدا ہوئے تھے اور اُدھر چلے گئے اور اُدھر پیدا ہوئے تھے، اِدھر چلے آئے۔ تم آپس میں دشمن ہو۔ مگر کتنی بے ساختگی سے ملتے ہو۔''

اس یورپی کو میں اسی حیرت میں چھوڑ کر، اور اس لائل پور والے سے پھر کسی وقت آنے کا وعدہ کر کے چل پڑتا ہوں۔ ایسے مرحلے مجھے بھارت میں بار بار پیش آتے ہیں۔ کوئی ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوا تھا۔ دہلی میں آباد ہے کسی کو لاہور کی یاد ستاتی ہے مگر یہ سب کچھ اسی نسل تک ہے۔ دوسری نسل کے آنے تک یہ یادیں ختم ہو جائیں گی۔ اب جس دھرتی میں بستے ہیں، اس سے وابستگی پکی ہو جائے گی۔

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز رُوداد اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

اسٹیشن سے جڑی ایک ہی موضوع پر دو عبرت ناک کہانیاں

شیشۂ عزت اور پتھر



راحت وفا راجپوت

اُس اکلوتی بہن کا لرزہ خیز قصہ، جسے اُس کے تینوں بھائی معاف نہ کر سکے

لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر وہ حیران پریشان کھڑی تھی۔ اس کے اردگرد انسانوں کا ہجوم تھا مگر ان میں سے کوئی بھی اس کا شناسا نہ تھا سب اجنبی چہرے تھے جو شناسا تھا وہ اسے بے یارو مددگار چھوڑ کر نہ جانے کب کا جا چکا تھا۔ اور وہ خالی ہاتھ خالی دامن کھڑی تھی۔

اسے زور کا دھکا لگا تو وہ لڑکھڑا گئی۔ پلیٹ فارم پر گاڑی آ رہی تھی۔ لوگ اپنا اپنا سامان پکڑے تیار کھڑے تھے۔ ہر کوئی پہلے گاڑی پر سوار ہونا چاہتا تھ۔ ایک شور تھا جو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مگر اس کے اندر سناٹا تھا۔ چپ تھی۔ بھلا کتنی قیمت لگائی ہے اس نے میری۔ یاد کرنا چاہا تو یاد آیا۔ دس ہزار روپے اور ایک تولہ سونا، بس اتنی قیمت۔ اور بدلے میں اجنبی شہر۔ اجنبی لوگ۔

کہاں جاؤں۔ پہلی بار گھر سے نکلی تھی اور کھو گئی تھی۔ ماں باپ کی عزت اور بھائیوں کا مان پیروں تلے روند کر نکلی تھی۔ کسی نے چند خواب آنکھوں کو تھمائے تو 'جاگنا' ہی بھول گئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو نہ خواب کا منظر تھا اور نہ خواب دکھانے والا۔

کیا گھر والوں کو اس کے گھر سے چلے جانے کی خبر ہو گئی ہوگی۔ اس نے سوچا۔ بھائی تو ماں کو ہی بُرا بھلا کہہ رہے ہوں گے۔ اور ماں سر جھکائے بیٹھی ہوگی۔ اس نے تصور کیا۔ ماں کا زرد پڑتا چہرہ، باپ کی جھکی نگاہیں اور بھائیوں کا طوفانی غصہ وہ تھرّا گئی۔ نہیں نہیں۔ ابھی تو وہ سب اٹھے بھی نہیں ہوں گے۔ صرف ابا اٹھا ہوگا نماز کے لیے۔ ذرا سا دل ٹھہرا۔

صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ اندھیرے اور اجالے کا ملن ہو رہا تھا۔ کہاں جاؤں اُس نے سوچا پھر اچانک اس کی سماعتوں نے ایک مانوس سی آواز سنی۔ وہ متوجہ ہوئی۔ پلیٹ فارم نمبر تین سے گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ وہ گاڑی جو اُس کے قصبے سے ہو کر گزرتی تھی۔ ایک لمحہ لگا تھا سوچنے میں۔ اس نے پلٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی واپسی کا سفر کیا ہوگا۔ آگے بھی کھائی تھی اور پیچھے بھی کنواں تھا۔ اندھی کھائی اور اندھا کنواں۔ وہ پلیٹ فارم نمبر تین کی طرف بڑھی۔

وہ گھر جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ گھر جسے چند گھنٹے پہلے وہ چھوڑ آئی تھی۔ ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں میں لیے، وہ ٹرین میں سوار ہو گئی۔

☆☆☆



صبا والدین کی اکلوتی بیٹی اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ تین بھائیوں کے بعد دنیا میں آئی تھی ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ لاڈلی ہوتی۔ اس کے ناز اٹھائے جاتے مگر ایسا کچھ نہ تھا۔ اس کا باپ ایک روایتی مرد تھا۔ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والا۔ تینوں بیٹوں کی ماں ہونے کا اعزاز بھی ماں کو عزت نہ دلا سکا تھا۔ پھر صبا آئی تو ماں نے اسے ہی سہیلی بنالیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بیٹے بڑے ہوتے گئے اور باپ کی دیکھا دیکھی وہ بھی ماں پر رعب ڈالنے لگے تھے۔ ماں کے بعد صبا تھی جو ان کے عتاب کا شکار بنتی۔ اسے مڈل تک بڑی مشکل سے پڑھنے کی اجازت ملی۔ اب وہ تھی اور گھر کے کام' باپ اور بھائیوں کے گھر آنے کے بعد وہ ان کو کھانا دے کر کمرے میں آجاتی۔ ان کی موجودگی میں سہمی ہی رہتی تھی۔ ماں بیٹیاں سہیلیاں ہوتی ہیں سو دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتی تھیں، روک ٹوک اور ڈانٹ نے اس سے ساری خود اعتمادی چھین لی تھی۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ قصبے میں اس کے باپ کا لکڑیوں کا بڑا سا ٹال تھا۔ روپے پیسے کی زیادتی تھی پھر بھی ماں بیٹی ذرا ذرا سی چیز کے لیے باپ بیٹوں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی تھیں۔

☆☆☆

اس حبس بھرے ماحول میں ایک روشنی اور تازہ ہوا کا روزن تھا۔ وہ تھی اس کی دوست نائلہ۔ نائلہ سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ یکے بعد دیگرے بہن بھائیوں کی آمد نے اسے بچپن میں ہی جوان کردیا تھا۔ ماں بیماریوں کی گٹھڑی بن گئی تھی وہ ہی سب بہن بھائیوں کو سنبھالتی تھی۔ اور فرصت ملتی تو صبا کے پاس چلی جاتی۔ صبا کا بھائیوں سے خوف زدہ رہنا نائلہ کو عجیب لگتا تھا۔ وہ اسے کہتی کہ بھائیوں سے ہنسا بولا کرو۔ فرمائشیں کیا کرو۔ تم تو اکلوتی بہن ہو۔ تم امیر لوگ ہو۔ ڈھیر سارے کپڑے اور چیزیں لیا کرو۔"

اور صبا ہنس کر چپ ہوجاتی۔ چونکہ نائلہ کے بھائی بہت چھوٹے تھے اس لیے صبا کو اس کے گھر جانے کی اجازت تھی۔ صبا کو پڑھنے کا شوق تھا۔ مگر

بھائیوں نے اجازت نہ دی تو اس نے اپنے آپ کو گھر کے کاموں میں مصروف کرلیا یا پھر نائلہ کے گھر جا کر اس کے بہن بھائیوں سے اپنا دل بہلا لیتی۔

☆☆☆

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ صبا گھر کے کاموں سے فارغ ہوکر ماں سے اجازت لے کر نائلہ کے گھر جانے کے لیے نکلی۔ نائلہ کا گھر سامنے والی گلی میں تھا۔ وہ اپنی گلی سے نکلی تو نکڑ پر ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس کا حلیہ گاؤں والا نہیں تھا۔ شاید کسی دوسرے شہر سے آیا تھا۔ صبا بے نیازی سے گزر گئی۔ نائلہ کے گھر جا کر وہ یہ بات بھول گئی تھی مگر جب واپس آئی تو وہ لڑکا وہیں کھڑا تھا۔

☆☆☆

پھر اکثر یہ اتفاق ہونے لگا۔ جب بھی وہ نائلہ کے گھر جاتی۔ یا ماں کے ساتھ کبھی بازار وغیرہ جاتی تو وہ نظر آجاتا۔ بار بار اسے دیکھنے سے صبا کو اس کا چہرہ شناسا سا لگنے لگا تھا۔ ایک دن وہ نائلہ کے ساتھ قصبے کے بازار سے کچھ چیزیں لے کر آرہی تھی تو اس نے اس لڑکے کو دیکھا۔

''جانتی ہو یہ لڑکا کون ہے؟'' اچانک نائلہ نے اس سے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا۔''

''یہ خالہ سروری کے گھر مہمان آیا ہوا ہے۔ خالہ کا بھانجا ہے۔''

''اچھا۔'' صبا نے کوئی توجہ نہ دی۔

''اس کا نام فیصل ہے کچھ عرصہ یہیں رہے گا۔'' نائلہ کو اس کے بارے میں ساری معلومات تھیں۔ ''اور یہ کالج میں پڑھتا ہے فیصل آباد کا رہنے والا ہے بہت اخلاق والا ہے۔'' نائلہ کا فیصل نامہ گھر آنے تک جاری رہا۔

☆☆☆

''فیصل تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' اچانک نائلہ نے کہا۔ وہ دونوں صبا کے گھر میں بیٹھی پالک صاف کر رہی تھیں۔

''کیوں۔'' صبا گڑبڑا گئی۔

''کہہ رہا تھا یہ لڑکی بہت معصوم ہے۔ مجھے اچھی لگتی ہے۔'' نائلہ بے دھڑک بولی۔

''یہ کیا فضول بات ہے اور تم اس سے باتیں کرتی کیوں ہو۔ تمہاری ماں منع نہیں کرتی۔'' صبا نے ناراضگی سے کہا۔

''خالہ سروری ہمارے گھر آئی تھیں تو ان کو بلانے آیا تھا۔ ماں نے مہمان سمجھ کر چائے کے لیے بلا لیا۔ تم تو جانتی ہو خالہ سروری میری ماں کی بہن بنی ہوئی ہے۔ بس اس سے بات ہوگئی۔ پھر خالہ کے گھر بھی اکثر بات ہو جاتی ہے۔ ایک دن اس نے خود تمہاری بات کی۔ میں نے کہا اس کے بھائی جلاد ہیں تمہیں زندہ گاڑھ دیں گے۔'' نائلہ نے ہنس کر کہا۔

''اچھا اچھا چپ کرو۔ اماں نے سن لیا تو بہت ڈانٹیں گی۔''

پھر ایسا ہونے لگا کہ صبا سے بات کرتے کرتے وہ فیصل کی کوئی نہ کوئی بات ضرور کر دیتی۔ صبا ہر بار اسے خاموش کرا دیتی۔

☆☆☆

ایک دن وہ نائلہ کے ساتھ بازار آئی تھی۔ اسے اپنا جوتا لینا تھا۔ ماں کو بخار تھا اس لیے صبح ہی بھائی سے پوچھ لیا تھا کہ نائلہ کے ساتھ چلی جائے۔ اجازت ملی تو وہ خوش ہوگئی۔ ماں نے کچھ اور چیزوں کا بھی کہا تھا۔ سب چیزیں لے کر وہ واپس آرہی تھی کہ ایک جگہ فیصل سامنے سے آگیا۔

''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ صبا سے مخاطب تھا۔ وہ ڈر کر نائلہ کے پیچھے ہوگئی۔

''صرف ایک بار میری بات سن لو۔'' نائلہ الگ ہٹ گئی۔ وہ اس کے قریب آگیا۔

''صبا! میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے بے چین ہوگیا ہوں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ اپنے والدین کو تمہارے گھر لانا چاہتا ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں سچے دل سے تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اگر تمہیں یقین نہیں تو میں قرآن کی قسم کھاتا ہوں یہ دیکھو۔'' اس

نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔ صبا نے دیکھا کہ جزدان میں لپٹا قرآن پاک تھا۔ وہ تھرا گئی۔

''اتنی بڑی قسم اتنا بڑا گواہ۔ میں تمہیں کبھی دھوکہ نہیں دوں گا۔ راستے میں نہیں چھوڑوں گا۔ میری طرف دیکھو صبا۔ اتنی بڑی قسم کے بعد بھی تمہیں کوئی شک ہے۔'' صبا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ پُر امید نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہار گئی۔

''شکریہ میری محبت کو قبول کرنے کا۔'' وہ خوشی سے بولا۔ صبا نائلہ کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز چل دی۔

☆☆☆

کامن سائکالوجی ہے کہ مرد سراہنا جانتا ہے اور عورت سراہے جانے کو پسند کرتی ہے۔ اور پھر چاہنا اور چاہے جانا سب کو اچھا لگتا ہے۔ صبا تو ایک کمزور سی لڑکی تھی توجہ اور محبت نے اسے فیصل کی طرف متوجہ کر دیا۔ دوسرے نائلہ کا اصرار تھا کہ وہ اس اعزاز کو نہ ٹھکرائے جو فیصل کی محبت نے اسے بخشا تھا۔ وہ ہار گئی تھی۔

☆☆☆

نامہ بر نائلہ تھی۔ فیصل نے پہلا محبت نامہ لکھا تو جیسے اپنا دل ہی کاغذ پر بکھیر دیا۔ وہ پڑھتی اور لرزتے دھڑکتے دل کو سنبھالنے لگ جاتی۔ دوسرا خط اور تیسرے میں جواب نہ ملنے پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ سو اس نے ڈرتے جھجکتے جواب لکھا اور پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

سیانے کہتے ہیں کہ کوئی عورت اگر کسی مرد کو اپنے پاس بلانا چاہے تو بند قلعے میں بھی بلا سکتی ہے اور اگر متوجہ نہ ہونا چاہے تو بھرے میدان میں بھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔''

صبا کی ڈری سہمی زندگی میں بہار آ گئی تھی۔ گھر کے کام کاج بھائیوں کی ڈانٹ اسے پریشان نہیں کرتی تھی وہ خوش رہنے لگی تھی۔ اس دوران دو بار فیصل اپنے گھر فیصل آباد ہو آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے گھر والے جلد اس کے اور صبا کے منتظر تھی۔

فرض

سقراط نے کہا، ہر شخص پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کرے اور اپنے انفرادی استدلال اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کے درمیان حد فاصل قائم کرے۔ نہ صرف یہ کہ انسان خود ہر چیز کی کسوٹی ہے بلکہ ہر انسان بجائے خود اپنے لیے بھی ایک کسوٹی ہے۔

ایس ایم شاہد کی کتاب ''مغربی سیاسی افکار'' سے طاہر اقبال بورے والا کا اقتباس

ان کی محبت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ صبا کے بھائیوں نے اچانک اس کا رشتہ پکا کر دیا۔ ماں نے سنا تو ششدر رہ گئی۔ احتجاج کیا تو باپ اور بیٹے نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ جلد از جلد اس کو اپنے گھر رخصت کرنا چاہتے ہیں تاکہ بھائی اپنی شادی کا سوچ سکیں۔ ماں چپ ہو کر رہ گئی پھر لڑکے کو دیکھا اور اس کے گھر والوں سے ملی تو مطمئن ہو گئی۔ مگر صبا کی تو دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اسے تو امید تھی کہ فیصل کے گھر والے جلد آئیں گے۔ اس سے پہلے ہی بھائی اس کی خوشیوں کے دشمن بن گئے اس نے نائلہ کو بتایا۔ نائلہ نے فیصل سے بات کی۔ فیصل نے خط میں اس سے بچھڑ کر مر جانے کی قسم کھائی۔ وہ رونے لگی۔

''میں کیا کروں۔'' وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔

''میرا ساتھ دو گی ہر حالت میں۔'' فیصل نے پوچھا تھا۔

''ہاں۔'' وہ پر عزم تھی۔ دو دن بعد لڑکے والے بات پکی کرنے آ رہے تھے فیصل نے اسے ساتھ چلنے کا کہا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اتنا بڑا اقدم۔

''نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔''

''تو ٹھیک ہے جاؤ بھائیوں کے کہنے پر شادی کر لو لیکن یاد رکھنا میری قاتل تم ہو گی۔'' نائلہ نے کہا۔ ''جیسے تمہارے بھائی ہیں سنگ دل ویسا ہی تمہارے لیے شوہر ڈھونڈیں گے۔ ایک قید سے نکل کر دوسری میں چلی جاؤ گی۔ ساری عمر ایسے ہی

گزاروں گی۔'' روتے ہوئے فیصل نے کہا۔ ''میں تم سے محبت کرتا ہوں تمھیں پھولوں کی طرح رکھے گا۔'' وہ ایک بار پھر ہار گئی۔

☆☆☆

رات گیارہ بجے کے بعد اس کے قصبے سے ٹرین گزرتی تھی جو لاہور جاتی تھی۔ سارے معاملات طے ہو گئے۔ نائلہ نے کہا تھا کچھ رقم اور اپنے حصے کا زیور رکھ لینا۔ وہ تمہارا حق ہے۔ سو اس نے زیور اور رقم چھوٹے بیگ میں ڈالی۔ سردیوں کی یخ بستہ رات تھی۔ سرِ شام ہی لوگ کام دھندا نبٹا کر گھروں میں چلے جاتے تھے۔ جلد ہی سارا قصبہ خاموشی میں ڈوب جاتا تھا۔ اس نے سوئی ہوئی ماں کو دیکھا اور بھائی اور باپ دوسرے کمرے میں تھے۔ گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ نکڑ پر فیصل کھڑا تھا۔ فیصل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سنسان گلیوں سے ہوتا ہوا اسٹیشن پر آ گیا۔ گاڑی قصبے سے باہر نکلی تو صبا کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔

☆☆☆

لاہور ریلوے اسٹیشن پر رونقیں عروج پر تھیں لوگوں کی آمد و رفت، گاڑیوں کا شور اور چیزیں بیچنے والوں کی آوازیں مل کر عجیب سا سماں باندھ رہی تھیں۔ فیصل نے اُسے لیڈیز ویٹنگ روم میں بٹھایا۔ اور چائے لا کر دی۔ چائے پی کر اسے بہت سکون محسوس ہوا۔

''کچھ دیر بعد میں اپنے دوست کو فون کروں گا۔ اگر ہم فیصل آباد گئے تو پکڑے جائیں گے۔ ہمیں یہیں لاہور میں ہی رہنا ہوگا۔ میرا بہت اچھا دوست ہے وہ سارا انتظام کرے گا۔''

فیصل باہر چلا گیا۔ وہ ماں کے بارے میں سوچنے لگی بھائی ماں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ ابا تو ماں کو بچا نہ سکے گا۔ مگر میں کیا کرتی؟ اس نے خود کو تسلی دی۔ آخر میری بھی زندگی ہے۔ اپنی مرضی سے گزارنے کا میرا بھی حق ہے۔ فیصل کچھ دیر بعد آیا۔

''میرا دوست دو گھنٹے میں آئے گا۔

''یہ رکھ لو۔'' اس نے بیگ فیصل کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے۔'' ''اس میں کچھ پیسے اور میرا زیور ہے۔ یہ میرا حق تھا میں ساتھ لے آئی ہوں۔'' فیصل ناراض ہونے لگا۔

''تمھیں مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔ میں خود کما کر تمھیں کھلا سکتا ہوں۔'' وہ چپ رہی۔ فیصل بیگ لے کر باہر چلا گیا۔ دھیرے دھیرے وقت گزرنے لگا۔ دور کہیں اذان کی آواز گونجی۔ وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔ فیصل کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ انتظار کرنے لگی۔ وقت مزید آگے بڑھا دو گھنٹے گزر گئے وہ نہ آیا۔ وہ پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر جا کر دیکھنے لگی۔ کہیں فیصل مجھے چھوڑ تو نہیں گیا۔ یہ خیال اتنا خوفناک تھا کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نہیں اے خدا۔ مجھے اتنی بڑی سزا نہ دینا۔ میں کہاں جاؤں گی۔ وہ رونے لگی۔ اور ابنِ آدم ایک بار پھر حوا کی بیٹی کو بیچ راستے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پنچھی اڑ چکا تھا وہ خالی ہاتھ کھڑی تھی۔ اس اکیلی لڑکی کو پریشان اِدھر اُدھر پھرتا دیکھ کر کئی لوگ متوجہ ہو چکے تھے۔ وہ اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ اور پھر اس نے وہ اعلان سنا۔ اس گاڑی کی روانگی کا جو اس کے قصبے سے ہو کر گزرتی تھی وہ واپسی کا سفر طے کرنے والی تھی۔

پورا قصبہ شدید دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ راستے ابھی سنسان تھے۔ وہ لوٹ آئی تھی۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی کھول کر باہر گیا ہو۔ وہ اندر آئی۔ سامنے کمرے میں باپ اور بھائی بیٹھے تھے۔ ماں دوسرے کمرے میں چپ بیٹھی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

''ماں۔'' وہ ماں کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''ماں۔ ہم لڑکیاں کتنی بے وقوف ہوتی ہیں جو چلتی ہوا کو اپنے آنچل میں باندھنے کے لیے اپنوں سے بچھڑ جاتی ہیں۔'' ماں روتی رہی۔ بے آواز۔

☆☆☆

اُسے گھر واپس لوٹے۔ تین دن گزر چکے تھے۔

وہ کمرے میں چپ چاپ لیٹی رہتی ارد گرد کسی کو بھی خبر نہ ہوئی تھی کہ وہ گھر سے بھاگ گئی تھی اور دوبارہ لوٹ آئی ہے۔ ماں اس کے لیے کھانا کمرے میں لے آتی۔ باپ اور بھائیوں نے اُسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ گھر میں مکمل سناٹا تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر گم صم تھا۔ اسے باپ اور بھائیوں کی خاموشی سے خوف آتا تھا۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھی۔ کھانا پینا بہت کم ہو گیا تھا۔ ماں بھی ویران آنکھوں میں خوف لیے اس کے قریب بیٹھی رہتی۔

پانچویں دن نائلہ آئی۔ اسے دیکھ کر صبا کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا ہوا صبا۔ فیصل کہاں ہے اور تم واپس کیوں آ گئی ہو۔'' وہ گھبرا کر پوچھنے لگی۔

''پنچھی اڑ گیا ہے نائلہ۔ وہ پیسے کا بھوکا تھا۔ لے کر چلا گیا مجھے تنہا چھوڑ کر۔''

''کیا۔'' نائلہ ششدر رہ گئی۔ ''وہ ایسا لگتا تو نہیں تھا۔''

''وہ ایسا ہی تھا۔ میں ہی اس کی کھائی ہوئی قرآن کی قسم پر اعتبار کر بیٹھی تھی۔''

صبا، نائلہ سر جھکا کر بولی۔ ''جزدان میں قرآن پاک نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا۔ وہ تمھیں اس طرح متاثر کرنا چاہتا تھا۔ میں بھی چپ رہی کہ مجھے لگتا تھا وہ تمھیں سچے دل سے چاہتا ہے۔ تم بہت معصوم ہو، اس کی قسم پر ایمان لے آئیں۔'' صبا نے بے رخی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''مجھے معاف کر دو۔ میرا قصور ہے میں نے ہی تمھیں مجبور کیا تھا۔''

''نہیں نائلہ قصور میرا ہے۔ میں ماں باپ اور بھائیوں کے اعتماد کو ٹھوکر مار کر گئی تھی۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کیوں نہ سوچا کہ مجھے پیدا کرنے والے اور پالنے والے والدین سے بڑھ کر ایک اجنبی میرا ہمدرد کیسے ہو سکتا ہے۔''

''تمھیں کچھ کہا ہے بھائیوں نے۔'' نائلہ نے پوچھا۔

''مجھے بھائیوں کی خاموشی اور ماں کی ویران آنکھوں سے خوف آتا ہے۔ وہ مجھ سے ناراض ہیں تو مجھے ڈانٹیں۔ مار پیٹ لیں۔ بُرا بھلا کہہ لیں مگر چپ نہ رہیں۔'' وہ رونے لگی۔ نائلہ افسردہ بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

پھر یومِ حساب آن پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ رات سے اسے بہت بخار تھا۔ بڑا بھائی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا۔

''یہ لو پیو۔'' اس نے گلاس صبا کی طرف بڑھایا۔ صبا نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ بھائی نے نظر چرالی۔ وہ مسکرائی۔ تو پھر یوم حساب آخر آن پہنچا ہے۔ اس نے گلاس منہ کو لگا لیا۔ بھائی کمرے سے نکل گیا۔

چند لمحوں کے بعد اس کی چیخوں سے گھر گونج اٹھا۔ ماں بھاگی آئی۔ اس کے معدے اور پیٹ میں جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ بھائی سر جھکائے بیٹھے اس کی چیخیں سن رہے تھے۔ اور آج اس کا باپ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ محلے والے آئے۔ نائلہ بھاگی آئی۔

''صبا!'' اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

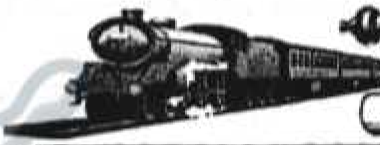
''نائلہ۔ میں نے کہا تھا نا کہ بھائیوں کی خاموشی میں میری موت ہے۔'' نائلہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جان دے دی۔

لوگوں کو کہا گیا کہ پیٹ درد اتنا شدید تھا کہ جان لے کر ہی گیا۔ صرف نائلہ جانتی تھی کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ مرد عورت کی غلطی کبھی معاف نہیں کرتا چاہے باپ ہو بھائی ہو یا شوہر۔ عورت کو معافی نہیں ملتی۔ اس کے بھائی خود میں اتنا ظرف نہ پیدا کر سکے کہ اس کو معاف کر دیتے۔ حوا کی بیٹی کو آدم کا بیٹا ہی ورغلاتا ہے، ترغیب دیتا ہے اور پھر خود ہی اسے سزا دیتا ہے۔ کاش گھر سے قدم نکالنے والی ہر بیٹی یہ سوچ لے کہ عورت کی عزت شیشہ ہوتی ہے اور باہر بہت پتھر ہوتے ہیں۔

☆☆☆

دوسری عبرت ناک اسٹیشن کہانی

انجامِ محبت



نزہت جبیں ضیاء

گھر سے بھاگ کر اسٹیشن پر ایک بے وفا کو سب کچھ سونپ کر زندگی ہار دینے والی دوشیزہ کی کتھا

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اسٹیشن پر بیٹھی شاداب کی منتظر تھی۔ ویسے ہی دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ عجیب عجیب سے خیالات آرہے تھے۔ لگتا تھا جیسے ہر کوئی اسے گھور رہا ہو' اسے دیکھ رہا ہے۔ خود کو اچھی طرح برقعے میں چھپاتی چہرے کو مکمل طور پر نقاب میں چھپاتی بھی وہ ڈر رہی تھی کہیں سے کوئی جاننے والا نہ دیکھ لے۔ اس پر بھانت بھانت کے لوگ روتے بسورتے بچے' گندی گندی میلی خواتین سامنے بیٹھی دو عورتوں کے بچوں میں لڑائی ہوگئی تھی۔ ایک بچے نے دوسرے بچے کو بُری طرح سے مار دیا تھا۔ دونوں خواتین بھی لڑ پڑیں آخر میں بات مردوں تک آگئی۔ لوگوں نے آکر بیچ بچاؤ کروایا۔ اس کے پرس میں لاکھوں کا زیور اور نقد دو لاکھ روپے تھے۔ ویسے بھی حالات اتنے خراب تھے۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا سامنے بیٹھے دو مشکوک سے نوجوان مستقل اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ 'اللہ پاک خیر رکھنا' اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔

''آنٹی چائے پینی ہے۔'' آواز پہ چونکی سامنے ننھا سا بچہ کھڑا تھا۔

''نہیں'' مختصر سا جواب دے کر اُس نے اپنے پرس پر گرفت مضبوط کر لی تب ہی سامنے نگاہ اٹھائی تو جان میں جان آئی۔

''اوہ اللہ کا شکر ہے۔'' شاداب تیز تیز اسی کی جانب آرہا تھا۔

''سوری کومل دیر ہوگئی مجھے۔'' آتے ہی والہانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے اُس نے معذرت بھی کر ڈالی۔

''اُفوہ! شاداب میں تو ڈر گئی تھی اگر تم نہ آتے تو۔'' اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا۔ شاداب تمھیں چھوڑ کہ خود مر نہ جائے۔''

''اللہ نہ کرے اب ایسی باتیں نہ کرنا۔ ساتھ جینا مرنا ہے اب تو۔'' وہ جلدی سے بولی تو شاداب مسکرا دیا۔ بھرپور اور چاہت بھری مسکراہٹ۔ شاداب کے آنے سے وہ کتنی مطمئن ہوگئی تھی۔

''شاداب یہ لو پہلے تم یہ رکھ لو میں تو بہت پریشان ہوں یہ سنبھالتے ہوئے۔'' کومل نے پرس سے چھوٹا سا شاپر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' شاداب نے حیرت سے شاپر کو



دیکھا۔

"گھر میں کمیٹی کے دو لاکھ رکھے تھے اور اس میں میرا زیور بھی ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"یہ تم مجھے کیوں دے رہی ہو یہ تمہارے ہیں کومل۔" شاداب کی بات پر کومل نے محبت سے اسے دیکھا۔

"میرا اور تمہارا الگ تھوڑی ہے۔ شاداب فی الحال ہمیں ضرورت ہوگی ناں، بعد میں اللہ مالک ہے اور میں نہیں سنبھال سکتی یہ سب کچھ۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے یہ مجھ پر تمہارا اُدھار رہے گا میں بہت جلد سب کچھ لوٹا دوں گا کومل۔" شاداب نے اس کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے پراعتماد لہجے میں کہا تو کومل سر ہلا کر مسکرا دی۔

ٹرین آنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے میں تمہارے لیے پانی لے کر آتا ہوں تم کافی دیر سے بیٹھی ہو ناں۔" تھوڑی دیر بعد شاداب نے کہا۔

"ہاں پیاس تو لگ رہی ہے مجھے مگر تم جاؤ نہیں اب۔" کومل نے کہا۔

"نہیں کومل میں پانچ منٹ میں آیا وہ سامنے ہی دکان ہے بس تم پانچ منٹ انتظار کرو۔" وہ اٹھتا ہوا بولا اور پیار سے اس کے ہاتھ تھپتھپا کر چلا گیا۔ وہ مسکرا دی۔ اور سوچنے لگی ابھی دو ڈھائی ماہ پہلے شاداب اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ غیر اہم تھا لیکن ان چند دنوں میں وہ کتنا عزیز ہو گیا تھا کہ اس کے لیے آج کومل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ گئی تھی۔

☆☆☆

رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اوائل جنوری کا مہینہ تھا۔ آج تو شدید سردی تھی اس وقت جب کہ ہر کوئی لحافوں میں دبکا نیند کے مزے لے رہا تھا۔ ایک کومل تھی جو جاگ رہی تھی اور اس ٹھنڈی اور سرد ترین رات میں فریش اور خوشگوار موڈ میں اپنے پلنگ پر بلینکٹ میں دبکی مسلسل موبائل پر مصروف تھی۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہی اس کی آئی ڈی پر کسی نوجوان کی ریکویسٹ آئی تھی۔ بے حد خوبرو اور ڈیشنگ پرسنالٹی والا نوجوان شاداب جس کی خوب صورت مسکراتی ہوئی تصویر دیکھ کر ہی کومل نے اسے فوراً

ہی ایڈ کرلیا تھا۔ اور گزشتہ دو ماہ سے فیس بک سے ہوتے ہوئے دونوں کے موبائل نمبرز ایک دوسرے کے موبائلز میں منتقل ہو چکے تھے اور باتوں باتوں میں وہ دونوں اتنے قریب آ گئے تھے کہ ساری ساری رات یہ چیٹنگ چلتی رہتی۔ موقع دیکھ کر کال پر بات بھی ہو جاتی۔ شاداب کی آواز بھی اس کی پرسنالٹی کی طرح نائیس تھی۔ کسی بھی لڑکی کے لیے بھی شاداب کی پرسنالٹی اور آواز قریب آنے کے لیے کافی تھی۔

شاداب اسلام آباد کا رہائشی تھا۔ باپ دادا کی لاکھوں کی جائیداد کا تنہا وارث اور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ ایک بھائی اور بہن تھے دونوں شادی شدہ اور ملک سے باہر تھے۔ کومل عام سی فیملی کی لیکن خوب صورت لڑکی تھی۔ اسے بھی خوب صورتی اٹریکٹ کرتی تھی۔ اس نے فیس بک پر بے شمار دوست بنا رکھے تھے۔ اس کی فرینڈ لسٹ میں سارے لڑکے ہی تھے۔ مگر جب سے شاداب اس کی فرینڈ لسٹ میں آیا تھا وہ مکمل طور پر شاداب سے امپریس ہو چکی تھی۔ اپنی خوبرو پرسنالٹی کے ساتھ ساتھ جب وہ اپنی گاڑی، بنگلے اور بلڈنگز کی پکس اپ لوڈ کرتا کومل دیکھتی رہ جاتی۔ کومل کی منگنی اس کے کزن سے ہو چکی تھی۔ کزن بھی ان لوگوں کی طرح سے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ نہ بڑا سا بنگلہ تھا اور نہ نئے نئے ماڈل کی گاڑیوں میں گھومنا پھرنا۔ کومل اونچے اونچے خواب دیکھنے والی لڑکی تھی۔ جس کی نظر میں پیسہ اور حسن زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ وہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ شادی سے پہلے وہ ساری انجوائے منٹ کرنا چاہتی تھی۔ اسے فیس بک کی نئی نئی دوستیوں میں مزا آنے لگا تھا۔ لیکن جب سے شاداب آیا تھا اور پہلی دوسری چیٹ پر ہی شاداب نے اس کے حسن کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے تو وہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔ اسے دھیرے دھیرے محسوس ہونے لگا کہ وہ شاداب سے محبت کرنے لگی ہے۔ کچھ دیر اس کا میسج نہ آتا تو وہ پریشان ہو جاتی۔ اسے بیسیوں میسج کر دیتی کال کر لیتی۔ آج شاداب کے دل کی بات اس کے لبوں پر آ گئی جب بات کے دوران اس نے پوچھا۔

''کومل ہم کہیں باہر مل سکتے ہیں کیا؟ میں آج کل کراچی آیا ہوا ہوں۔''

''ہائے اللہ نہیں۔'' بے ساختہ کومل کے لبوں سے نکلا۔

''کومل تمہیں اندازہ نہیں ہے میں تمہارے لیے اتنی دور سے آیا ہوں اور تم مجھ سے ملنے سے انکار کر رہی ہو۔'' وہ روٹھے انداز سے بولا۔

''شاداب میں کیسے مل سکتی ہوں؟'' وہ پس وپیش کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے پھر تم اپنے گھر والوں کو اور اپنی مجبوریوں کو دیکھو مجھے گولی مار دو۔'' شادب کا لہجہ غصیلا تھا۔

''ہائے شاداب نہیں ایسے تو مت بولو۔'' وہ رو دینے کو تھی وہ شاداب کی ناراضگی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی ہے۔

''اچھا چلو میں کوشش کرتی ہوں کہاں پر ملیں گے۔'' کومل نے جھٹ سے حامی بھر لی۔

''اوہ گڈ گرل'' شاداب خوش ہو کر بولا۔

☆☆☆

پہلی بار ملے تھے۔ کومل کا دل عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا کچھ ڈر بھی لگ رہا تھا۔ پھر کسی کے دیکھ لینے کا بھی خوف تھا اس نے برقعے میں خود کو اچھی طرح سے چھپا کر نقاب بھی کر لیا تھا۔ شاداب تصویروں سے زیادہ خوب صورت تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر دونوں ہی خوش ہو رہے تھے۔ شاداب نے بے اختیار کومل کا ہاتھ تھام لیا۔ کومل کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایک گھنٹے کی ملاقات میں دلوں کے حال سنائے گئے اور پھر شاداب نے شادی کی بات کی تو کومل کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے بتا دیا کہ اس کی تو شادی ہونے والی ہے مگر وہ کسی صورت میں شامل نہیں کرنا چاہتی۔ اسے احمد بالکل پسند نہیں ہے اور یہ کہ وہ شاداب کے بنا نہیں رہ سکتی۔

''تم اپنی امی سے بات کرو اور صاف منع

"کر دو۔" شاداب نے سنا تو پریشان ہو کر کہا۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ میں بھی کسی صورت تمہیں کسی اور کا ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔"

"شاداب ابا نہیں مانیں گے۔ احمد ان کے بھائی کا بیٹا ہے اور ابا اپنے بھائی بہن کو ناراض کرنے سے بہتر مجھے قتل کرنا سمجھیں گے۔" وہ رونے لگی تھی۔

"پھر کیا کیا جائے یار۔" شاداب بھی بے حد پریشان تھا۔

"میں نے کئی بار سوچا تمہیں بتادوں مگر پچھلے دو ماہ میں ایسا لگتا ہے کہ ہم جنم جنم سے ساتھ ہوں تمہارے بنا آدھ گھنٹہ گزارنا مشکل ہو جاتا ہے شاداب۔" وہ بدستور رو رہی تھی۔

"ویسے سچی بات بتاؤں۔" کچھ دیر بعد شاداب نے کہا۔

"بولو" کومل نے نگاہ اٹھائی۔

"میری مما بھی میرے رشتے کی بات طے کر چکی ہیں۔ مانیں گی تو وہ بھی نہیں۔"

"ہائے اللہ شاداب پھر کیا ہوگا۔"

"اچھا ابھی تو میں چلوں دیر ہو رہی ہے۔ گھر سے سہیلی کے گھر کا کہہ کر نکلی تھی۔" کومل نے گھڑی دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"چلو رات کو کال پر بات کرتے ہیں قسم سے دل نہیں کر رہا کہ تمہیں جانے دوں۔ دل کر رہا ہے کہ ابھی کے ابھی تمہیں اپنا بنا لوں۔ دلہن بنا کر لے جاؤں ساتھ۔" پہلی ملاقات میں ہی شاداب اتنا جذباتی ہو رہا تھا کومل شرم سے دہری ہو گئی دل تو اس کا بھی نہیں کر رہا تھا شاداب نے بتایا تھا کہ وہ کسی دوست کے گھر ٹھہرا ہے اور ایک ہفتہ رہے گا کراچی میں۔ جب تک کوئی حل نکالیں گے۔

وہ گھر واپس آئی اندر ہی اندر عجیب سی بے چینی اور بے قراری تھی۔ شاداب سے مل کر جذبے اور زیادہ طوفانی ہو گئے تھے۔ محبت کی شدتوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ شاداب سے دوری کا تصور بھی روح فرسا تھا۔

☆☆☆

غزل

ہاتھ میں اک کتاب رکھتی ہوں
اور اُس میں گلاب رکھتی ہوں
مجھ سے کوئی سوال مت کرنا
ورنہ میں بھی جواب رکھتی ہوں
کس کو کتنا ہے خلوص دینا ہے
اس کا پورا حساب رکھتی ہوں
تم ستاروں کی بات کرتے ہو
پاؤں میں ماہ تاب رکھتی ہوں
لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں
میں بھی آنکھوں میں خواب رکھتی ہوں
کیسی کیسی محبتیں ہیں مجھے
کیسے کیسے عذاب رکھتی ہوں
خود میں تمثیلہ ڈوب جاؤں گی
اپنے اندر چناب رکھتی ہوں

شاعرہ: تمثیلہ لطیف۔ جودھالہ، سیالکوٹ

پھر شاداب نے جو راہ دکھائی اسے سن کر کومل کانپ گئی۔

"نہیں شاداب گھر سے کیسے بھاگوں میں، میں ماں باپ کی عزت کو یوں روند نہیں سکتی۔"

"چلو ٹھیک ہے پھر تم ماں باپ کی عزت کا پاس رکھو، محبت کا گلا گھونٹ دو۔ مجھے چھوڑ دو اور اپنے کزن کے ساتھ شادی کر کے مزے سے زندگی گزار رو۔ میرا کیا ہے تم نہ ملیں تو موت تو مل سکتی ہے ناں مجھے با آسانی۔" شاداب کی بات پر وہ تڑپ گئی۔

"اللہ نہ کرے شاداب! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ پلیز کوئی حل نکالو ناں۔"

"میرے پاس تو یہی حل ہے بس۔ اگر تم کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے۔" شاداب کا لہجہ سرد تھا۔

"مگر شاداب اس طرح سے سب چھوڑ چھاڑ کر۔"

"مجھے بھی دیکھو ناں میں بھی تو سب چھوڑ چھاڑ

بادبان

نعمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،
جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا۔

(پانچواں حصہ)

''بجائے آپ میری دلجوئی کریں۔ آپ نمک پاشی کریں گی'' اسفر سوچ رہا تھا۔ کچھ کہنے سے احتراز کیا اور چپ بیٹھا رہا۔

''اب آگے مستقبل کا کیا ارادہ ہے۔ بہن ڈاکٹر بننے جا رہی ہے اور یہ لڑکا۔۔۔۔'' فاخرہ کی تو کیا ہی بات تھی۔ اسفر کو ہمیشہ خود محنت کرتے دیکھا تھا پھر بھی دل آزاری کا سامان کر رہی تھیں۔

''اب مزید کیا کہوں۔ اب کسی یونیورسٹی میں کوئی اچھی سی ڈگری حاصل کرنے کا سوچو جو اچھی سی ملازمت دلوا سکے۔ لیکن تم تو نہلے ہو۔ تمہیں کہاں پتا چلے گا کہ کون سی یونیورسٹی ہو اور کونسی ڈگری کرنی چاہیے۔ میں خود ہی پتا کراؤں گی۔۔۔'' فاخرہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھیں پر ان کی آواز خود تک ہی محدود تھی۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ اٹھ گئیں۔

اسفر چپ بیٹھا رہا۔ سدرہ بھی پاس بیٹھی تھی۔ بھائی کو منہ لٹکائے دیکھ کر اس کے دل میں کم لڈو نہیں پھوٹ رہے تھے۔

''چلو اسفر دل چھوٹا مت کرو۔ اللہ کی جیسے مرضی۔'' چیونگم چباتی سدرہ نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔ نظریں ٹی وی پر جمی تھیں۔

پسندیدہ پروگرام بس آنے ہی والا تھا۔ کچھ دیر اسفر بیٹھا رہا۔ کمرے میں ٹی وی پر بولتے کرداروں اور بیک گراؤنڈ میوزک کی آواز گونجتی رہی اور پھر اسفر اٹھا اور کمرے سے باہر چلا آیا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی اس نے گھر سے باہر جانے کے لیے قدم گیٹ کی طرف بڑھائے تھے۔

''بے چارہ'' ٹی وی پر پسندیدہ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ اور سدرہ محو ہو چکی تھی۔

سڑک پر اسفر بلا مقصد چلتا رہا۔ رکتا رہا اور پھر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ مین سڑک پر آ گیا۔

بہت بڑا چوراہا تھا۔ چاروں طرف گاڑیوں کا ایک سیلاب تھا جو رواں دواں تھا۔ نظریں ٹریفک پر جمائے اسفر کے ذہن میں آیا۔

''اگر میں ایسے کسی گاڑی تلے آ جاؤں تو بھلا کسی کا کیا نقصان ہوگا۔'' ذہن پر ایسی قنوطیت بھری سوچوں کا غلبہ چھانے لگا تھا۔

☆......☆......☆

ایک عجب بات ہوئی۔ دعا نے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔

''بس مجھے نہیں پسند یہ ہڈی اور بال پڑھو۔

انسانوں کو چیرو اور پھر سیو۔" صاعقہ نے اچنبھے سے بیٹی کو دیکھا تھا۔ فرقان اور حنان بھی کم حیران نہ تھے۔

"لیکن تم تو ہمیشہ کہتی تھی کے ای (K-E) میں ایڈمیشن لینا ہے۔" پوچھنے والے فرقان تھے۔

"ہاں بھئی شوق تھا مجھے پر اب دل نہیں چاہ رہا۔"

"یہ کیا بات ہوئی دل نہیں چاہ رہا۔ لوگ ترستے ہیں کے ای میں ایڈمیشن لینے کے لیے۔ طلباء چار چار سال ایف ایس سی میں لگا دیتے ہیں کہ ایڈمیشن ہو جائے اور تم۔۔۔۔" حنان بھائی عملی باتیں زیادہ کیا کرتے تھے۔ اور یوں بھی انہیں لگتا تھا کہ دعا کافی امیچور ہے۔ بڑے فیصلے دعا پر چھوڑنے کی بجائے انہیں خود کر لینے چاہیے۔

"بس میں نے میڈیکل کالج جوائن نہیں کرنا۔" دعا نے منہ پھلا لیا۔

"دیکھ لو دعا پھر یہ نہ ہو ساری زندگی پچھتانا پڑے۔ اس معاشرے میں جتنی عزت لوگ ڈاکٹر کی کرتے ہیں میرا نہیں خیال کسی اور آدمی کی کرتے ہیں۔" فرقان بھائی کا لہجہ حلیم تھا۔

"بس بھیا۔ مجھے فضول لگتا ہے۔ میں کوئی اور فیلڈ جوائن کروں گی۔" دعا کا لہجہ نروٹھا تھا۔

"لیکن۔۔۔۔" حنان ابھی مزید سمجھاتے کہ صاعقہ نے ٹوک دیا۔

"بس حنان۔ ابھی تو دن ہیں میرٹ لسٹ میں نام آیا ہے اور ابھی کلاسز شروع ہونے میں کافی وقت ہے۔ اگر دعا کا موڈ بنا تو ضرور جوائن کر لے گی ابھی میری بچی کو تنگ نہ کرو۔" عام ماؤں کی برعکس بیٹوں کی نسبت بیٹی کے وہ زیادہ لاڈ اٹھاتی تھیں۔ اور پھر یکے بعد دیگرے حنان اور فرقان کمرے سے چلے گئے۔

"پریشان مت ہو فیصلے کی گھڑی میں ہمیشہ



انسان کشمکش و پیچ میں مبتلا رہتا ہے۔ میری بیٹی وہی کرے گی جس کے لیے اس کا دل آمادہ ہوگا۔''

صاعقہ پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے چلے گئیں۔

اور دعا اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی رہ گئی گھٹنے پر سر ٹکاتے وہ یونہی سامنے والی دیوار کو تکتی رہی۔ گلابی پینٹ شدہ دیوار۔ دعا نے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے اسے اپنے کمرے کی سیٹنگ تھوڑی زیادہ بچکانہ لگ رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ تھوڑی بہت تبدیلی لے آئے۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے اسفر تم پیچھے رہ جاؤ اور میں آگے بڑھ جاؤں۔ ہم دونوں ساتھ چلیں گے اور قدم ملا کر چلیں گے۔'' دعا کا لہجہ پرعزم تھا۔

لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے عزم کے باوجود بھی اسفر نے اس سے پیچھے ہی رہنا ہے۔ بھلا تقدیر کی باتیں انسان وقت سے پہلے کیونکر جان سکتا ہے۔

☆......☆......☆

''انجینیرنگ میں داخلہ لیتے ہوئے تو میں بہت پرجوش تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے احساس ہونے لگا کہ اگر میں میڈیکل لائن جوائن کرتا تو کیا ہی بات تھی۔ بلاشبہ انجینیرنگ بری فیلڈ نہیں خاص طور پر سول انجینیر کی تو ڈیمانڈ بھی کم نہیں ہوتی لیکن میڈیکل کی اپنی بات ہے۔'' بدر اپنے تجربات چھوٹے بھائی سے بانٹ رہا تھا۔ جواد بڑے بھائی کی بات توجہ سے سنتا رہا۔

''اسی لیے تو بھائی میں نے میڈیکل چنا ہے۔'' جواد کی آنکھیں روشن تھیں۔ تازہ تازہ کامیابی کا خمار اس کے ہر عضو سے چھلکتا تھا۔

''ہم م م۔۔۔'' بدر نے سگریٹ سلگایا اور کش لگانے لگے۔

''اور میرا گفٹ۔۔۔'' جواد کہہ رہا تھا۔

''ہاں گفٹ تو بنتا ہے۔ آخر میرا بھائی پروفیشنل ایجوکیشن کے لیے جا رہا ہے اور وہ بھی پسند کی جگہ سے تو گفٹ تو اس کا حق ہے۔۔۔ بتاؤ کیا چاہیے۔'' بدر نے مسکراتے ہوئے کش لگایا تھا اور دھواں ہوا کے سپرد کیا تھا۔ کمرے کی فضا سگریٹ کے دھویں سے بھر رہی تھی۔

جواد کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر گویا ہوا

''Versace کی جینز اور Voltage کا کوٹ۔''

''ارے ارے گفٹ کا کہا ہے گفٹس کا نہیں۔'' بدر ہنسنے لگا۔

''لو بھائی ابھی خود کہہ رہے تھے۔ بڑی کامیابی، پروفیشنل ایجوکیشن وغیرہ وغیرہ اور اب خود ہی۔۔۔'' جواد نے ہنسنے میں بھائی کا ساتھ دیا تھا۔

''چلو آؤ تم بھی کیا یاد کرو گے۔'' بدر نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور کی چین سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ جواد نے بھی بھائی کی تائید کی تھی۔

''Bro Yoy Are Great'' باہر نکلتے ہوئے جواد بدر سے کہہ رہا تھا۔

''مکھن تو س کو لگانا بھائی کو نہیں۔'' سرخ گاڑی ریورس کرتے ہوئے بدر نے کہا تھا اور جواد ایک بار پھر ہنس دیا۔

☆......☆......☆

اسفر ہال کمرے میں بیٹھا اس وقت، وقت گزارنے کے لیے ناول پڑھ رہا تھا جب دستک دے کر دعا کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''آؤ دعا، کیسی ہو؟'' اسفر نیم دراز سے اٹھ بیٹھا۔ ناول بھی بند کردیا۔

''سدرہ تو ابھی کالج سے نہیں آئی۔'' اسفر نے مطلع کیا سدرہ کو میڈیکل کالج جوائن کیے دو مہینے ہونے والے تھے اور اسفر تا حال فارغ تھا یہ فیصلہ ہی نہ ہو پایا تھا کہ اسفر آگے کیا پڑھے گا۔

''جانتی ہوں اسفر۔ میں تم سے ملنے آئی ہوں۔'' دعا کا دل قدرے تیز دھڑکتا تھا۔ دعا کی بات سن کر اسفر کو حیرانی ہوئی۔

''مجھ سے۔۔۔۔ خیریت؟'' اسفر کو جیسے یقین نہ آتا تھا۔

''جی جی خیریت۔۔۔۔ یہ تم کیا پڑھ رہے تھے؟'' دعا نے تھوڑا سا آگے سرک کر کتاب کا عنوان دیکھا اور پھر کتاب اٹھالی۔

''ہم م م ناول، میری بھی یہ پسندیدہ مصنفہ

ہیں۔'' دعا بلاوجہ کتاب کے صفحات پلٹنے لگی۔ صفحات پلٹتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

''پتا ہے جب میں نے پہلی دفعہ ان کو پڑھا تھا تو میرے دل میں بھی رائٹر بننے کی خواہش جاگی تھی اور میں نے ناول لکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔'' ہنستے ہوئے دعا بتا رہی تھی۔

''ناول کیا دو تین صفحات لکھے تھے۔ وہ بھی چربہ ویسے تم کب سے ناول پڑھنے لگے ہو؟'' دعا نے کتاب ساتھ چارپائی پر رکھ دی۔

''بس آج کل تھوڑا فارغ ہوں تو پڑھ لیتا ہوں۔ اچھا تم بیٹھو ذرا میں تمہارے لیے کچھ لے آتا ہوں۔'' اسفر اٹھنے لگا۔

''نہیں اسفر بیٹھو کچھ مت لاؤ۔ کچن میں آنٹی سے ملی ہوں تو انہوں نے پوچھا تھا۔ وہ فالسے کا جوس بنا رہی ہیں اور تم تکلف میں مت پڑو۔ میں کھانا کھا کر جاؤں گی۔'' دعا نے کہا تو اسفر ایک بار پھر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا دعا سے کیا بات کرے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے دل میں دعا کے لیے ویسی ناپسندیدگی نہیں رہی تھی جیسے پہلے ہوتی تھی۔

''اچھا اسفر آگے کا کیا ارادہ ہے تمہارا؟'' دعا اب مدعے پر آرہی تھی۔

''آگے۔۔۔۔'' اسفر کندھے اچکا کر رہ گیا۔

''پرسنٹیج اچھی نہیں کسی اچھی یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل رہا اور جہاں داخلہ مل رہا ہے وہاں امی راضی نہیں۔''

دعا کچھ دیر یونہی بلاوجہ سر ہلاتی رہی۔

''اسفر اگر میں ایک مشورہ دوں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا۔'' دعا نے کوشش کی کہ انداز غیر معمولی نہ ہو۔ پر کم بخت دل تھا کہ جیسے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔

''نہیں نہیں کہو۔''

''وہ اسفر اگر ہم دونوں کزنز مل کر سی ایس ایس کی تیاری شروع کر دیں۔ دوست بن کر اگر تیاری کریں جیسے فرسٹ ائیر کے ابتدا میں جواد اور سدرہ کے ساتھ مل کر کی تھی تو یقیناً اچھی تیاری ہو جائے گی اور کامیابی ملے گی۔ تم کیا کہتے ہو؟'' دعا کی آنکھوں میں امید کے جوت جلتے تھے۔

''دوست بن کر۔۔۔'' جواد کے بعد اسفر کو لفظ دوست سے چڑ ہو گئی تھی۔ وہ یونہی خاموش بیٹھا رہا۔

''سی ایس ایس کا امتحان کچھ اتنا مشکل نہیں اور میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ مل کر کریں گے تو باسانی ہو جائے گا۔'' دعا کو لگنے لگا جیسے اسفر انکار کر دے گا۔

''تم کیوں چاہتی ہو۔ میں تمہارے ساتھ آؤں تم اکیلے بھی تو کر سکتی ہو؟'' وہ سوال زبان پر آہی گیا جو ذہن میں اٹکا تھا۔

''میں۔۔۔۔ اسفر تم میرے کزن ہو اور اس حوالے سے عزیز ہو تم ساتھ ہو گے تو کمپنی ہو گی۔ یوں اکیلے آئی مین۔۔۔۔ بچپن سے لے کر اب تک تم میں اور سدرہ کلاس فیلو رہے ہیں۔ سدرہ تو میڈیکل میں چلی گئی اور اب میں چاہتی تم ساتھ ہو۔۔۔۔''

دعا کا حلق خشک ہو رہا تھا اور اسفر چپ بیٹھا رہا دعا اسفر کا چہرہ تکتی رہی۔ اسے بے ساختہ روئی کے گالوں جیسی موتیوں کی بارش والا خواب یاد آ گیا سیاہ لباس، سیاہ ماحول اور سیاہ چھتری۔ موتیوں کے علاوہ اس منظر میں سب کچھ سیاہ تھا۔ اور بڑا افسوں خیز تھا۔

''میں سوچ کر بتاؤں گا امی ابو سے مشورہ کروں گا۔'' اسفر بولا تو جیسے دعا کو اطمینان ہوا۔

''آنٹی کی طرف سے تم ہاں سمجھو، انہیں تو میں قائل کر لوں گی۔'' دعا کے اعصاب پرسکون ہو چکے تھے اور کہتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

☆......☆......☆

وہ بھائی جنہوں نے بچپن ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ایک ہی آنگن میں کھیلتے اور لڑتے جھگڑتے گزارا تھا جوانی میں روزگار کے سلسلے میں الگ الگ شہروں میں ایسے جا بسے کہ سالوں نہ مل پاتے۔

اب کتنے سالوں بعد صفدر لاہور آئے تھے۔ خاص الخاص زوار کے پاس۔ ساری زندگی جہلم میں افسری کے عہدے پر فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں الجھائے رکھا تھا۔ آج وہ زوار سے خاص الخاص مقصد کے ساتھ ہی ملنے آئے تھے۔

''کیسے ہو زوار؟'' صفدر نے دو تین بار پوچھا تھا۔ سالوں کی دوری ایک مسافت لے آئی تھی۔ کرنے کو جیسے باتیں ہی نہ تھیں۔

''آپ کو یوں اپنے پاس دیکھ کر مجھ بے پایاں خوشی ہو رہی ہے۔ میں بتا نہیں سکتا۔'' خوشی زوار کے لہجے سے جھلکتی تھی۔

صفدر بھائی چہرے پر مسکراہٹ لیے سر ہلاتے رہے۔

''بس زوار کتنا عرصہ ہوا تم سے ملاقات نہ ہوئی۔ تم نے تو کبھی یاد ہی نہ کیا۔ ملنے تو دور کی بات فون بھی نہ کیا۔ میں نے سوچا اب مل ہی آؤں۔'' صفدر نے زوار سے شکایت کی تھی۔

''صفدر بھائی اب شرمندہ تو نہ کریں۔''

''اچھا زوار میں خاص درخواست لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ امید ہے تم مجھے ناکام نہ بھیجو گے۔''

صفدر نے تمہید باندھی تھی۔

''آپ حکم کریں صفدر بھائی۔'' زوار نے اندازِ نشست تبدیل کی تھی۔ ان کا بھائی سالوں بعد آیا تھا اور ایک عرضی لے کر آیا تھا۔ انہوں نے ہر حال میں بھائی کی خواہش پوری کرنی تھی۔

''ویسے تو تمہاری بھابی بھی آنا چاہتی تھی لیکن میں نے کہا پہلے میں خود بات کرلوں پھر اسے بھی لے آؤں گا۔ جیسے زوار خدا نے صرف تمہیں بیٹی سے نوازا ہے۔ سدرہ صرف تمہاری ہی نہیں خاندان کی اکلوتی بیٹی ہے۔۔۔۔''

''اکلوتی۔۔۔'' زوار کو چبھن سی ہوئی۔ سونی کو تو جیسے سب بھول گئے تھے یا پھر از خود اس کا ذکر مانع ٹھہرا تھا۔

''تو اگر تم مناسب سمجھو تو سدرہ کو میرے احمد کے عقد میں دے دو۔ احمد سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ سی اے کے آخری Module میں ہے۔ خاندان کی بیٹی، خاندان میں رہے گی تمہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔'' صفدر ٹھہر ٹھہر کر الفاظ ادا کر رہے تھے۔

''بتاؤ زوار تم کیا کہتے ہو۔'' صفدر بھائی کی رائے جاننا چاہ رہے تھے۔ زوار کچھ دیر یونہی خاموش بیٹھے رہے۔

''دیکھو زوار اگر تم کہیں ناں کا ارادہ رکھتے بھی ہو تو پہلے احمد سے ایک بار مل لینا۔ میں کہتا ہوں تم نہ نہیں کہہ پاؤ گے۔ یا پھر تم نے سدرہ کا رشتہ پہلے سے کہیں طے تو نہیں کرلیا۔''

صفدر نے پوچھا تو زوار نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں صفدر بھائی رشتہ طے تو نہیں کیا مگر اس کے ایک کلاس فیلو کا رشتہ اس کے لیے آیا ہوا ہے۔ مجھے مکمل معلوم تو نہیں مگر میرا اندازہ ہے کہ سدرہ کی رضا بھی شامل ہے۔ بہر حال آپ کو جواب دینے سے پہلے میں ایک بار سدرہ اور فاخرہ سے پوچھوں گا۔ سدرہ کی رائے ہی سب سے مقدم ہوگی۔''

صفدر کی امید کم ہوتی گئی۔

''ٹھیک ہے زوار۔ جو نصیب ہوگا وہی ہوگا۔'' صفدر کی آواز مدہم تھی۔

☆......☆......☆

شام کو راشدہ کا فون آگیا۔

''کیسے ہو زوار؟'' راشدہ کا لہجہ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش تھا۔

''میں اچھا ہوں، آپ کیسی ہیں آپا۔'' زوار نے کہا تھا۔ بھائیوں کی نسبت رضاعی بہن سے ان کا تھوڑا زیادہ رابطہ رہا تھا اور اس میں بھی راشدہ کا ہاتھ تھا۔ فون کرلیتیں۔ سال دو سال بعد خود آجاتیں یا پھر زوار سے اصرار کرتیں کہ چکر لگا لے۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' خیر و عافیت پوچھنے کے بعد وہ مدعے پر آئیں۔

''دراصل مجھے صفدر بھائی نے کہا تھا کہ تم سے بات کروں۔ وہ اپنے احمد کا رشتہ تمہاری سدرہ کے لیے لائے ہیں۔ ویسے تو زوار میں نے بارہا بار اپنے ذیشان کے لیے سدرہ کو سوچا پر اس لیے نہ کہہ سکی کہ سدرہ شہر کی پڑھی لکھی ماڈرن لڑکی اور میرا ذیشان گاؤں کا میٹرک پاس سیدھا سا لڑکا۔ لیکن بہر حال احمد کے ساتھ سدرہ کا رشتہ ہوگا تو یہ ایک اچھی خبر ہی

ہوگی۔'' راشدہ خاموش ہوئیں تو زوار گویا ہوئے۔

''آپا فیصلہ میں سدرہ کی منشاء کے بغیر نہ کروں گا۔ دراصل اس کے لیے ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔'' زوار انہیں جواد سے متعلق بتانے لگے۔

''ہاں ٹھیک کہتے ہو یہ اب پرانا زمانہ نہیں کہ بچوں کی رضا کے بغیر ایسے فیصلے کیے جائیں۔ سدرہ سے پوچھنا ضروری ہے۔ بلکہ فیصلے کا اختیار ہی سدرہ کے پاس ہے۔ اور تم سناؤ گاؤں کا ایک چکر ہی لگالو۔ مدت ہوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔'' زوار مسکرانے لگے۔

''لگاؤں گا چکر آپا بلکہ آپ لاہور کیوں نہیں آ جاتیں۔ بچوں کو بھی ساتھ لے آئیں۔ مل بیٹھیں گے تو تھوڑا گھوم پھر بھی لیں گے۔''

''بچے اب اتنے چھوٹے نہیں کہ ہر جگہ ساتھ لے جاؤں۔ خیر سے اب تو بچوں کے بچے بھی ہو گئے ہیں۔'' دادی بنے راشدہ کو سال سے اوپر ہو چکا تھا۔

''بہر حال آؤں گی تمہاری طرف۔ اپنا خیال رکھنا میرے بھائی اور فاخرہ کو بھی سلام دینا۔''

فون بند کرنے کے بعد راشدہ فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہیں چند ثانیے ایسے ہی گزرے تو خولہ نے کمرے میں جھانکا۔

''امی آپ نے دوائی کھالی؟'' راشدہ کی دوائی کا وقت تھا۔ گزرتے سالوں نے خولہ کے بچپنے کو ختم کر دیا تھا اور وہ ذمہ دار ہوگئی تھی اور جب سے ماں فشارِ خون کے مرض سے بے ہوش ہوئی تھی تب سے تو وہ اس کی دوائی کا خاص خیال رکھتی تھی۔

''ہاں کھالی۔ پر تم مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔ گرمیوں میں تو پیاس ہی بہت لگتی ہے۔''

خولہ پانی لینے چلی گئی تو راشدہ دوبارہ سے پچھلی سوچ میں الجھ گئیں۔

''ذیشان کے لیے تو انہوں نے سدرہ کا نام لے لیا تھا۔ پر وہ یہ بھی تو چاہتی تھیں کہ خولہ زوار کی بہو بنے۔ سیدھا سادا اسفران کی خولہ کے ساتھ کیسے جچتا۔ پر یہ بات وہ خود سے تو نہیں کہہ سکتی تھیں۔ بس یہ دعا کر سکتی تھیں کہ خدا یہ بات زوار کے دل میں ڈال دے۔

''بس سب نصیب کے کھیل ہیں۔'' راشدہ نے ایک لمبی سانس بھری تھی اور اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

☆......☆......☆

''چنبیلی او چنبلی۔۔۔۔۔'' چندا نے باورچی خانے سے آواز لگائی چنبیلی کان لپیٹے دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹ پیتی رہی۔

''چنبیلی۔۔۔۔'' چندا الجھ کر خود ہی کمرے میں آ گئی۔

''بہری ہوگئی ہے کیا؟ کتنی آوازیں دی ہیں۔ تھوڑا سا آ کر میرا ہاتھ ہی بٹا لے۔'' چندا کو آج پھر اپنے ہاتھ کا پکا کھانے کا شوق چڑھا تھا۔ اور آج اس نے نہاری کے لیے پتیلا چڑھایا تھا۔

''پتا تو ہے نہاری میں کتنی محنت لگتی ہے۔ پر کسی کو میری پروا نہیں۔'' چندہ کے شکوے شکایات تو جیسے معمول کا حصہ تھے۔ چنبیلی نے کان نہ دھرے۔

''تو کس نے کہا تھا جان مشکل میں ڈالنے کو۔ سو روپے کی نہاری کی پلیٹ منگواتی اور چٹخارے لے کر کھاتی۔ اب تو تُو سو سال بھی محنت کر کے نہاری بنا، چٹخارے پھر بھی وہ نہ ڈال پائے گی۔'' چنبیلی نے آخری کش لیا اور خاکستر ہونے والے سگریٹ کا ٹکڑا زمین پر پھینک دیا۔

''ہونہہ بس بھگو بھگو کر باتیں کرنا قسم خدا کی جو تجھے اب نہاری چکھاؤں جب سے وہ ٹی وی والا شو کیا ہے تیرے رنگ ہی اور ہو گئے ہیں۔ مشہور جو ہونے لگی ہے۔''

چندا جلی کٹی سناتی چلی گئی۔ چنبیلی نے پھر بھی کان نہ دھرے۔ برآمدے میں بیٹھا سیفی یہ باتیں سن رہا تھا۔ چندا کے جانے کے بعد اندر چلا آیا۔

''سیفی تُو ہی آ جا میرے ساتھ۔'' چندا نے پھر سے ہانک لگائی تھی۔

''نہ بابا مجھ سے یہ باورچی خانے کے کام نہیں ہوتے کوئی باہر کا کام ہے تو بتاؤ۔''

سیفی نے بھی اونچی اواز میں جواب دیا تھا۔ چندہ باورچی خانے میں بیٹھتے ہوئے بڑبڑاتے

ہوئے دوبارہ سے کام میں جت گئی۔

سیفی سج سج کر چلتا آیا اور چنبیلی کی سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ گھر میں عموماً وہ مردانہ کپڑے پہن کر گھومتا تھا لیکن آج زنانہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ زنانہ کپڑوں میں اس کی نسوانی ادائیں بڑھ جاتی تھیں۔ چارپائی پر بیٹھ کر اس نے اپنے گھونسلا بالوں کی ایک لٹ کو انگلی پر لپیٹنے لگا۔

''چنبیلی تو سچ مچ ٹی وی پر آرہی ہے۔'' سیفی ابھی تک بے یقین تھا اور یقیناً تب تک بے یقین ہی رہتا جب تک چنبیلی کا شو آن ایئر ہو نہ جاتا۔

چنبیلی نے جواب نہ دیا۔ چپ چاپ پیکٹ سے ایک اور سگریٹ نکال کر پینے لگی۔ آج اس کا کسی سے بولنے کا دل نہیں کر رہا تھا۔

''پھر تو چنبیلی تو تو بڑی مشہور ہو جائے گی کیا پتا ڈرامے والے بھی تجھے اپنے ڈرامے میں ہیروئن رکھ لیں۔'' سیفی کے لہجے میں رشک عود آیا۔

''فکر نہ کر شو میں نقاب کیا ہوا ہے میری شکل نظر نہیں آئے گی۔'' چنبیلی چند لمحے سگریٹ کا دھواں روکے بیٹھی رہی اور پھر دھواں فضا کے سپرد کیا۔

''ہائیں۔ وہ کیوں؟؟'' سیفی کو دو چند حیرت ہوئی۔

''چینل والوں کو لگتا ہے میرا چہرہ دکھانے سے ان کا چینل بدنام ہو جائے گا۔''

چنبیلی ایک کڑوی ہنسی ہنس دی۔

''یہ کیا بات ہوئی چنبیلی تو انکار کر دے کیسے گھٹیا لوگ ہیں۔'' سیفی کو اپنے ٹی وی پر آنے کے لیے تنگ و دو والے دن یاد آگئے تھے اور اندر تک زہر بھر گیا تھا۔

''ردا باجی بہت اچھی ہے۔ اس نے اتنی عزت دی کہ کل ملا کر ساری زندگی بھی اتنی عزت نہ ملی ہوگی۔ ان کو انکار نہ کر پائی شو تو میں تین چار دن پہلے ریکارڈ کرا آئی تھی اب دیکھو کب ٹی وی پر آتا ہے۔''

''یوں بھی میں چاہتی تھی دنیا کو پتا چلے کہ کہاں سے اور کیسے لڑکیاں اس دھندے میں آرہی ہیں۔'' سیفی سر ہلانے لگا اور بولا

''او کیا پتا تیرے گھر والے بھی شو دیکھ لیں اور تجھے ڈھونڈتے ادھر آجائیں۔''

سیفی نے ادا سے کہا تو چنبیلی کی ہنسی نکل گئی۔ بے ساختہ وہ ہنستی چلی گئی اتنا ہنسی کہ آنکھوں سے پانی نکل آیا۔

''کون سے گھر والے سیفی تو پاگل ہو گیا ہے کیا خیال ہے تجھے پاگل خانے داخل کروا دیں۔'' چنبیلی اب بھی ہنس رہی تھی۔

''اس میں اتنا ہنسنے والی کون سی بات ہے۔'' سیفی خائف نظروں سے چنبیلی کو دیکھے جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

''ویڈیو ختم ہوئی تو ردا نے ایک طویل سانس بھری۔ لیپ ٹاپ کا Lid گرانے کے بعد وہ اپنی کرسی سے ٹیک لگائے پینسل ہاتھ میں پکڑے چند لمحے یونہی سوچتی رہی۔

یہ ایک خاص شو تھا۔ ردا نے اس پر ایکسٹرا ورک کیا تھا۔ اور ردا کی فرمائش پر اس خاص شو کو تھوڑا کمرشلائز بھی کیا گیا تھا۔ چینل کے اخبار میں بھی ایک ہفتہ پہلے سے خاص شو کے لیے اشتہار دیا جانے لگا تھا اور چینل پر بھی تواتر سے شو کی جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں۔

الیکشن ہوئے زمانہ گزر گیا تھا۔ ملکی غیر ملکی سطح پر کوئی ایسی غیر معمولی سرگرمیاں بھی نہیں ہو رہی تھیں جن کو ہائی لائٹ کیا جاتا۔ چنانچہ نیوز چینلز والے آج کل معاشرتی مسائل پر شوز کر رہے تھے۔

ردا جانے کتنی دیر یونہی سوچتی رہتی کہ چینل کے چیف ایگزیکٹو دستک دے کر اندر آئے۔ نورالزماں شامی صاحب کو اپنے آفس میں آتا دیکھ کر ردا کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھو بیٹھو'' نورالزماں نے ردا کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور خود بھی میز کے بالمقابل پڑی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے تھے نورالزماں حلیم طبع انسان تھے۔ اپنے چینل سے مخلص تھے۔ ملک کے حالات میں سدھار چاہتے تھے۔ اپنے Employees کو عزت بھی خوب دیتے تھے۔ تبھی تو دوسروں کو اپنے آفس میں بلانے

کی بجائے بعض اوقات خود بھی ان کے آفس چلے جاتے۔

''سر مجھے بلا لیتے۔'' سیٹ سنبھالتے ہوئے ردا گویا ہوئی۔

''کوئی بات نہیں بچے۔ میں تم سے تمہارا وہ خاص شو ڈسکس کرنے آیا ہوں جس میں تم نے Prostitute کی کور سٹوری کی ہے۔''

''جی سر، میں خود بھی ابھی اسی شو کی ریکارڈنگ دیکھ رہی تھی۔'' ردا کے انداز میں نورالزماں کے لیے عزت وتوقیر تھی وہ اس شخص کی دل سے عزت کرتی تھی۔

''دیکھو ردا تمہارے کہنے پر میں نے اجازت تو دے دی مگر مجھے اندازہ نہیں کہ کیا رسپانس آئے گا پاکستان میں ایسے سوشل ایشوز کو عام طور پر قالین کے نیچے رکھا جاتا ہے یوں سر عام بحث نہیں کی جاتی۔ یہ ایک بہت بڑا رسک ہے جو بہرحال ہم لے رہے ہیں ممکن ہے کہ لوگ اس قدر تنقید کا نشانہ بنائیں۔ فحاشی کا الزام لگائیں کہ ہم نے اپنے چینل پر Prostitute لا کر بٹھا دی۔ اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کو نقاب میں آنا چاہیے۔'' ردا نے نورالزماں کی بات تسلی سے سنی۔

''سر میرے لیے یہ آنر کی بات ہے کہ اختلاف کے باوجود آپ نے اس ایشو کو ٹی وی پر لانے کی اجازت دی۔ ہماری نیت اچھی ہے۔ ہم اچھی تبدیلی چاہتے ہیں اسی لیے تو اس ٹاپک کو ڈسکس کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ پبلک پسند کرے گی۔'' ردا کے انداز میں سکون بھرا تھا۔ نور الزماں نے ایک مسکراہٹ ہونٹوں پر لے آئے تھے۔

''تمہاری محنت اور خود اعتمادی نے تو مجھے تمہارا گرویدہ کیا ہے جس کے باعث آج میں ذاتی طور پر متفق نہ ہونے کے باوجود اس اپی سوڈ کو اپنے چینل پر آن ائیر ہونے کی اجازت دے رہا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہوا کس رخ چلتی ہے۔'' نورالزماں کھڑے ہوئے تو ردا بھی کھڑی ہوگئی۔

''اچھا ہی ہوگا سر مجھے یقین ہے۔''

☆......☆......☆

''احمد کا رشتہ تو اچھا ہے زوار پر یوں بیٹی کو جہلم بھیجنا میں تو قائل نہیں۔ دوسرا جواد سدرہ کا کلاس فیلو ہے۔ وہ بھی ڈاکٹر، سدرہ بھی ڈاکٹر۔ میں تو جواد کو ہی ترجیح دوں گی۔''

اتوار کا دن تھا ناشتے کے بعد دونوں میاں بیوی ساتھ بیٹھے تھے اسفر بھی ساتھ بیٹھا تھا جبکہ سدرہ دانستہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

بیوی کی بات سن کر زوار کچھ سوچتے ہوئے سر ہلاتے رہے۔ اسفر یوں لاتعلق بیٹھا رہا جیسے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ اور حقیقتاً بھی اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

''تم نے سدرہ سے پوچھا تھا؟''

''ہاں زوار پوچھا تھا۔ وہ بھی جواد کے لیے رضا مند ہے۔ تمہیں اگر صفدر بھائی کو انکار کرنے میں مسئلہ ہو رہا ہے تو میں بات کرلوں گی۔'' فاخرہ زوار کی وضع داری سے واقف بھی تھیں اور خائف بھی۔

دل کو مسلتے ہوئے اسفر نے پاس پڑا ناول اٹھا لیا۔ جواد سے اسے نفرت تھی اور وہ اس کا بہنوئی بننے جا رہا تھا۔

''اور اسفر تم نے اب جب سی ایس ایس کا امتحان دینے کا فیصلہ کرلیا ہے تو پھر بی اے میں ہی اس کی تیاری شروع کردو۔ مقابلے کا امتحان کافی محنت مانگتا ہے تم نے اس بار مجھے کامیاب ہو کر دکھانا ہے۔'' سی ایس ایس کے امتحان کا فیصلہ کرتے ہی اسفر نے بی اے میں داخلہ لے لیا تھا۔

''اگر سی ایس ایس کے امتحان میں تم کامیاب ہوگئے تو میں پانچ بکرے صدقے میں دوں گی۔ بس تمہیں کامیاب ہونا چاہیے۔ اس لیے یہ ناول چھوڑو اور متعلقہ کتابیں اٹھاؤ۔ ناول جیسی لمبی تفریح تو سدرہ جیسے ذہین فطین بچوں کے لیے ہوتی ہے تم ان سے دور ہی رہو۔'' فاخرہ کہتے ہوئے اٹھیں اور کام سے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

قنوطیت سے بھرے دل کے ساتھ اسفر نے ناول پائنتی پر رکھ دیا۔

''زندگی اتنی مشکل کیوں ہے۔ کاش سدرہ تم نہ

ہوتی یا کم از کم میری بہن نہ ہوتیں۔'' اسفر اپنی سوچ کو روک نہ پایا۔

''برخوردار ماں کی باتیں دل پر مت لیا کرو۔'' زوار چہرے پر مسکراہٹ لے آئے۔ زوار اب کوشش کرتے تھے کہ اسفر سے کوئی نہ کوئی بات کرتے رہیں۔

اسفر نے مسکراتے باپ کو دیکھا۔ کیسی بے رنگ مسکراہٹ تھی۔ کچھ کہے سنے بنا وہ بھی وہاں سے اٹھ آیا۔

☆......☆......☆

منگنی کا جوڑا گلابی رنگ کا تھا۔ ہلکا گلابی جس پر ستاروں کا دلکش کام تھا۔ جواد کے ساتھ سدرہ خود گئی تھی اور برائیڈل کلاتھ ہاؤس سے کئی جوڑے مسترد کرنے کے بعد اس نے یہ جوڑا منتخب کیا تھا۔

جواد سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا سوٹ اس نے شہر کے سب سے بڑے ٹیلر سے سلوایا تھا۔ کالر، کف، شولڈر ہر حصہ مکمل ناپ کا تھا۔ اتنا وجیہہ جواد پہلے کبھی نہ لگا تھا۔

شہر کے مشہور ہوٹل کا ہال بک کروایا گیا تھا۔ منگنی شدہ جوڑا اسٹیج پر بیٹھا دمک رہا تھا۔ اور مہمان ہائی ٹی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

نسبتاً الگ تھلگ بیٹھے ہوئے زوار کے دل کو خواہ مخواہ ملال نے آگھیرا۔ جواد کی فیملی ان کی سوچ سے کہیں زیادہ امیر تھی۔ منگنی کا فنکشن وہ لوگ اس پیمانے پر کر رہے تھے تو پتا نہیں شادی کیسی ہوگی۔ ان کے ذہن میں اپنی پرانے ماڈل کے موبائلز کی اسسریز سے بھری دکان آگئی۔

''زوار آج تو یوں مراقبے میں الگ تھلگ مت بیٹھو تمہاری بیٹی کی شادی ہے۔ انجوائے کرو۔''

سیاہ کپڑوں میں ملبوس فاخرہ اس قدر جوان لگ رہی تھیں کہ اگر کسی انجان بندے کو بتایا جاتا وہ زوار کی بیوی نہیں بیٹی ہے تو وہ بلا تامل مان لیتا۔

''اچھا تم نے کچھ کھایا بھی نہ ہوگا۔۔۔۔۔ میں لاتی ہوں۔'' سیلف سروس تھی اسی لیے فاخرہ خود لینے چلی گئیں۔

اب تو سارا انتظام لڑکے والوں نے کیا تھا اور زوار سوچ رہے تھے برات کے لیے تو وہ کبھی ایسا انتظام نہ کر پائیں گے تاوقتیکہ اپنی دکان بیچیں۔

''اللہ مالک ہے۔ اس کی مصلحت ہم کیا جانیں۔'' زوار نے خود کو ہلکا پھلکا کوشش کی تھی۔

ماں کے ساتھ خولہ منگنی میں شرکت کے لیے گاؤں سے آئی تو جوش وخروش سے گئی تھی پر یہاں آکر سمٹ سمٹا گئی تھی۔ بی اے کی طالبہ اپنے بہترین کپڑوں میں تھی پر گاؤں سے لیے گئے اس کے بہترین کپڑے فور سٹار ہوٹل کی فسوں خیزی میں گہنائے ہوئے لگتے تھے اس کی خود اعتمادی بھی ہوٹل کی چمک دمک میں گم ہوگئی تھی۔

پانی کی پیاس لگی تو ہامنزل واٹر کی سیل بند بوتلوں کے ساتھ گوبلٹ پڑے نظر آئے ایسے گلاس اس نے بس انڈین فلموں میں دیکھے تھے گوبلٹ سے پانی پینے لگی تو گلاس چھلک پڑا اور اس کے سارے کپڑے گیلے ہوگئے۔ دوبارہ وہ پانی نہ پی سکی اور سارا فنکشن پیاسی ہی رہی۔

منہ لٹکائے اسفر تقریب کے اختتام کا انتظار کر رہا تھا اور ٹرائفل کی پلیٹ میں چمچ ہلاتی خوبصورت دعا اسفر کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''وہ دن دور نہیں اسفر جب ہم دونوں ایسے ہی ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے ہوں گے اور بے وجہ مسکراتے ہوں گے۔''

☆......☆......☆

''میرا نام سونیا تھا۔ سب مجھے پیار سے سونی بلاتے تھے میرے امی ابو تھے۔ ابو کا میرے بغیر دل نہیں لگتا تھا۔ میری حرکتوں سے امی تھوڑی عاجز رہتی تھیں۔ لیکن وہ بھی مجھ سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ تین سال کی یا پھر شاید چار سال کی۔ گرمیوں کے دن تھے بچوں والی ایک نظم ہر وقت میری زبان پر رہتی تھی۔ وہ نظم مجھے اب یاد تو نہیں ہاں البتہ یہ یاد ہے کہ ایک تتلی ٹھنڈا پانی پیتی تھی۔ ان دنوں ٹی وی پر ایک آئس کریم کا اشتہار آتا

تھا جس میں گائے آئسکریم کھاتی تھی۔ ابو کو میں کئی دنوں سے کہہ رہی تھی مجھے وہ آئسکریم لا دیں پر ابو کہتے تھے آئسکریم پگھل جائے گی انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ شام کو جب وہ کام سے واپس آئیں تو ہم آئسکریم کھانے جائیں گے۔ میں ابو کا انتظار کر رہی تھی۔ امی سو رہی تھیں۔ میں دروازے میں آ کر دیکھنے لگی ابو آ تو نہیں گئے۔ بچپن میں تو ہر کوئی ایسے جلد باز اور بے صبرا ہوتا ہے۔ میں بھی بے صبری سے ابو کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت گلی میں ایک آدمی آیا اس نے کہا مجھے تمہارے ابو نے بھیجا ہے۔ مجھے اس نے اٹھا لیا اور اس نے مجھے آئسکریم کھلائی۔ آئسکریم بہت مزے کی تھی۔ پر وہ مجھے واپس گھر نہ چھوڑ گیا۔ اپنے ساتھ پتا نہیں کہاں لے آیا۔ وہ جگہ گندی تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا میں روتی رہی۔ رات کو اس نے مجھے ایک اور آدمی کی گود میں ڈال دیا۔ اس آدمی کے چہرے پر میرے ابو کی طرح چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ میں نے کہا مجھے میرے امی ابو کے پاس چھوڑ آؤ، آدمی کہتا تھا چھوڑ آؤں گا اس رات اس نے میرے ساتھ.......... میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے اپنے ابو کا نام نہیں آتا تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا میرا گھر کہاں ہے، مجھے دائیں بائیں جوتے کا بھی نہیں پتا چلتا تھا۔ رفع حاجت کے بعد بھی مجھے کسی کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی اور......''

چنبیلی نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو اندر دھکیلنے کی کوشش کی پر آنسو آنکھوں کے کونے گیلے کرنے لگے تھے۔ انگلی کی پور سے اپنی آنکھ کا آنسو چنتی ردا نے ٹشو باکس چنبیلی کی طرف بڑھایا تھا۔ چنبیلی نے ایک ٹشو لے لیا اور آنکھیں رگڑی تھیں۔

''مجھے نوید الے آیا تھا۔ اس نے کبھی شادی نہیں کی پر ایک عورت اس کی بیوی کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ عورت بھی پیشہ کرتی تھی۔ مگر نوید ے کو غرض نہ تھا۔ وہ مختلف گلی محلوں سے پانچ لڑکیاں چرا لایا تھا۔ میں پانچویں لڑکی تھی۔ مجھ سے پہلے وہ جو لڑکیاں اٹھا لایا تھا ان میں بھی ایک لڑکی کا نام سونی تھا۔ اب ایک چھت تلے ایک ہی نام کی دو لڑکیاں تو نہیں رہ سکتی تھیں اس لیے اس نے آسانی کے لیے میرا نام چنبیلی رکھ دیا اور میں چنبیلی بن گئی۔ کچھ سال پہلے نوید امر گیا تھا۔ اور میرے ساتھ کی ایک لڑکی بھی نامعلوم طریقے سے مر گئی تھی۔ اس کی مسخ شدہ لاش راوی سے ملی تھی۔ ہم لوگ لاش لینے بھی نہ گئے۔ لاش لینے جاتے تو کیا کہتے؟ مجھ سمیت چار لڑکیاں اور ایک ہیجڑا ہم پانچ لوگ آج بھی اس چھت تلے شب و روز گزار رہے تھے جہاں مجھے اول روز لایا گیا تھا۔ یہ صرف میری کہانی نہیں میرے ساتھ رہنے والی ہر لڑکی کی کہانی ہے۔''

نم ہوتی آنکھیں رگڑنے کے لیے چنبیلی نے ایک اور ٹشو، ٹشو باکس سے نکالا تھا۔ فاخرہ بے دھیانی سے بیٹھی اپنے ناخن فائل کر رہی تھیں ان کی توجہ ٹی وی کی طرف کم مبذول تھی۔ زوار یک ٹک ٹی وی کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ جہاں پر نقاب میں بیٹھی لڑکی اپنی داستان الم سنا رہی تھی۔ نقاب سے جھانکتی آنکھوں کی بناوٹ بالکل زوار کی آنکھوں کی سی تھی۔

''یہ۔۔۔۔ یہ میری بیٹی سونی ہے۔'' زوار کی آواز کرلائی تھی۔

فاخرہ کے حرکت کرتے ہاتھ لمحے بھر میں ساکن ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

زوار نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ نمبر ڈائل کیا اور فون کانوں سے لگا لیا۔ دوسری طرف گھنٹی جاتے لگی۔

ردا کے شو کے اختتام میں فیڈ بیک اور رابطے کے لیے نمبر دیا جاتا تھا۔ یہ نمبر ردا کے پی اے کا تھا۔ پی اے سمجھتا کہ بات میم سے کروانی ہے تو وہ کال میم کو فارورڈ کر دیتا۔

اور یہ کال تو میم کو فارورڈ کرنے والی تھی۔

''جی میں ردا بات کر رہی ہوں۔'' پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں وہ ابھی بیٹھی ہی تھی کہ کال آ گئی۔

''میں زوار ہوں۔'' آواز کی لرزش پر قابو پانا زوار کے بس میں نہ تھا۔

''جی فرمایئے زوار صاحب میں آپ کی کیا مدد

کر سکتی ہوں؟'' ردا نے اگنیشن میں چابی دی تھی اور آنکھوں پر لگا چشمہ اتار کر سامنے ڈیش بورڈ پر رکھا تھا۔

''ابھی آپ کا جو ٹی وی شو آیا تھا جس میں آپ نے ایک لڑکی مہمان بلائی تھی۔'' زوار لمحے بھر کو رکے تھے۔ ردا کے دل کی دھڑکن کی لے الگ سی ہوئی پی اے نے فون فارورڈ کیا تھا یقیناً خاص بات ہی ہوگی۔

''جی جی بولیے میں سن رہی ہوں۔'' ردا سیدھی ہو کر بیٹھی۔

''وہ لڑکی میری سونی میری بیٹی ہے، سالوں پہلے وہ کھو گئی تھی۔ میں اس لڑکی کا بدنصیب باپ ہوں۔'' زوار کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی ردا لمحے بھر کے لیے سکتے میں ہی آگئی۔

''زوار صاحب آپ اس وقت کہاں ہیں۔ میں آپ سے ابھی ملنا چاہتی ہوں۔'' دل کے دھڑکنے کی رفتار تیز تھی۔

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟ میں پہنچ جاتا ہوں۔'' زوار اب پھوٹ کر رو رہے تھے ایک طویل سانس لے کر ردا انہیں پتا سمجھانے لگی۔

فون بند کرنے کے بعد وہ اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ جمائے بیٹھی سوچتی رہی۔

''چنبیلی کیسی روح تک کو شرما دینے والی حقیقت تھی اور محض اس کا ایک شو کتنی بڑی مہربانی لے آیا تھا۔ بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملا رہا تھا۔

''اللہ کا احسان ہے۔ میرا اس میں کیا کمال۔'' عجز سے سوچتے ہوئے ردا نے آنکھوں میں اتری نمی صاف کی تھی اور چنبیلی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''ہاں چنبیلی کہاں ہو؟'' چنبیلی کے فون اٹھاتے ہی ردا نے پوچھا تھا۔

''گھر پر ہی ہوں باجی شام ہو رہی ہے۔ تیاری کر کے باہر کام کے لیے نکلنا ہے۔ خیریت تو ہے؟؟''

''ہاں خیریت ہے۔''

''پر باجی آپ کی آواز سے تو خیریت نہیں لگ رہی۔ شو کی وجہ سے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی آج کل تو لوگ ویسے بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور چینل بند کروا دیتے ہیں۔'' ردا کی زبانی چنبیلی خدشات سے واقف تھی اسی لیے تشویش کا اظہار کر رہی تھی۔

ردا نے اپنے اعصاب پر سکون کرنے کی کوشش کی۔

''چنبیلی ایسا کوئی مسئلہ نہیں لوگوں نے اچھا فیڈ بیک دیا ہے۔ اس سے بھی ایک اور اہم بات ہے تم گھر پر ہی رہنا۔ باہر مت نکلنا میں ایک گھنٹے تک تمہارے پاس آتی ہوں۔ میرے ساتھ ایک آدمی بھی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے باجی۔'' چنبیلی نے شانے اچکا کر فون بند کر دیا۔

''جانے کیا بات ہے یوں آدھی ادھوری بات کا فائدہ اب میں تو ایک گھنٹہ بس اندازے ہی لگاتی رہوں۔'' چنبیلی نے ایک نظر اپنے عکس کو آئینے میں دیکھا تھا کو اس کی تیاری تھوڑی سی رہتی تھی۔ ردا کی کال نہ آتی تو اب تک وہ مکمل تیار ہو چکی ہوتی۔

''چلو دیکھتے ہیں۔'' باریک نمائشی دوپٹا اس نے صندوق پر پھیلا کر رکھ دیا اور خود چارپائی پر لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

ردا کے ساتھ آنے والا آدمی زیادہ عمر کا نہ ہونے کے باوجود کافی بوڑھا لگتا تھا۔

سفید سر، سفید داڑھی، کھچڑی داڑھی جس کو دیکھ کر لگتا تھا اس کی تراش پر کبھی توجہ نہیں دی گئی۔ آنکھوں کے گرد جھریاں۔ لٹکے گال۔

اگر وہ اپنے اوپر توجہ دیتا تو اتنا بوڑھا بھی نہ لگتا۔

ردا زوار کو چنبیلی کے کمرے میں ہی لے آئی تھی شام ہو چکی تھی سب لڑکیاں کام پر جا چکی تھیں اب چنبیلی گھر میں اکیلی تھی صندوق پر پڑا باریک، دوپٹا تکلفاً گلے میں ڈالتے ہوئے چنبیلی سوالیہ نظروں سے ردا کو دیکھنے لگی تھی۔ اس بوڑھے آدمی کو ردا کیوں لائی تھی۔ یہ بات تو بعید از قیاس ہی تھی کہ ردا چنبیلی کے لیے گاہک ساتھ لے آتی پر چنبیلی کے ذہن میں اس

سوچ کے علاوہ کوئی اور سوچ نہ آئی۔

اس سے قبل ردا کچھ بولتی زوار خود ہی بول پڑے۔

''تم میری سونی ہی ہونا۔'' زوار کے لہجے میں بے تابی تھی۔ چنبیلی کو سمجھ ہی نہ آیا۔ ناسمجھی کے عالم میں وہ ردا کو تکنے لگی۔ ردا سر جھکائے کھڑی تھی۔

''میری سونی میں تمہارا باپ ہوں۔'' زوار کی آنکھیں بار بار دھندلا رہی تھیں چنبیلی ایک لمحے کو لڑکھڑا ہی گئی گلے میں پڑا دوپٹا پھسلتا نیچے زمین پر گر گیا۔

زوار آگے بڑھے اور چنبیلی کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ روتے جاتے اور چنبیلی کے گال ماتھے اور بالوں پر بوسے دیتے جاتے۔

چنبیلی بت بنی کچھ بھی نہ کر پائی۔ بے یقینی اس کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو آنسو آنکھوں میں اُمڈ آئے اور چہرے کو گیلا کرتے پھسلتے چلے گئے۔

زوار یوں ہی چنبیلی کو اپنے ساتھ لگائے روتے رہے، روتے رہے رفتہ رفتہ چنبیلی کی ساکت وجود میں بھی حرکت آئی اور اس نے بھی زوار کے گرد اپنے بازوؤں کا ہالہ بنالیا۔

''ابو'' اپنے منہ سے نکلا یہ لفظ کس قدر اجنبی لگتا تھا اس کا اندازہ چنبیلی کو ہی تھا۔ باپ سے الگ ہوکر چنبیلی نے خود کو دیکھا۔ باریک سوٹ میں ملبوس، بدن کا رنگ سوٹ سے چھلکتا تھا۔ گلا اس قدر گہرا تھا کہ۔۔۔۔ چنبیلی سمٹ سمٹا گئی۔ زمین پر گرا دوپٹا اٹھایا اور لپیٹا ریشمی دوپٹا سر پر اور نہ کندھوں پر ٹکتا تھا۔ یہ زندگی میں پہلی بار تھا کہ چنبیلی کو اپنے حلیے پر شرمندگی محسوس ہورہی تھی۔

''چنبیلی اپنے ابو کے لیے پانی لے آؤ۔'' پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ مسلسل روئے جارہے ہیں۔'' ردا نے یہ کہا تو چنبیلی برق رفتاری سے اٹھی اور پانی لینے چل دی۔

زوار ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتے رہے۔

باورچی خانے میں گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے چنبیلی کو لمحے بھر کو شبہ ہوا جو کچھ ہورہا ہے وہ کہیں خواب وسراب تو نہیں۔ گلاس پانی سے لبالب بھر کر چھلکتا رہا جگ ہاتھ میں پکڑے چنبیلی بے خیالی میں پانی انڈیلتی رہی۔

اس رات زوار چنبیلی کو اپنے ساتھ گھر لائے تھے۔ اپنے کمرے میں اپنے ساتھ والی چارپائی پر لٹایا تھا۔ ساری رات دونوں باپ بیٹی نے آنکھوں میں گزاری بھی زوار کو نیند آئی اور نہ چنبیلی کو

☆......☆......☆

یہ صبح کا وقت تھا۔ چنبیلی کو زوار نے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا تھا۔ ابھی بھی وقفے وقفے سے آنکھیں نم ہوجاتی تھیں۔

''سونی تمہیں یہ آنگن یاد ہے میں اور تمہاری ماں ادھر صحن میں چارپائیوں پر سوتے تھے اور تم صبح صبح اٹھ جایا کرتی تھیں۔ صبح ہم دونوں سے بھی پہلے اور رخسار کو بھی تمہاری وجہ سے جلدی اٹھنا پڑتا۔ تین پہیوں والا سائیکل گھسیٹتے ہوئے تم بچوں کی نظمیں گایا کرتی تھی۔'' زوار صحن میں ایسے نظریں جمائے بیٹھے تھے جیسے یہ منظر آنکھوں کے سامنے ہی ہو۔ چنبیلی خالی ذہن لیے باپ کا چہرہ تکتی رہی۔

''تمہارے کھو جانے کے تھوڑے عرصے بعد رخسار بھی اس دنیا سے چلی گئی تمہاری جدائی نہ سہہ پائی۔'' زوار کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔ ایسے جیسے ماضی میں ہی چلے گئے ہوں۔

''اتنی چپ کیوں ہو سونی میں تمہاری آواز سننے کے لیے بے چین ہوں۔ کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔ صبح تم نے ناشتا بھی صحیح طرح سے نہیں کیا۔'' زوار نے بے قراری سے پوچھا تھا۔ چنبیلی نے بس ہولے سے نفی میں ہلا دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں تو ابو'' لفظ ابو زبان سے بدقت ہی ادا ہوتا تھا۔

''بہن بھائی سے ملی تم؟؟ اب تو دونوں کالج چلے گئے ہوں۔ آجائیں تو دل کھول کر باتیں کرنا۔ فاخرہ، فاخرہ۔۔۔'' زوار فاخرہ کو آواز دینے لگے۔ فاخرہ ساتھ والے کمرے سے نکلیں اور دروازے کی چوکھٹ میں ہی بنا کچھ کہے رک گئیں۔

"اب سکول سے چھٹی کی ہے تو آ کر بچی کے ساتھ بیٹھو کچھ اپنی سناؤ اور کچھ اس کی سنو۔" زوار اپنی ہی دھن میں کہے جا رہے تھے فاخرہ کے کرخت چہرے کی طرف ان کا دھیان ہی نہ گیا۔

"فاخرہ ادھر کیوں کھڑی ہو؟ آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔ سونی ہمارے خاندان کی پہلی لڑکی تھی چار نسلوں بعد پیدا ہونے والی لڑکی اس کی اہمیت کا اندازہ تو تم اسی بات سے لگا لو۔ سونی کی پیدائش پر پورے خاندان میں خوشیاں منائی گئی تھیں۔ دور دور سے رشتہ دار مبارک دینے آئے تھے۔" جوش سے زوار کی آواز اونچی تھی فاخرہ نے زوار کے ساتھ رفاقت کے ان تیس سالوں میں زوار کو پہلے کبھی اس قدر خوش و پر جوش نہیں دیکھا تھا۔

"میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتی ہوں۔" بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے فاخرہ باورچی خانے کی طرف مڑ گئیں۔

"بالکل بالکل آج طعام کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ پر فاخرہ رکو سونی سے پوچھ لو اس کی پسندیدہ ڈشیں کون سی ہیں کھانے میں آج تمام ڈشیں سونی کی پسند کی ہونی چاہئیں۔" زوار کہتے جا رہے تھے۔ فاخرہ سنی ان سنی کر کے کچن میں چلی آئیں۔

"سدرہ اور اسفر تمہارے بہن بھائی عمر میں تم سے لگ بھگ چھ سال چھوٹے ہیں، دونوں جڑواں ہیں۔ بڑی مثالی محبت پائی جاتی ہے دونوں میں۔" زوار جانے کونسی محبت کو مثالی قرار دے رہے تھے۔

"تم بھی تو بولو سونی اتنی چپ کیوں بیٹھی ہو۔" زوار کو احساس ہونے لگا صبح سے وہ ہی بولے جا رہے ہیں۔ سونی نے تھوک نگلی اور کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئی۔

"میں اپنے پرانے گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟" زوار اچنبھے سے یوں پوچھ رہے تھے جیسے یہ انتہائی غیر متوقع خواہش ہو۔

"وہ میں نے .... میں اپنا سامان لینا ہے۔" چنبیلی اٹکتے ہوئے بول رہی تھی اس کی زبان پہلے کبھی بولتے ہوئے ایسے نہ اٹکی تھی۔

"جانے دو سامان کو ہم نیا خرید یں گے۔" زوار پہلے والی ٹون میں آنے لگے۔

"نہیں وہ میں نے اپنی سہیلیوں سے بھی ملنا ہے کل انہیں بنا بتائے آ گئی تھی اب پریشان نہ ہوں۔" چنبیلی نے کہا تو زوار لمحہ بھر سوچتے رہے۔

"فون پر بتا دو۔ فون نمبر تو ہوگا ہی تمہارے پاس۔" زوار جیسے آسان حل نکال رہے تھے۔

"فون پر نہیں۔ میں خود جا کر بتانا چاہتی ہوں۔" چنبیلی نے سر جھکا لیا نظریں بے ساختہ اپنے ہاتھوں پر پڑیں۔ لمبے ناخن والے سرخ نیل پالش سے رنگے ہاتھ تھے۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے میری بچی، تمہاری سہیلیوں سے مل آتے ہیں انہیں بتا آتے ہیں، الوداع کہہ آتے ہیں۔"

"مل آتے ہیں، بتا آتے ہیں، کہہ آتے ہیں۔" چنبیلی صیغوں پر غور کرنے لگی جمع کا صیغہ کیوں تھا۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گا نا۔" زوار نے سمجھایا تھا اور پھر سے دوسری باتوں میں مشغول ہو گئے۔ چنبیلی نے ایک بار پھر تھوک نگلی تھی۔

"میں اکیلے جانا چاہتی ہوں۔"

جوش سے بولتے زوار یکدم چپ کر گئے۔

☆......☆......☆

یہ وہ گھر تھا جہاں اس نے زندگی کے پچیس سال گزارے تھے۔ دہلیز پار کرتے ہوئے عجب سے احساسات تھے۔ اپنے کمرے میں گئی چندہ بے سدھ سو رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں گئی۔ رانی اور روزی بھی ہوش سے بیگانہ نیند پوری کر رہی تھیں۔ رانی کے خراٹے کتنے اونچے تھے۔ چنبیلی صحن کے بیچوں بیچ آ کر کھڑی ہو گئی در و دیوار کو تکنے لگی۔ دائیں دیوار، بائیں دیوار، پچھلی دیوار، اگلی دیوار، یونہی گھومتی جاتی ہو اور تکتی جاتی۔ تبھی سیفی اپنے ڈربے سے نکلا ہاتھ میں تولیہ لیے نہانے کی نیت سے غسل خانے جا رہا تھا۔

"چنبیلی تو ٹھیک تو ہے یوں چکر کیوں کاٹ رہی ہے۔" چنبیلی رک گئی خالی خالی نظروں سے سیفی

کو دیکھنے لگی۔

''رات کو گاہک نہیں لگا کیا؟ تجھے نیند پوری نہیں کرنی۔'' چنبیلی نے ایک ایک لفظ غور سے سنا اور سوچنے لگی کیا یہ وہ گفتگو ہے جو وہ اپنے باپ کے سامنے کرسکتی ہے۔

''ویسے تیرے کل والے شو نے بڑی دھوم مچادی میں نے کل دو جگہ پر لوگوں کو تذکرہ کرتے سنا تھا۔'' سیفی کہتا غسل خانے کی طرف چل دیا۔

''دھوم'' چنبیلی نے زیر لب لفظ ادا کیا۔ آنکھیں پٹپٹائیں۔ پلکیں نم ہوگئیں۔

قدم قدم چلتی اپنے کمرے میں آئی اور دائیں طرف پڑی اپنی صندوق کا ڈھکن کھولا۔ صندوق کے اندر اس کے کپڑے پڑے تھے۔ کچھ غیر ضروری اشیاء □ بھی تھیں اور ایک شراب کی بوتل بھی تھی۔ کپڑے نکال کر وہ دیکھنے لگی۔

سرخ جوڑے، نارنجی جوڑے، قرمزی جوڑے اور ایک عدد سنہری پلو اور سرخ بلاؤز والی ساڑھی۔ سارے ملبوسات کس قدر چنچل رنگوں کے تھے۔ چنبیلی نے الٹ پلٹ کر کپڑوں کو دیکھا۔ شوخ کپڑوں میں سے اکثر باریک تھے۔ سلائی بھی ایسی تھی کہ بیہودگی کا پورا سامان ہو پائے۔

''فاحشہ'' چنبیلی کو بے اختیار وہ شام یاد آگئی جب بدر نے اسے سڑک کنارے مارا تھا اور اسے اسی نام سے پکارا تھا۔

ہاں وہ فاحشہ تھی۔ پر اب اپنے باپ کے گھر جا رہی تھی۔ زندگی کیسے عجب موڑ پر آگئی تھی شراب کی بوتل کو اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا یہ مہنگی شراب تھی اور چنبیلی کی پسندیدہ شراب تھی بلکہ یہاں رہائش پذیر مکینوں میں سے واحد چنبیلی تھی جو باقاعدگی سے شراب پیتی تھی۔ باقی لڑکیاں تو مل گئی تو پی لی نہ ملی تو بھی گزارا کرلیا کی تصویر تھیں کیونکہ بہرحال شراب ایک مہنگی عیاشی تھی۔

شراب کی بوتل کو چنبیلی نے آخری بار دیکھا اور پھر چھوڑ دی۔ بوتل زمین پر گری اور چکنا چور ہوگئی، محلول فرش کو گیلا کرتا گیا۔

تبھی چندہ کی آنکھ کھلی یقیناً بوتل کے ٹوٹنے سے کھلی تھی۔

''چنبیلی کیا صبح صبح یوں کھڑی ہے؟ سو جا۔'' چندہ کی آواز میں نیند کا خمار تھا۔ کروٹ لے کر وہ ایک بار پھر نیند کی وادیوں میں جا چکی تھی۔ چنبیلی یوں ہی کھڑی رہ گئی جیسے انسان سے مجسمہ بن گئی ہو۔

☆......☆......☆

رانی، روزی، چندہ اور سیفی تم سب کو سلام۔

سمجھ نہیں آتا بات کہاں سے شروع کروں ایک دن بلکہ چند گھنٹوں کے اندر زندگی ہی بدل گئی مجھے میرے ابو مل گئے ہیں۔ ٹی وی والا شو انہوں نے دیکھا اور ردا باجی سے رابطہ کیا۔ ردا باجی انہیں ادھر لے آئی اور کل رات میں نے اپنے گھر میں گزاری۔ وہ گھر جہاں سے مجھے نوید لے آیا تھا۔

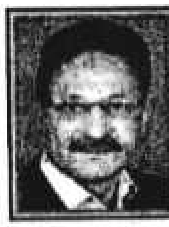
کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی یوں پلٹا کھائے گی کہ راتوں رات یہ سب ہو جائے گا۔ واقعی زندگی سے زیادہ غیر متوقع کوئی اور چیز نہیں۔ ساری زندگی تم لوگوں کیساتھ ادھر گزاری ہے۔ اب یوں اچانک جانا پڑ رہا ہے۔ دل ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہے۔ کچھ کچھ اداس بھی ہے تقریباً پچیس سال اکھٹے گزارے ہیں۔ پچیس سال کم تو نہیں ہوتے آدھی زندگی کے برابر ہوتے ہیں۔

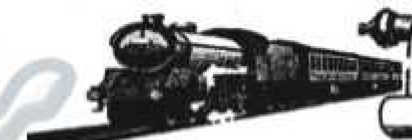
میری امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ابو نے دوسری شادی کرلی تھی۔ میری سوتیلی ماں نے میرا استقبال کھلے دل کے ساتھ نہیں کیا۔ اس میں اس کا قصور بھی نہیں، میں ہوتی تو شائد میں بھی ایسا کرتی۔ میرے جڑواں سوتیلے بہن بھائی بھی ہیں۔ بہن ڈاکٹر بن رہی ہے کیسا قسمت کا کھیل ہے کہاں نئے مردوں کا منہ لگنے والی عورت اور کہاں اب ایک ڈاکٹر کی بہن کہلاؤں گی۔ میرا گھر شہر کے ایک شریف محلے میں ہے۔ ایسا شریف کہ جہاں پر کبھی ہمیں جانا بھی پڑ جاتا تو ہمارے دل کپکپا جاتے بہرحال ایسے شریف محلوں میں بھی کہانیاں تو موجود ہوتی ہیں لیکن وہ پھر بھی شریف محلے ہی ہوتے ہیں۔

(جاری ہے)

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان
دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

کانٹا کھنچ گیا





جاوید راہی

اس مجرم کی زندگی ریل کی پٹڑیوں کی طرح سیدھی چلتی چلی جا رہی تھی کہ اچانک ہی کانٹا کھنچ گیا اور...

میں نے پلیٹ فارم کے آخری کونے پر کھڑے پتھر کے بینچ پر بیٹھتے آج کے سارے دن کی کارروائی کو اپنے ذہن کے کینوس پر ترتیب دیتے شادو حوالاتی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ ٹرین آنے میں ابھی گھنٹہ بھر پڑا تھا اور میں نے اس وقت کو فضول بیٹھ کر گزارنے کی بجائے کام میں لانے کے بارے میں سوچا۔

''مجھے مزمل بھائی نے اس بات سے خفا ہو کر شاپ سے اُٹھا باہر کیا کہ میں آج پھر گھر سے دیر کرتے شاپ پر پہنچا تھا۔ راستے میں ٹریفک کی بدحالی اور رش کے باعث مزید دیر ہو چکی تھی۔ مزمل بھائی نے مجھے اس بات پر خفا ہو کر شاپ سے بے دخل کر دیا تھا۔''

میں نے شہزاد کا بھرپور جائزہ لیا جو ڈکیتی کی کئی وارداتوں میں گرفتار ہو کر جیل میں آیا تھا۔ جیل کے وزٹ میں مختلف قیدیوں سے تبادلہ خیال ہوا اور مجھے جیل کے اندر کا ماحول' قاعدہ قانون کی دہلیز کا احترام کرتا ملا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نور الحسن صاحب کی شبانہ روز توجہ اور محنت کا ثمر قیدیوں کی اخلاقی اور دینی تربیت گاہ کی شکل میں میرے سامنے تھا۔ جیل تو آخر جیل ہی ہوتا ہے۔ اگر یہاں آئے ملزمان کی صدقِ دل سے تربیت کی جائے تو وہ عبادت سے کم نہیں ہوگی۔ جیل کے اندر اعلیٰ طرز کی پھول پھلواری، بہترین گھاس کے چاروں جانب پھیلے گراسی پلاٹ، کھانے کا مینو اور ہسپتال میں ڈینٹل یونٹ سے لے کر ہر طرح کی طبی سہولت کا انتظام نور الحسن بھکیلا صاحب کی فہم و فراست کا منہ بولتا نقشہ پیش کر رہا تھا۔

ملک بھر کے چاروں صوبوں کی جیلوں میں آنے جانے کا سلسلہ لگا رہتا ہے مگر نئی جیل میں ہونے والی کئی ایک جدید سہولتیں مجھے واقعی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ حوالاتی قیدیوں کا سامان جدید ٹرالیوں پر رکھ کر دوبارہ پلیٹ فارم پر پہنچانے کے بعد سپرنٹنڈنٹ صاحب ڈپٹی صاحبان اور دیگر عملہ کی موجودگی میں مکمل چھان بین سے حوالاتی قیدیوں کے سپرد کیا جاتا۔ جیل کے باہر کا ماحول کسی پارک کا نعم البدل محسوس ہو رہا تھا۔ صاف ستھرا پبلک کنٹین اور وہاں ملنے والی اشیاء خوردنی کا ریٹ اور معیار باہر کے عام ریٹ کے برابر ہونے سے جیل انتظامیہ کی اعلیٰ کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ جیل کے اندر اور باہر تعمیراتی معاملات کی خود نگرانی اور مشاورت بھی جیلر صاحب کی ذاتی دلچسپی کا حصہ بنی نظر آئی۔ حوالاتی قیدیوں میں سے جو ایک قیدی میری

توجہ کا حصہ بنا اس کی کہانی کچھ یوں ہے۔

''ہاں تو شہزادا اتنی ہمت اور وہ بھی اکیلے بغیر کسی ساتھی کی مدد سے؟''

''مزمل بھائی کے دھتکارنے کے بعد میں بڑا پریشان سا اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ بھوک سے نڈھال ہو کر گھر آیا تو سب گھر والے میرے ساتھ اُلجھ پڑے۔ والدہ صاحبہ نے بیچ میں آنے کی کوشش کی تو حاجی صاحب نے بھی روایتی والد کا ہی فرض نبھایا اور مجھے گھر سے نکل جانے کا حکم سنا ڈالا۔ یہ ٹھیک تھا کہ میرے نصیب میں پڑھائی نہیں تھی' ایک دو جگہ پر مختلف ہنر سیکھنے کیلئے بھیجا گیا مگر بات کوئی بھی پلے نہ پڑی تو گھر کی شاپ پر مزمل بھائی کے ساتھ ہو گیا۔ یہاں بھی ہر وقت تو تکرار جاری رہتی۔ زندگی بوجھ بنی ہوئی تھی' مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق سنتا رہتا اور خود پر جبر کرنے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔

والد صاحب کا رویہ بھی مزمل بھائی سے کم نہیں تھا اس لئے میں گھر چھوڑ کر نکل پڑا۔ دو ایک دوستوں کے پاس گیا مگر گہری مایوسی ہوئی۔

جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ کسی ڈھنگ کے ہوٹل سے کھانا کھا لیتا۔ ایک ریڑھی سے چنے نان لے کر پیٹ کا دوزخ بھرا اور چائے والے ہوٹل پر آ کر چائے کا آرڈر دیتے خالی کرسی سنبھال کر ٹی وی پر چلنے والی ہندی فلم میں گم ہو گیا۔ رات گئے تک اسی ہوٹل پر ٹکا رہا اور جب ہوٹل بند ہونے لگا تو یہ سوچ کر گھر کی سمت چل پڑا کہ پچھلی دیوار پھاند کر اوپر چھت پر بنی ممٹی میں جالیٹوں گا پہلے بھی کئی بار میں یہ کر چکا تھا۔

سارے گھر والے سو چکے تھے اور میں نے حسب سابق پچھلی دیوار پر ہاتھ جمائے اور آہستگی سے اندر اُتر کر سیڑھیوں کے راستے اوپر ممٹی میں آ گیا اور دیوار کے ساتھ لگی چارپائی بچھاتے اس پر دراز ہو گیا۔ مجھے پتا تھا کہ اوپر کوئی بھی نہیں آئے گا اس لئے بے فکری سے پڑتے ہی نیند نے دبوچ لیا۔

جس سے میری آنکھ کھلی میرے بالوں کو سہلاتے نرم و نازک ہاتھ میری والدہ صاحبہ کے تھے، جن کو میں نے چارپائی پر جھکے پایا۔ میں اُٹھ کر ماں کے سینے سے لپٹ گیا اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ والدہ صاحبہ نے مجھے تسلی دیتے ساتھ لائی روٹی میرے آگے رکھتے کہا۔



''تم کھاؤ میں پانی کی بوتل لے کر آتی ہوں۔'' یہ کہتے وہ سیڑھیوں کی طرف گھوم گئی۔ جب وہ آئیں تو پانی کے ساتھ ہاتھ میں پکڑا شاپر بھی تھا جس میں پڑے نوٹ صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''شادو بیٹا! یہ رکھ لو اور ان سے کوئی کام دھندا کر لو' یہ لوگ تمہیں جینے نہیں دیں گے۔ میں نے رات تمہیں دیوار پھلانگ کر اوپر جاتے دیکھ لیا تھا۔''

ماں مجھے پیار سے شادو کہہ کر بلاتی تھی۔ میں نے شاپر لے کر جیب میں رکھا اور کھانا ختم کرتے والدہ صاحبہ کے پیر چھوتے اجازت لی اور نیچے اُتر کر دالان کے راستے گھر سے باہر نکل آیا۔

کسی کو نہ میرے آنے کی اور نہ جانے کی خبر ہوئی۔ باہر آکر میں نے شاپر سے روپے نکالے جو چھبیس سو تھے۔ کام کیا کرنا تھا سارا دن اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد سول ہسپتال کے گراسی پلاٹ میں دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ جو اپنے اپنے مریضوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے پڑ کر رات بسر کر لیتا۔ اُدھر ہی میری ملاقات قاسم نامی ایک دیہاتی سے ہوئی جو میرے قریب ہی دری ڈالے پڑا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں سے پتا چلا کہ گاؤں میں لڑائی کے دوران اس کے چھوٹے بھائی حاکم علی کو مخالفین نے فائرنگ کر کے شدید زخمی کر دیا تھا اور وہ اس کا علاج کروانے لایا ہوا تھا۔ سارا دن اس کے رشتہ دار اس کے ساتھ رہتے شام کو وہ واپس لوٹ جاتے اور قاسم میرے قریب آپڑتا۔ تین دن ہو چلے تھے مجھے اس کے ساتھ کھاتے پیتے اس کا مجھے اور اسے میرا اپنا پتا چل گیا تھا۔ میرے بھائی اور والد کے رویہ کا سن کر قاسم نے بہت دکھ کیا۔ جب اس کے دوسرے رشتہ دار آتے تو قاسم مجھے اپنا دوست بتاتے تعارف کرواتا۔ یوں میں قاسم کی دوستی میں رہ کر اپنا وقت پاس کر رہا تھا۔

ڈاکٹروں نے آپریشن کیلئے اس کے بھائی کو لاہور ریفر کر دیا۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے ایمبولینس کا بندوبست کیا۔ قاسم نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میرا یہاں کون سا کام تھا؟ میں نے کوئی عذر کیے بغیر ساتھ چلنے کی رضامندی ظاہر کر دی' یوں میں اس کی فیملی کے ساتھ حاکم علی کو لے کر لاہور چل پڑا۔

قاسم سفید پوش آدمی تھا۔ بقول اس کے گھر میں دودھ کیلئے رکھی بھینس فروخت کر کے حاکم علی کا علاج اور مقدمہ لڑ رہا تھا۔ لاہور آکر علاج کے اخراجات کئی گنا بڑھ گئے تھے اوپر سے کھانے پینے کا الگ خرچہ۔ قاسم کی بیوی اور بڑی بہن ساتھ تھیں' ڈاکٹروں نے آپریشن کی تاریخ دیتے ہی پندرہ سے بیس ہزار کا بندوبست کرنے کا بتایا تو قاسم پریشان ہو گیا۔ جو چار پانچ ہزار پاس تھے ان میں سے بھی پندرہ سو خرچ ہو گیا تھا۔

''اب کیا ہوگا؟'' میں نے قاسم کو مخاطب کرتے پوچھا تو وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''میرے پاس تو یہی ہیں۔'' اس نے جیب میں پڑے روپے نکال کر میرے آگے رکھتے جواب دیا۔ میرے پاس ماں کے دیئے تھوڑے بہت روپے تھے اگر میں وہ بھی قاسم کے سپرد کر دیتا تو بھی آپریشن کیلئے کم تھے۔

قاسم مجھے چھوڑ کر یہ کہتا ہسپتال سے چلا گیا کہ میں کوئی بندوبست کرتا ہوں' تم باجی اور اپنی بھابی کا خیال رکھنا۔ حاکم چونکہ وارڈ میں تھا ہم چاروں میں سے کوئی نا کوئی جا بیٹھتا اس کے پاس ورنہ باہر درختوں کے نیچے بستر لگا رکھے تھے ہم نے۔ جو تھوڑی بہت میڈیسن ڈاکٹر لکھ گیا وہ میں نے لا کر حاکم کے بیڈ کے ساتھ پڑی ٹیبل کے اوپر رکھ دی تھی اور خود کنٹین پر چائے پینے چل پڑا۔

ڈاکٹر صاحبان آخری راؤنڈ کر کے جا چکے تھے مگر قاسم کا کوئی اَتا پتا نہیں تھا ہم تینوں پریشان تھے' بھابی اور باجی نے کھانا بھی برائے نام ہی کھایا تھا۔ ہماری نظریں چاروں جانب تھیں کہ آخر کار قاسم ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپر اُٹھائے رکشہ سے نیچے اُترتے نظر آیا تو ہماری جان میں جان آگئی۔ شاپر اس نے ایک طرف رکھتے ہوئے حاکم کی خیریت پوچھی۔ میں نے کہا بس ٹھیک ہی ہے۔

بھابی نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا تو جواباً قاسم نے سر ہلاتے اسے مطمئن کر دیا اور ایک

شاپر کھولنے کے لیے کہا شاید اس میں کھانا تھا۔ خاصا خرچہ کیا ہوگا کھانے پر میں نے روسٹ اور دوسری کئی چیزیں دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگالیا کہ جدھر وہ گیا ہوگا اس کا مسئلہ ضرور حل ہوا تھا۔

جس دن سے ادھر آئے تھے پہلی بار مجھے ڈھنگ کا کھانا نصیب ہوا' ورنہ دال چاول اور نان چنے یا ہسپتال میں ملنے والا کھانا ہی کھاتے آ رہے تھے۔ کھانے کے دوران قاسم نے ہزار ہزار کے بہت سے نوٹ اپنی بیوی کو دیتے سنبھال کر رکھنے کا کہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ حاکم کا پتا کرنے وارڈ میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ آیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

''شادو بھائی میں نے وارڈ والے چوکیدار کا منہ بند کر دیا ہے اب جب چاہو آپ لوگ حاکو کی خیر خیریت لینے چلے جایا کرو۔''

''ہاں بھئی ہر دکھ درد کی دوا یہ نوٹ جو ٹھہرے۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے وہ دونوں میاں بیوی اُٹھ کر کنٹین کی طرف چلے گئے اور میں نیچے پڑے بستر پر دراز ہو گیا۔

قاسم کھلے دل سے خرچ کر رہا تھا۔ مجھے بھی اس نے ایک ہزار کا نوٹ دیا اور کہا یہ تمہارا ہے۔ میں نے انکار کیا تو وہ ناراض ہو گیا۔

''اچھا بابا یہ لو رکھ لیا ہے۔'' میں نے باجی اور بھابی کے سامنے اسے مناتے کہا۔

حاکو کا آپریشن کامیاب ہوا تھا اور تین دن بعد اسے ہسپتال سے چھٹی مل گئی اور ہم واپس گاؤں کے لئے تیاری کرنے لگے۔ حاکو کچھ اور مزاج کا تھا وہ مجبوراً مجھے برداشت کرتا حالانکہ میں دل و جان سے اس کی خدمت میں مصروف رہتا۔ گاؤں پہنچ کر قاسم نے میرا بستر اس جگہ لگوایا جہاں وہ بھینس باندھا کرتے تھے۔ میں اپنوں کا ڈسا غیروں میں اپنا پن تلاش کر رہا تھا۔ یہاں رہتے پورا ایک ہفتہ ہو گیا اس دوران دو بار مجھے حاکم نے آمنے سامنے ہونے پر مخاطب کیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کی ٹرے اُٹھائے قاسم میرے پاس آیا اور اکثر ہم دوپہر کا کھانا اکٹھے کھاتے تھے۔ کھانا رکھتے ہوئے وہ نیچے پڑی چٹائی کو بچھاتے مجھ سے مخاطب ہوا۔

''شادو بھائی آج میں تم سے بہت ضروری بات کرنے والا ہوں۔''

''ہاں بولو۔'' میں نے لقمہ توڑتے اس کی جانب دیکھا۔

''تمہیں میں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' قاسم نے گلاس میں پانی ڈالتے کہا۔

''کہو۔ میں سُن رہا ہوں۔'' میں نے بدستور کھانا کھاتے جواب دیا۔

''میں اس روز لاہور ہسپتال سے چلا گیا تھا اور رات گئے واپس آیا تھا۔ دراصل میں ایک نامی گرامی ڈکیت اور چور ہوں۔'' یکدم میرا لقمہ منہ کے قریب جاتے وہیں رُک گیا اور میں ہونق بنا اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ جیسے مجھے کسی نے پکڑ کر ہوا میں اُچھال دیا ہو اور میری حیرت کی انتہا ہو گئی۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس روز تم کوئی واردات کر کے آئے تھے۔''

''ہاں۔ میں اس رات ایک بڑے گھر میں چوری کی واردات کر کے آیا تھا۔'' قاسم نے دھیمی آواز میں بتایا۔

''یار تمہیں ڈر نہیں لگتا یہ سب کچھ کرنے میں؟''

''شادو ڈر کو اپنے اندر پالنا پڑتا ہے۔ آج رات میں کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں' گھر میں بھینس کی کمی کے باعث پریشانی چل رہی ہے۔''

اچانک میرے اندر سے آواز اُبھر کر میری زبانی پر آئی۔ ''میں بھی چلوں تمہارے ساتھ؟''

قاسم نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا ''کر لو گے کیا؟''

''کوشش تو کر لینی چاہئے نا۔'' میری آواز میں پختگی دیکھ کر قاسم نے مجھے رات تیار رہنے کا کہا اور برتن سمیٹ کر اندر رہائش کی طرف چلا گیا۔ رات ہلکی سرمئی ہونے کو تھی کہ قاسم میری ڈھاری میں آیا اور ایک ریوالور میری طرف بڑھاتے ایک بار پھر اس نے پوچھا کہ ''کر لو گے نا۔''

''ہاں۔'' میرے لہجہ میں ایک عزم تھا۔
پھر ہم دونوں گاؤں سے نکل کر دریا کی کندی کی طرف چل پڑے جو تھوڑے فاصلے پر ہی تھی اور ہم سروس روڈ پر آ گئے ادھر آمدورفت جاری تھی۔ قاسم نے ساتھ لائی نائیلون کی رسی کا ایک سرا خود اور دوسرا میرے ہاتھ میں دیتے کہا کہ۔
''جب میں اس طرف سے تیار رہنے کا اشارہ کروں تو یکدم رسی اُٹھا لینا جو بھی موٹر سائیکل اس کی زد میں آئے گی وہ گر پڑے گی اور فوراً ہمیں اس کے سر پر پہنچ کر اس گرنے والے کو لوٹنا ہوگا۔ اچھی طرح سمجھ گئے نا؟''
میں نے تائید میں سر ہلا دیا اور سروس روڈ کی دوسری طرف درخت کی اوٹ میں ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے قاسم کی آواز کا انتظار تھا۔ اس دوران اِدھر اُدھر سے کئی موٹر سائیکل سوار گزرے مگر قاسم کی طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔ آخر کار ایک دور سے آنے والی موٹر سائیکل کی روشنی دیکھ کر قاسم نے مجھے تیار رہنے کی آواز لگائی تو میں نے یکدم رسی اونچی کر کے تان لی ادھر سے اس نے بھی کھینچ کر اوپر اُٹھا دی۔ موٹر سائیکل پر دو آدمی تھے جو رسی سے ٹکرا کر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور سروس روڈ پر دور تک گھسٹتے چلے گئے۔
ہم دونوں جھپٹ کر ان کے سر پر پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کر دونوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور ہاتھ جوڑتے سب کچھ دینے کو تیار ہو گئے۔ میں نے دونوں کو ریوالور کی زد میں رکھا ہوا تھا اور قاسم ان کی تلاشی میں لگ گیا۔ دونوں کے موبائل اور نقدی چھین کر اس نے موٹر سائیکل کی پلگ وائر کھینچ کر توڑتے دونوں کو سروس روڈ سے نیچے نشیب میں لا کر ساتھ لائی دوسری رسی جیب سے نکالتے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور شور وغیرہ نہ مچانے کا کہتے دوبارہ اوپر سروس روڈ پر آتے موٹر سائیکل اُٹھائی اور ان سے کچھ فاصلے پر پھینکتے وہاں سے دوسری جانب ہو گئے۔ قاسم دیکھنے میں جتنا سُست دکھائی دیتا تھا اس سے کہیں زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا، مجھ سے دو ہاتھ آگے تھا۔

مجھے تو راستے کا کوئی اَتا پتا نہیں تھا جس طرف قاسم بھاگا جا رہا تھا میں اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔ گاؤں واپس پہنچتے کافی وقت ہو گیا۔ پتا نہیں کون سا راستہ اس نے اختیار کیا تھا؟ ڈھاری میں پہنچ کر پہلے دونوں موبائل چیک کیے۔
''کافی مہنگے لگتے ہیں۔'' میں نے اُلٹ پلٹ کر دیکھتے قاسم کو مخاطب کیا۔
''ہاں لگ رہا ہے۔ ایک بات دھیان میں رکھ لو جب کوئی واردات کرو موبائل فوراً آف کر دیا کرنا سمجھ گئے اور اسے فروخت کرنے تک آن نہیں کرنا۔''
''ٹھیک ہے استاد جی۔'' میں نے اپنی پہلی کامیابی میں قاسم کو استاد جی کہتے جواب دیا۔ دونوں کی رقم کل ملا کر چھبیس ہزار روپے بنی۔ قاسم نے ایک موبائل میرے آگے رکھتے لوٹی ہوئی رقم سے دس ہزار روپے مجھے دیتے موبائل آن نہ کرنے کی پھر سے تاکید کی اور اندر جانے کیلئے اُٹھ گیا۔
اب میں ہر دوسرے تیسرے دن کبھی آس پاس یا کہیں دور دراز قاسم کے ساتھ ڈکیتی اور چوری کیلئے جانے لگا تھا۔ کبھی خالی ہاتھ اور کبھی موٹی رقم مل جاتی۔ میرے پاس ساڑھے تین لاکھ اور دوسرا سامان جس میں موبائل، زیورات اور قیمتی کپڑے وغیرہ اکھٹے ہو گئے تھے اور گھر والوں کی یاد دل میں انگڑائیاں لینے لگی تھی۔ دوسرا میں اندر ہی اندر اکیلے میں کوئی چوری یا ڈکیتی کرنے کے بارے میں بھی پلان بنائے بیٹھا تھا۔ قاسم اپنی مرضی سے حصہ دیتا تھا جو اب مجھے محسوس ہونے لگا تھا۔
قاسم سے اجازت لے کر میں اس کا دیا ریوالور اور سامان سنبھالتا گھر جانے کیلئے صبح منہ اندھیرے شہر کی جانب چل پڑا۔ آنے جانے کی سہولت تھی اس لئے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ویگن میں جگہ مل گئی۔ شہر پہنچ کر کچھ کھانے کا سامان لیا اور رکشہ رکوا کر دو اڑھائی ماہ بعد گھر کی طرف چل پڑا۔
دستک دینے پر چھوٹی بہن نے دروازہ کھولا اور مجھ پر نظر پڑتے روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی میں نے سامان رکھتے اسے سنبھالا اور اندر آ گیا۔ سامنے والدہ

صاحبہ چارپائی پر بیٹھی سبزی بنارہی تھیں وہ بھی مجھے دیکھ کر دیوانہ وار اُٹھیں۔ حاجی صاحب کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ شاپ پر گئے ہوئے ہیں۔ بھابی سمیت سب اکٹھے ہوگئے۔ ساتھ لایا اتنا سارا سامان دیکھ کر سارے گھر والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

دوپہر کو کھانا کھانے حاجی صاحب گھر آئے تو انہیں میرے آنے کی خبر ہوئی تو وہ روایتی برہمی کا مظاہرہ کرتے برجستہ بولے۔

''بھوکا مرتا آخر واپس پہنچ گیا نا۔'' میں نے لاکھوں روپے نکال کر حاجی صاحب کو دیتے جواباً کہا۔

''آپ لوگوں کی یاد کھینچ لائی ہے ورنہ۔۔۔'' میں یہ جملہ ادھورا چھوڑتے اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ حاجی صاحب اپنی جگہ چپ سادھ کر رہ گئے۔ شام کو مزمل بھائی آئے تو انہیں ساری بات بتائی گئی وہ بھی خاموش ہوگئے۔ اب گھر کے سارے لوگوں پر میری دھاک بیٹھ گئی تھی اس لئے خصوصاً بھابی جو مجھے کھانا دینے پر بھی ناک منہ بناتی تھی میرے اردگرد تعریفوں کے پل باندھتے نہیں تھکتی تھی۔ اب میں اپنی مرضی سے شاپ پر جاتا۔ مزمل بھائی بھی بڑی خوش دلی سے ملتے اور سارا انتظام میرے سپرد کرکے کئی کئی گھنٹے شاپ سے چلے جاتے۔ اب میں وہ پہلے والا شادو نہیں تھا۔ میرے اندر خوداعتمادی اور زمانہ سازی پوری طرح آباد ہوچکی تھی۔

تھوڑے سے عرصہ میں قاسم نے میرے اندر کی سادگی بدمعاشی اور غنڈہ گردی میں بدل ڈالی تھی۔ نہ میرے دل میں کوئی خوف اور نہ ہی کسی کا ڈر تھا' میں پوری طرح چوکس اور نڈر ہوچکا تھا۔ اس دوران دوبار میرے پاس قاسم آیا اور ساتھ چلنے کا کہا تو میں ٹال گیا کیونکہ میں اکیلے میں کوئی واردات کرنے کی سوچ رہا تھا۔

ایک رات میں نے ریوالور سنبھالا اور مزمل بھائی کا موٹر سائیکل نکال کر چل پڑا۔ میرا رُخ فیصل آباد روڈ کی طرف تھا۔ زرعی آلات بنانے والی ورکشاپ کو میں نے رُک کر جانچا' اندر دفتر میں دو لوگ حسب کتاب میں مصروف تھے۔ اچھی طرح اردگرد کا جائزہ لے کر میں نے موٹر سائیکل باہر روکی اور اسے سائیڈ اسٹینڈ پر اسٹارٹ ہی رکھے چیتے کی سی تیزی سے اندر جھپٹا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہوگئے۔

''جلدی نکال سب کچھ۔'' میں نے غرا کر انہیں وارننگ دی تو جو کاؤنٹر پر بیٹھا تھا اس نے ٹیبل کی دراز کھول کر نوٹوں کی بڑی سی گڈی میری طرف بڑھائی جو میں پکڑ کر مڑنے ہی لگا تھا کہ میرا سر گھوم کر رہ گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ میرے سامنے تین چار ہٹے کٹے لڑکے لوہے کے راڈ پکڑے کھڑے تھے اور میں کراہ رہا تھا۔ شاید دوسرے آدمی نے اندر ورکشاپ میں لگا خطرے کا سائرن یا گھنٹی بجا دی تھی اور وہاں کام کرنے والے گولی کی طرح اُدھر آئے تھے۔ مار کھاتے کھاتے میں بے ہوش ہوگیا جب ہوش آیا تو ہتھکڑی میں جکڑا ہسپتال کے بیڈ پر پولیس کی نگرانی میں پڑا تھا۔

جب زخم ٹھیک ہوئے تو میری تفتیش شروع ہوئی۔ مجھ میں تشدد برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا میں نے ساری وارداتیں جو قاسم کے ساتھ مل کر کی تھیں وہ بیان کردیں۔ پولیس نے قاسم کو بھی گرفتار کرلیا جو ابھی تک پولیس ریمانڈ میں ہے۔ حاجی صاحب اور مزمل نے بھاگ دوڑ کرکے میرا چالان مکمل کروادیا اور میں جیل میں آگیا ہوں۔ ابھی کچی پیشیاں بھگت رہا ہوں۔ شرمندگی اور پریشانی نے بے حال کررکھا ہے۔ گھر والوں کی بے توجگی اور اپنی بے عقلی کے ہاتھوں اس نتیجہ پر پہنچ گیا ہوں۔''

بتاتے ہوئے شہزاد عرف شادو اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے خاموش ہوگیا تھا۔

اتنے میں اسٹیشن میں ہلچل ہوئی اور کسی آنے والی ٹرین نے وہسل دی تھی۔ میری سوچ بھی مجھے حال میں لے آئی اور میں نے اُٹھ کر دوسرے ٹریک پر چلنا شروع کردیا۔ یہ زندگی بھی کیسی ریل کی پٹریوں کی سی ہے۔ کیسی سیدھی چلتی شہزاد کی زندگی کی ٹرین کا کانٹا کھینچا اور...... حادثہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆☆☆

پلیٹ فارم نمبر کی خصوصی کہانی

کیپٹن، ٹرین اور حال . . .



کچھ تحریریں خود مصنف کو ڈھونڈ لیتی ہیں ایک ایسی ہی یادگار تحریر

جو بطورِ خاص پلیٹ فارم نمبر کے لیے لکھی گئی، مصنف کا نام آپ خود بوجھیے

ہم دونوں اس وقت سوئمنگ پول کے تختے پر کھڑے تھے۔ جاوید بہ ضد تھا کہ پہلے جمپ میں لگاؤں گا۔ مجھے بھی ضد سی ہوگئی تھی کہ پہلے جمپ لگانے کا حق میرا ہے کیونکہ پہلے میں اوپر آیا ہوں۔ یوں بات بڑھتی چلی گئی۔

"مت بھولو کہ میرے پاپا جنرل ہیں۔" اس نے



نخوت سے کہا۔ "میں اگر چاہوں تو ایک منٹ میں تمہیں یہاں سے ڈرم آؤٹ کرادوں۔"

"ہاں میں تو جیسے کسی گھسیارے کا بیٹا ہوں۔" میں نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "میرے ڈیڈی بھی بریگیڈیئر ہیں، سمجھے۔"

"کچھ بھی ہو جمپ بہرحال پہلے میں ہی لگاؤں گا۔" اس نے ضدی پن سے کہا۔

"اگر تم میں اتنی جرأت ہوتی تو اتنی باتیں نہ بناتے۔ لگا کے دکھاؤ!" میں نے پھر اُسے چڑایا۔

میں ان دنوں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں زیر تربیت تھا۔ ایک بھائی کو چھوڑ کر میرا پورا خاندان فوج میں تھا، ڈیڈی بریگیڈیئر تھے، دو بھائی میجر تھے، اور ایک کیپٹن! صرف ایک بھائی سعید ایسا تھا جس نے فوجی ملازمت کی بجائے مرچنٹ نیوی کو ترجیح دی تھی۔ وہ آج کل ایک جہاز پر جونیئر آفیسر تھا اور اب ایک سال بعد میں بھی سیکنڈ لیفٹیننٹ بننے والا تھا۔ دو سالہ طویل کورس میں سے ایک سال میں نے اکیڈمی میں گزار دیا تھا۔

میں اکیڈمی کے ذہین ترین کیڈٹوں میں شمار ہوتا تھا اور میرے انسٹرکٹرز کا خیال تھا کہ اس دفعہ 'سورڈ آف آنر' ہماری کمپنی طارق بن زیاد کے حصے میں آئے گی۔ میں نہ صرف فنونِ حرب میں سب سے نمایاں تھا بلکہ میرا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت شاندار تھا اور مجھے بھی پوری امید تھی کہ 'اعزازی تلوار' مجھے ہی ملے گی۔

میرا مدمقابل 'محمد بن قاسم' کمپنی کا جاوید درانی تھا۔ ہم دونوں میں انیس بیس ہی کا فرق تھا۔ وہ بھی ذہین ترین کیڈٹ تھا۔ اس کا نشانہ بھی غضب کا تھا اور اس کی قوتِ فیصلہ بھی بہت مضبوط تھی شاید یہی اس سے میری وجہ مخاصمت ہو۔ ہم دونوں میں نہ جانے کب اور کیسے اس سرد جنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔ پھر ہم دونوں کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ ہم دونوں ایک ہی بیچ کے تھے اور ایک ہی وقت میں اکیڈمی جوائن کی تھی۔ اس لیے جونیئر اور سینئر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پہلے تو ہم ڈھکے چھپے الفاظ میں ایک دوسرے پر طنز کرتے تھے۔ پھر براہِ راست طنزیہ جملوں کے تبادلے شروع ہوگئے اور آج تو نوبت ہاتھاپائی تک



پہنچنے والی تھی۔

وہ جیسے ہی سوئمنگ پول میں جمپ لگانے کے لیے تختے پر اُچھلا اسی لمحے میں بھی اُچھلا اور ہم زوردار چھپاکے کے ساتھ پول میں کود گئے۔ میں نے پول ہی میں اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور زوردار ٹکر اس کی ناک پر دے ماری۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ سا جاری ہو گیا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ پانی کے اندر غوطہ لگا کر اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ بہت اچھا تیراک تھا مگر ناک کی چوٹ کی وجہ سے گھبرا گیا۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے زوردار گھونسا اس کی کمر پر جڑ دیا۔

دوسرے کیڈٹ سوئمنگ پول کے کنارے کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب انہوں نے پانی کو خون سے سرخ ہوتے دیکھا تو بہ یک وقت چھ سات کیڈٹ پانی میں کود پڑے اور بہ مشکل تمام جاوید کو مجھ سے چھڑایا۔

اسی وقت کسی نے ہمارے انسٹرکٹر کیپٹن رحیم کو اطلاع کر دی۔ وہ فوراً وہاں پہنچ گئے۔ جاوید کو فوری طور پر ایم آئی روم لے جایا گیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''ہاں مسٹر احمر، بلک اینگری ینگ مین! کیا پریشانی تھی آپ کو؟'' وہ غصے میں اسی انداز میں بولتے تھے۔

''سر، وہ مجھ سے ضد کر رہا تھا۔ لڑنے پر اسی نے مجھے مجبور کیا تھا۔'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

''یہ پہلا موقع نہیں ہے احمر! اس سے پہلے بھی تم تین کیڈٹس کو زخمی کر چکے ہو، وہ معاملہ میں نے کسی طرح رفع دفع کرا دیا، مگر اب مشکل ہے۔ جاوید جنرل کا بیٹا ہے تمہیں کمانڈنٹ کے سامنے تو پیش ہونا ہی پڑے گا۔ ابھی آدھے گھنٹے میں کمانڈنٹ کے آفس کے باہر رپورٹ کرو۔ ڈیٹس آل۔'' یہ کہہ کر وہ ایم آئی روم کی طرف بڑھ گئے۔

میں اپنے کمرے میں آیا۔ پھرتی سے کپڑے بدلے اور تیار ہو کر وقت سے پہلے ہی اکیڈمی کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر ارشاد کے آفس پہنچ گیا۔ برآمدے میں جاوید بھی تھا۔ اس کی ناک پھول کر کُپّا ہو گئی تھی اور ایک ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ کیپٹن رحیم بھی وہیں موجود تھے۔ وہ ہم دونوں کو باہر چھوڑ کر کمانڈنٹ کے آفس میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کمانڈنٹ صاحب کے دفتر رنر نے ہمیں اندر طلبی کی اطلاع دی۔

اندر داخل ہو کر ہم نے زوردار سلوٹ کیے اور اٹینشن حالت میں کھڑے ہو گئے۔

''سو یو آر کیڈٹ احمر؟'' انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اینڈ یو آر کیڈٹ جاوید!'' انہوں نے جاوید کی طرف اشارہ کیا۔

''یس سر!'' ہم دونوں کے منہ سے بہ یک وقت نکلا۔

''یو بوتھ آر دا ایسٹس فار پاکستان آرمی اینڈ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو مس اینی آف یو، ڈونٹ بی ہیو لائک موٹیسری چلڈرن!'' انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر تم لوگوں کا ریکارڈ اتنا شاندار نہ ہوتا تو میں ابھی اور اسی وقت تم دونوں کو یہاں سے روانہ کر دیتا۔ بٹ آئی ایم گونگ یو این اور اینڈ لاسٹ چانس انڈراسٹینڈ، چلو گلے ملو ایک دوسرے سے اور سوری کرو۔''

مجھ سے پہلو جاوید آگے بڑھا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ ''سوری جاوید!'' میں نے اس سے کہا۔

''اٹ از آل رائٹ، ڈونٹ مینشن!'' اس نے فراخ دلی سے کہا۔

پھر ہم لوگوں کو بریگیڈیئر صاحب نے ایک بار پھر تنبیہہ کی کہ یہ پہلا واقعہ ہے جس میں اتنی رعایت دی گئی ہے تم لوگوں کو، مگر آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

ہم لوگ وہاں سے واپس آئے تو ہمارے ساتھی یہ سمجھے کہ اب ہم اپنا سامان پیک کرنا شروع کریں گے مگر یہ سُن کر سبھی کو حیرت ہوئی کہ بریگیڈیئر صاحب ایسے سخت آدمی نے ہمیں صرف وارننگ دے کر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد واقعی جاوید سے میرا کبھی جھگڑا نہیں ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال بیت گیا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب ہمارے شانوں پر ستارے جگمگانے والے تھے۔ پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقع پر مہمان خصوصی اس وقت کے کمانڈر ان چیف جنرل

موئی تھے۔ تمام کیڈٹس کے والدین کو دعوت نامے جاری کر دیے گئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ اس موقع پر ڈیڈی اور ممی تو ضرور ہی موجود ہوں گے۔ ہم سے اوپشن فارم فِل کروا لیے گئے تھے۔ میں نے انفنٹری کو ترجیح دی تھی۔ مجھے خود پر پورا اعتماد تھا کہ اس بیج کی 'سورڈ آف آنر' میری ہے۔ میرے تینوں بھائیوں میں سے کسی نے بھی یہ اعزاز حاصل نہیں کیا تھا۔ لوگ دبی دبی زبان میں سرگوشیاں کر رہے تھے کہ دیکھتے ہیں 'سورڈ آف آنر' احمر لیتا ہے یا جاوید؟

آخر خدا خدا کر کے وہ وقت بھی آ گیا جس دن ہمیں پاس آؤٹ ہونا تھا۔ اس دن گویا عید تھی۔ ہر کیڈٹ اپنے جوتوں اور کپڑوں کی تیاری میں رات ہی سے لگا ہوا تھا۔ اکیڈمی کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں بہت بڑا پنڈال لگایا گیا تھا۔ فرش پر قالین بچھے تھے اور مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں لگائی جا رہی تھیں۔ ہمیں ہمارا سارا سامان پیک کر کے گاڑیوں میں رکھوانا تھا کیونکہ پاس آؤٹ ہوتے ہی ہمیں اکیڈمی سے نکل جانا تھا۔ پھر ہم میں سے کوئی بھی کیڈٹ اکیڈمی میں نہیں جا سکتا تھا۔

پاسنگ آؤٹ پریڈ کا وقت صبح دس بجے تھا۔ نو بجے کے قریب ڈیڈی، انور، اختر بھائی اور ممی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے دور سے انہیں دیکھا کیوں کہ میں تو پریڈ کے لیے گراؤنڈ میں کھڑا تھا۔

سورڈ آف آنر کا اعلان ہوا تو میرا دل بجھ کر رہ گیا۔ یہاں جاوید مجھ سے بازی لے گیا تھا۔ پھر بھی میں نے اُسے گرم جوشی سے مبارک دی۔

جب میرے کندھے پر جگمگاتا ہوا ایک اسٹار لگ گیا تو ڈیڈی نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''احمر بیٹا! مجھے امید ہے تمہارے شانوں پر اس سے بھی زیادہ اسٹار ہوں گے جتنے تمہارے باپ کے شانوں پر ہیں۔''

''خدا نے چاہا تو انشاء اللہ میرا احمر کمانڈر انچیف بنے گا اس ملک کا۔'' ممی نے خوش ہو کر کہا۔

وہ موقع ہی ایسا تھا۔ سبھی خوش تھے مگر میرا دل ''سورڈ آف آنر'' نہ ملنے سے کچھ بجھ سا گیا تھا۔ ڈیڈی میری اُداسی کا سبب بھانپ گئے۔

''ڈونٹ وری بوائے!'' انہوں نے میرا شانہ تھپتھپا کے کہا۔ ''اور بہت سے موقعے ملیں گے تمہیں۔ اور تم شاید بھول رہے ہو کہ نشانِ حیدر ہمارے ملک کا سب سے بڑا فوجی اعزاز ہے۔ کم آن لیٹ اَس موو!'' انہوں نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ڈیڈی ان دنوں کوہاٹ میں تھے اس لیے ہم لوگ کوہاٹ ہی جا رہے تھے۔ انور بھائی اور اختر کھاریاں میں تھے۔ اس لیے وہ ہم سے الگ ہو کر چلے گئے۔ ارشد بھائی ان دنوں آزاد کشمیر میں تھے اس لیے وہ آ ہی نہ سکے۔ سعید تو ویسے بھی ملک سے باہر تھا۔

راستے میں ڈیڈی مجھ سے کہنے لگے۔ ''دیکھو بیٹا! اب تم پاکستان آرمی کے ذمے دار آفیسر ہو۔ اب لڑکپن کے یہ لڑائی جھگڑے چھوڑ دو۔ میں جانتا ہوں تمہیں بہت جلد غصہ آ جاتا ہے لیکن کامیاب فوجی وہی ہوتا ہے جو جوش سے نہیں ہوش سے کام لے۔ اکیڈمی میں تمہارے جھگڑوں کی خبریں مجھ تک پہنچتی رہیں مگر مجھے اس دوران میں کاکول آنے کا موقع نہیں مل سکا۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ اب بہرحال تمہیں بُردباری اور سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ سکینڈ لیفٹیننٹ کا عہدہ خاصی ذمے داری کا عہدہ ہے۔ اپنا ریکارڈ اچھا رکھو گے تو ممکن ہے ایک دن تم جنرل کے عہدے تک پہنچ جاؤ۔ اپنے سب بھائیوں میں تم سب سے زیادہ ذہین ہو......''

''اور سب سے زیادہ جھگڑالو بھی۔'' پچھلی سیٹ سے ممی نے کہا۔ ''محلے کی لڑائیاں اور قسم کی ہوتی ہیں بیٹا! اور تم تو اس دادا کے پوتے ہو جسے حکومت برطانیہ نے وکٹوریہ کراس دیا تھا۔ آئندہ میں کوئی ایسی بات نہ سنوں۔''

راستے میں ایک جگہ رُک کر ڈیڈی نے گاڑی کا تیل، پانی چیک کرایا۔ ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ کھایا، پیا اور شام سے پہلے پہلے کوہاٹ پہنچ گئے۔ گھر پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ڈیڈی نے اسی شام اس تقریب میں ایک چھوٹی سی دعوت کا انتظام کر دیا تھا۔ اس دعوت میں ایک دو کے علاوہ تقریباً سارے ہی مہمان فوجی اور

ان کی بیگمات تھیں۔

ہمارے پڑوس میں کرنل سعادت کا بنگلہ تھا۔ ان کی بیٹی علیشاء صبح سے ہمارے ہی گھر کام کروا رہی تھی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میری طرف سے اظہارِ محبت چاہتی ہے مگر میں ابھی ان جھمیلوں میں پڑنے کا قائل نہیں تھا۔ علیشاء مجھے اچھی ضرور لگتی تھی مگر میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ اس سے عشق بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی اور ذہین تھی اور گفتگو کا فن جانتی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے ماموں کے پاس کراچی میں رہی تھی اور وہیں کے ایک کانونٹ اسکول سے اس نے میٹرک کیا تھا۔ اس لیے وہ وہاں موجود سب لڑکیوں میں منفرد اور باوقار تھی۔ اسے لباس پہننے کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔ اب بھی وہ کراچی یا لاہور سے کپڑے سلوایا کرتی تھی۔

دوسرے افسروں کی لڑکیاں تھیں تو پڑھی لکھی وہ اپنے تئیں ماڈرن بھی تھیں مگر ٹی وی دیکھ دیکھ کر اپنے لیے ڈراموں کی اداکاراؤں کے ڈیزائن کے کپڑے سلواتی تھیں۔ یا پھر رسالوں میں سے دیکھ کر فیشن کیا کرتی تھیں اور ایسی لڑکیاں نہ جانے کیوں شروع ہی سے مجھے زہر لگتی ہیں جن کی اپنی کوئی پسند کوئی چوائس نہیں ہوتی۔

علیشاء میں یہ بات نہیں تھی اس لیے آہستہ آہستہ وہ میرے نزدیک آتی جا رہی تھی۔

تمام انتظامات سے فارغ ہو کر جب وہ تیار ہو کر آئی تو میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس دن میں نے غور سے اسے دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بے انتہا حسین ہے اور میں اس سے بے اعتنائی برت کر گویا کفرانِ نعمت کر رہا تھا۔ مجھے اپنے پچھلے رویے پر افسوس ہونے لگا جب میں اکثر اسے جھڑک دیتا تھا اور اس کی ستارہ آنکھیں دھندلا جاتی تھیں۔ اس دن اس نے اپنے لمبے اور گھنے بال آزاد چھوڑ رکھے تھے۔ اس سے اس کے حسن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ موقع پاتے ہی سیدھی میری طرف آئی۔ لیفٹیننٹ احمر کی خدمت میں آداب!'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

''سیکنڈ لیفٹیننٹ!'' میں نے کہا۔ ''ابھی میں پورا لیفٹیننٹ نہیں ہوں۔''

''اچھا آدھے لیفٹیننٹ صاحب! کیا آپ اسی حلیے میں مہمانوں کو ریسیو کریں گے۔ یہ پارٹی آپ کی ادھوری لیفٹیننٹی کی خوشی میں تو دی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں کپڑے بدل لیں تو بہتر ہے۔'' اس نے میری وردی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

میں ابھی تک اس وردی میں تھا جو کاکول سے پہن کر چلا تھا۔ اسے اتارنے کو میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے کہنے پر خیال آیا کہ واقعی مجھے کپڑے بدل لینا چاہئیں۔ اسی ارادے سے میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''اپنا وہ براؤن سوٹ پہن لینا جو اکیڈمی جانے کے لیے سلوایا تھا۔'' علیشاء نے اس اعتماد سے کہا کہ جیسے میں وہ سوٹ پہن ہی تو لوں گا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے حیرت ہوئی کہ میرا وہ سوٹ استری کیا ہوا۔ ہینگر میں سامنے ہی ٹنگا تھا۔ اس سے میچ کرتی ہوئی ٹائی بھی موجود تھی اور موزے بھی ایک طرف رکھے تھے۔ میں نہا دھو کر، کپڑے بدل کر باہر آیا تو مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر علیشاء کی آنکھوں میں ستارے سے جگمگا اٹھے مگر مجھے اس پر زیادہ توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ میں مہمانوں میں گھر ان کی مبارک بادیں وصول کرتا رہا۔

رات گئے یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ ایک دم سے سناٹا سا چھا گیا۔ ممی ڈیڈی بھی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ویٹر برتن سمیٹنے میں مصروف تھے۔ میں لان کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا، اپنے مستقبل پر غور کر رہا تھا۔ آئندہ کی پلاننگ کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میرے دادا کو وکٹوریہ کراس ملا تھا تو میں کم از کم ہلالِ جرأت تو حاصل کر لوں۔

اسی وقت نہ جانے کہاں سے علیشاء آ گئی۔ ''احمر! تم ابھی تک سوئے نہیں؟ آج تو تم بہت تھک گئے ہو گے۔ جاؤ اب سو جاؤ۔'' اس کے لہجے میں بہت اپنائیت تھی۔ ''تم کتنے دن یہاں رہو گے؟''

''میں یہاں صرف پندرہ دن کے لیے آیا ہوں علیشاء پھر مجھے کوئٹہ جانا ہے۔ میری پوسٹنگ وہیں ہوئی ہے اور تم اب تک کس خوشی میں جاگ رہی ہو؟''

''تمہاری کامیابی کی خوشی میں!'' اس نے برجستہ جواب دیا۔ ''میں کبھی کبھی سوچتی ہوں احمر تم اپنے سب بھائیوں سے کتنے مختلف ہو۔ ان کے مقابلے میں تمہارا قد لمبا ہے اور رنگت بھی سرخ و سفید ہے۔ سعید حالانکہ تمہارا اجڑواں بھائی ہے مگر وہ بھی تم سے بالکل مختلف تھا۔''

''رات کے اس پہر کیا تم میری شخصیت کا تجزیہ کرنا چاہتی ہو؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں مجھے یونہی ایک خیال آ گیا تھا۔ پھر تمہارا غصہ! خدا کی پناہ! میں نے سنا ہے تمہارے نوکر تمہاری آنکھوں سے خوف کھاتے ہیں۔ حالانکہ...... حالانکہ...... ان آنکھوں میں تو...... ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے۔'' اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

''علیشاء!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اپنے گھر بھر میں اکھڑ مزاج مشہور ہوں۔ اکیڈمی میں کئی دفعہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر میرا جھگڑا ہوا ہے۔ سارے نوکر میرے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور تم......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''مجھے یہی اکھڑ مزاجی تو پسند ہے حالانکہ آج تک کبھی تم نے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔''

''میں اس قسم کی باتیں کرنا جانتا ہی نہیں، بس...... بس...... تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، بہت ہی سوئٹ، بہت ہی پیاری!'' میں روانی میں کہتا چلا گیا۔

''او گاڈ!'' علیشاء نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''ازاٹ ٹرو احمر؟''

''آف کورس علیشاء!'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''مگر تمہیں دو سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

''میں جانتی ہوں احمر! جب تک تم کیپٹن نہ ہو جاؤ شادی نہیں کرو گے۔ تم دو سال کی بات کرتے ہو۔ میں تمام عمر انتظار کروں گی احمر۔''

اسی وقت اس کا بیٹ مین وہاں آ گیا۔ ''علیشاء بی بی، آپ یہاں ہیں اور میں آپ کو گھر میں ڈھونڈ رہا ہوں۔''

پھر وہ مجھ سے رخصت ہو گئی مگر دیر تک لان کے اس گوشے میں اس کے جسم کی خوشبو چکراتی رہی، اس کی سرگوشیاں گونجتی رہیں۔ کہاں میں ایک اکھڑ مزاج اور جھگڑالو فوجی اور کہاں وہ نازک اندام اور خوب رو حسینہ، اس نے معلوم نہیں مجھ میں ایسی کیا بات دیکھی تھی جو مجھ سے متاثر ہو گئی تھی ورنہ مجھ جیسے دراز قد، سرخ و سفید اور لمبے چوڑے جسم کے بے شمار فوجی افسر کوہاٹ میں موجود تھے۔ پھر میں تو ابھی پورا افسر بنا بھی نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں کتنی ہی دیر اس کے خیالوں میں گم بیٹھا رہا۔

پھر مجھے ڈیڈی کے بیٹ مین ہی نے اٹھایا۔ ''سر! تین بج رہے ہیں، اب سو جائیں۔ باہر سردی بھی ہو رہی ہے۔'' اکیڈمی جانے سے پہلے وہ مجھے احمر صاحب کہتا تھا۔ اب اچانک میں سَر ہو گیا تھا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

پھر وہ پندرہ دن پلک جھپکتے گزر گئے۔ کوہاٹ چھوٹا سا شہر ہے۔ وہاں کوئی قابلِ ذکر مقام بھی نہیں ہے۔ وہاں میرے چند ایک دوست تھے ان سے ملاقاتیں کیں مگر زیادہ وقت گھر ہی پر گزرا۔

ان پندرہ دنوں میں علیشاء میرے حواس پر چھا گئی۔ اس کی شخصیت میں نہ جانے کون سی ایسی بات تھی جس نے مجھ جیسے اکھڑ انسان کو بھی محبت کرنا سکھا دیا۔

کوئٹہ جانے سے ایک دن پہلے میں علیشاء کو جیپ میں لے کر درہ آدم خیل کی طرف نکل گیا کیونکہ وہاں لانگ ڈرائیو کی اور تو کوئی جگہ تھی ہی نہیں۔ میں نے سوچا تھا لمبی ڈرائیو کے ساتھ ساتھ وہاں سے کچھ شاپنگ بھی کر لوں گا۔

''کوئٹہ آؤ گی علیشاء؟'' میری نظر ونڈ اسکرین پر تھی اور کان اس کی آواز پر۔

''موقع ملا تو ضرور آؤں گی۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر، کسی بھی طریقے سے میں کوئٹہ آنے کی کوشش کروں گی احمر! مگر تم وعدہ کرو کہ مجھے وہاں سے روز فون کرو گے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"چلو یہ وعدہ کرتا ہوں کہ روز شام آٹھ بجے تمہیں فون کروں گا اور...... یہ رونا دھونا بند کرو۔ میں کوئی "لام" پر نہیں جا رہا ہوں۔"

"نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے احمر کہ میں تمہیں پا نہ سکوں گی۔" اس نے آنسو پونچھ کر جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں کوئٹہ روانہ ہوگیا۔ وہاں کی زندگی بھی تقریباً ویسی ہی تھی۔ جیسی اکیڈمی میں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب میری زبان سے نکلا ہوا ایک بھی لفظ میرے جونیئرز کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ سلوٹوں کے جواب دے دے کر میرے ہاتھ شل ہوگئے تھے۔ مگر یہاں بھی میں ایک تُند خو افسر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ میں علیشاء کو باقاعدگی سے فون کرتا تھا اور یہ اسی کی ذات تھی جس کی وجہ سے ابھی تک یہاں میرا کسی سے جھگڑا نہیں ہوا تھا ورنہ ایسے کئی موقعے آئے مگر میں طرح دے گیا۔

ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ دفتر رنر نے سی او صاحب کی طلبی کی اطلاع دی۔ میں اپنی وردی درست کرتا ہوا ٹوپی اُٹھا کر سی او صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے انہیں سلوٹ کیا تو انہوں نے مجھے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔

"مسٹر احمر! آپ کے لیے آرڈرز آئے ہیں کہ کمانڈو ٹریننگ کے لیے آپ کو یہاں سے ریلیز کر دیا جائے۔ چھ تاریخ کو صبح نو بجے آپ جی ایچ کیو راولپنڈی میں رپورٹ کریں گے۔ ناؤ ہری اَپ اینڈ پیک یور بیگیج۔"

"بٹ...... سر۔"

"نو ایکسکیو مسٹر احمر!" سی او صاحب نے میری بات کاٹ دی۔ "یو آر موونگ ڈے آفٹر ٹومارو۔ دیٹس آل۔" انہوں نے جی ایچ کیو کا لیٹر مجھے تھما دیا۔

میں سی او صاحب کے دفتر سے واپس آیا تو سوچوں میں گم تھا۔ مجھے ہی آخر کیوں منتخب کیا گیا اس ٹریننگ کے لیے؟ اور بھی افسر تھے۔ ہماری بٹالین میں بھی دو افسر ایسے تھے جنہیں ہلالِ جرأت مل چکا تھا۔

میں وہاں سے سیدھا اپنے ٹو آئی سی (سکینڈ ان کمانڈر) میجر ریاض کے پاس پہنچا۔

"آیئے احمر صاحب!" انہوں نے میرے سلوٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"سر! یہ آرڈر!" میں نے وہ لیٹر اُن کے سامنے رکھ دیا۔

"میں پڑھ چکا ہوں یہ لیٹر، آپ کو تو خوش ہونا چاہیے مسٹر احمر! کمانڈوز میں صرف انہی فوجیوں کو لیا جاتا ہے جو ہیڈ کوارٹر کے خیال میں ذہین اور قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ پھر آپ تو ویسے بھی اکیڈمی کے بہترین اسٹوڈنٹ رہے ہیں۔ وہاں آپ کو اپنی کارکردگی دکھانے کے زیادہ مواقع ملیں گے۔"

"اوکے سر!" میں نے لمبا سانس لے کر کہا اور ان کے پاس سے اُٹھ گیا۔

مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ راولپنڈی پہنچ کر کوہاٹ پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں علیشاء کو بتائے بغیر وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ اور اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اسی دن میں نے اس سے فون پر بات کی اور کہا کہ میں کچھ دن کے لیے کوئٹہ سے راولپنڈی جا رہا ہوں۔ اس لیے اگر میرا فون نہ آئے تو پریشان مت ہونا۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ میری غیر موجودگی میں وہ یہاں فون کرتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ میں راولپنڈی میں ہوں۔ راولپنڈی سے کوہاٹ کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ اس لیے وہ سمجھ جاتی کہ میں راولپنڈی سے کوہاٹ ضرور آؤں گا۔

میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا اور راولپنڈی روانہ ہوگیا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ میری ٹریننگ کا ابتدائی مرحلہ بہاولپور کے ریگستانوں میں شروع ہوگا۔ جی ایچ کیو سے مجھے دس دن ریسٹ کرنے کی اجازت بھی مل گئی کیونکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ اس کے بعد مجھے بہت شدید قسم کے حالات سے گزرنا پڑے گا لیکن مجھے اس کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ میں اسے بھی ملٹری اکیڈمی سے ملتی جلتی کوئی ٹریننگ سمجھ رہا تھا۔

میں نے انہی دس دن کو غنیمت جانا اور کوہاٹ جاتے ہوئے راستے بھر علیشاء کے تصور میں کھویا رہا

کہ اس سے یہ کہوں گا، یوں کہوں گا۔ مجھے نرم و نازک اور محبت آمیز گفتگو کا سلیقہ ہی نہیں تھا۔ اسی لیے میں پہلے سے ان الفاظ کا ذخیرہ جمع کر رہا تھا۔ جو علیشاء سے گفتگو کے درمیان میں کام آتے۔

میں اپنے گردوپیش سے بے خبر تھا۔ ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب بس رُکی اور مسافر ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ بس میں اکثریت ان نوجوانوں کی تھی جو آئی ایس ایس بی کا امتحان دینے کوہاٹ جا رہے تھے۔ میں بھی اپنا بیگ اُٹھا کر بس سے اتر آیا۔ باہر تانگے والے زبردستی ان لڑکوں کا سامان کھینچ لے رہے تھے جو امتحان کے لیے آئے تھے۔ ہمارا بنگلہ بھی آئی ایس ایس بی سے چند قدم کے فاصلے ہی پر تھا اس لیے میں بھی انہی لڑکوں کے ساتھ ایک تانگے میں سوار ہو گیا۔ میرا حلیہ بھی اس وقت کچھ اسی قسم کا تھا۔ میں نے نیلی جینز اور وائٹ شرٹ کے ساتھ جوگرز پہن رکھے تھے۔

میں بھی ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ آئی ایس ایس بی سے چند قدم کے فاصلے ہی پر تو مجھے جانا تھا۔ آئی ایس ایس بی کے پاس اُتر کر میں پیدل ہی اپنے بنگلے کی طرف چل دیا۔

بنگلے کے پورچ میں سرخ ہل مین دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اختر بھائی بھی موجود ہیں۔ اختر بھائی ہم سب سے بڑے تھے اور وہ اس وقت میجر تھے۔ میں خوش ہو گیا کہ اختر بھائی سے بھی تفصیلی ملاقات ہو جائے گی۔

میں ابو کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اندر سے آتی ہوئی آوازوں نے میرے قدم روک لیے۔ ''دادا جان کی جائیداد میں آخر احمر کو حصہ کیوں دیا جائے؟'' یہ اختر بھائی کی آواز تھی مگر اس میں آج وہ اپنائیت نہ تھی بلکہ اجنبیت تھی۔

''احمر کو حصہ کیوں نہ دیا جائے، آخر وہ بھی میرا بیٹا ہے، اس کے ولدیت کے خانے میں میرا نام لکھا ہے اور تمہیں یہ باتیں آخر بتائیں کس نے؟ ساجد تو اسے اپنی پوری جائیداد کا وارث بنا چکا ہے۔'' ڈیڈی کی آواز میں وہی شفقت اور محبت گھلی تھی جو میں بچپن سے سنتا آیا تھا۔

''ساجد چچا نے اپنی پوری جائیداد اس کے نام کر دی؟'' اختر بھائی کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''اس کے باوجود آپ اسے اپنی زمینوں میں بھی حصے دار بنا رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ وہ بالکل میرے بیٹوں کی طرح ہے بلکہ تم سب سے زیادہ ذہین ہے۔'' ڈیڈی کے لہجے میں طنز تھا۔

بیٹوں کی طرح ہے! بیٹوں کی طرح ہے کیا مطلب؟ کیا میں ڈیڈی کا بیٹا نہیں ہوں...... نہیں...... یہ غلط ہے۔ میں ڈیڈی ہی کا بیٹا ہوں۔ میرا دل چیخ اٹھا۔ کیا میں ساجد چچا کا بیٹا ہوں؟ نہیں۔ ان کی تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے پھر...... میں خود سے سوال و جواب کرتا رہا۔

''اگر آپ نے اسے بیٹوں کی طرح پالا ہے ڈیڈی تو بہت اچھا کیا ہے، مگر اب ہمارا حق اسے کیوں دے رہے ہیں۔ وہ ہمارا خون نہیں ہے۔''

''میں پوچھتا ہوں تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟'' ڈیڈی کی آواز میں فوجیوں والی روایتی گرج تھی۔ ''میں نے کیا پوچھا ہے اختر؟ میری بات کا جواب دو۔'' ڈیڈی نے پھر چیخ کر کہا۔

''مجھے یہ سب بخشو نے بتایا ہے۔'' اختر بھائی نے جواب دیا۔

''وہ کم بخت مرنے سے پہلے تمہیں سب کچھ بتا گیا، اگر...... اگر وہ زندہ ہوتا تو......'' ڈیڈی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے میں کسی پہاڑ سے نیچے ہی نیچے گرتا جا رہا ہوں۔ اب اندر کیا باتیں ہو رہی تھیں، مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا کہ اتنی بھیانک حقیقت سننے کے بعد شاید میرے کان بہرے ہو گئے یا شاید ان میں ایک جملہ گونج رہا تھا، میں اپنے ڈیڈی کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں بریگیڈیئر عارف کا بیٹا نہیں ہوں...... نہیں ہوں......

میں تقریباً گھسٹتا ہوا باہر کی طرف چل دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ڈیڈی یا ممی کو معلوم ہو کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ کوریڈور سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ

ہمارے ایک ملازم نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ لپک کر آیا اور میرا بیگ تھام لیا۔ موسم حالانکہ خاصا خنک تھا مگر میرے چہرے سے پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے صاحب؟'' ملازم نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں۔'' میں نے بہ مشکل تمام کہا تم...... ذرا سہارا دے کر مجھے اندر لے چلو...... اور تھوڑا سا پانی پلا دو۔''

وہ مجھے سہارا دے کر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ پھر اس نے جلدی سے مجھے پانی پلایا اور ڈیڈی کو اطلاع دینے دوڑ گیا۔

ذرا ہی دیر میں وہاں ممی، ڈیڈی، اختر بھائی اور تمام ملازمین اکٹھے ہو گئے۔ ''کیا ہوا احمر؟ احمر بیٹا...... کیا ہوا تمہیں؟'' ڈیڈی کی آواز میں وہی شفقت تھی جو میں بچپن سے سنتا آیا تھا۔ ''اور تم آئے کب؟ کیا...... وہاں کسی سے جھگڑا ہو گیا؟''

''کچھ نہیں ڈیڈی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی کوہاٹ پہنچ کر مجھے اپنے ایک بہت ہی عزیز دوست کے انتقال کی خبر ملی ہے۔'' یہ کہہ کر میں رونے لگا۔

''ارے بیٹا! روتے نہیں ہیں بیٹے، تم تو بچپن میں بھی کبھی نہیں روئے۔ مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے بیٹا، رونا نہیں چاہیے۔ دعا کرو اس کے لیے۔'' ڈیڈی نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔

میں انہیں کیا بتاتا کہ موت تو خود میری واقع ہوئی ہے۔ مرا تو میں خود ہوں۔ میں تو اپنی موت پر رو رہا ہوں۔ جن لوگوں کے نام بہ یک جنبش قلم شجروں سے خارج کر دیے جائیں وہ روئیں بھی نہ تو اور کیا کریں۔ مجھے رونے والوں سے نفرت تھی مگر آج احساس ہوا کہ آنسو کسی کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنی بڑی بات سننے کے بعد میرا دل بند کیوں نہ ہو گیا؟

''بس کرو بیٹے!'' ممی نے بھی میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''چلو اب آنسو پونچھ لو۔''

''ڈونٹ بی سو ڈس ہارٹ احمر!'' اختر بھائی نے کہا۔

اس کے سوا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس گھر کے تمام رشتے، ناتے اچانک میرے لیے اجنبی ہو گئے تھے در و دیوار تک سے مجھے اجنبیت کی بو آ رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے اتنی دور چلا جاؤں کہ میرے خیال کی اُڑان بھی یہاں تک نہ پہنچ سکے۔

میں لڑکھڑاتے قدموں سے اُٹھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے ذہن میں ایک کانٹا سا چبھا ہوا تھا کہ میں کون ہوں؟

میں بریگیڈیئر عارف کا بیٹا نہیں ہوں تو پھر کون ہوں؟ یہ سوال میں ڈیڈی سے بھی کر سکتا تھا مگر میری ہمت نہ پڑی پھر کون...... کون مجھے بتائے گا حقیقت...... بخشو تو مر گیا اور میں نے تو اُس کا نام بھی تو پہلی مرتبہ سنا تھا۔ گھر میں ایک اور بوڑھا خانساماں گل نواز تھا۔ شاید وہ مجھے کچھ بتا سکے۔ ہم سب اسے چاچا کہتے تھے۔

میں نے بیرے سے اپنے لیے کوفی منگوائی تھی۔ وہ کوفی لے کر آیا تو میں نے اُس سے کہا کہ ذرا گل نواز کو بھیج دو۔

تھوڑی دیر بعد گل نواز میرے کمرے میں آ گیا۔

''تم نے مجھے بلایا ہے احمر بیٹا؟''

وہ میرے بلانے پر اس لیے حیران تھا کہ مدت ہوئی وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا۔ گھر میں اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ ڈیڈی کی اس نے اتنی خدمت کی تھی کہ اب ڈیڈی اسے گھر کے ایک فرد کی طرح رکھتے تھے۔ ڈیڈی اور ممی کے بعد وہ تیسرا آدمی تھا جو ہمیں کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتا تھا۔

''ہاں چاچا، بیٹھو!'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ تو گیا مگر حیرانی سے میری شکل دیکھنے لگا۔ '' چاچا! تمہیں بخشو یاد ہے جو ڈیڈی کا نوکر تھا کسی زمانے میں؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

میرے سوال پر وہ کچھ چونک سا گیا۔ ''ہاں بیٹا مجھے یاد ہے۔ میرے ساتھ تو اس نے برسوں کام کیا ہے مگر...... تمہیں اس کا خیال کیسے آیا؟''

''مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا فوج میں سپاہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُسے اپنی بٹالین میں

بلالوں۔'' میں نے پہلے سے سوچے سمجھے ہوئے پلان کے مطابق کہا۔ ''مگر اس کا پتا نہیں مل رہا ہے۔ تمہیں اس کے گاؤں کا پتا تو معلوم ہوگا۔ اس کی بیوہ تو ابھی زندہ ہوگی؟ وہاں سے اس کا پتا مل سکتا ہے۔''

''ہاں مل تو سکتا ہے۔'' چاچا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میری پرانی ڈائری میں اس کا پتا لکھا ہوا ہے۔ وہ پنڈی کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ٹھہرو میں ڈائری لے کر ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ گیا۔

''تم کہاں بار بار تکلیف کرو گے چاچا، چلو میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔'' یہ کہتا ہوا میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ وہ لان سے گزر کر سرونٹ کوارٹروں کی طرف بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے ایک پرانے لکڑی کے صندوق سے بوسیدہ سی ایک ڈائری نکالی اور پڑھنے کے لیے عینک تلاش کرنے لگا۔

''ارے مجھے دو چاچا، میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک ایک کر کے صفحے پلٹنے شروع کیے۔ آخرکار مجھے وہ پتا مل گیا۔ میں نے چاچا سے ایک پنسل اور کاغذ لے کر وہ پتا نوٹ کرلیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کل ہی میں بخشو کے گاؤں جاؤں گا۔ مجھے آخر معلوم تو ہو میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟

پھر میں ڈیڈی کے کمرے میں چلا گیا کہ انہیں کوئی بات خلافِ معمول محسوس نہ ہو۔ وہ بیڈ پر نیم دراز انگریزی کا کوئی میگزین دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر رسالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور بولے۔

''احمر، تم کوئٹہ سے اتنی جلدی کیسے آ گئے؟''

''ڈیڈی مجھے کمانڈو ٹریننگ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ کل میں نے جی ایچ کیو میں رپورٹ کی ہے اور وہاں سے مجھے دس دن کی چھٹی ملی ہے ریسٹ کرنے کے لیے۔''

ڈیڈی میری بات سُن کر چونک اٹھے۔ ''واقعی احمر! تم خوش قسمت ہو بیٹا، پاکستان آرمی کے بہترین افسر اور جوان اس تربیت کے لیے سلیکٹ کیے جاتے ہیں۔ تم میرے سب بیٹوں میں سب سے زیادہ ہونہار اور بہادر ہو، وش یو بیسٹ آف دا لک بوائے!'' ڈیڈی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں بیرے نے کھانا میز پر لگنے کی اطلاع دی۔

''ہاں بیٹا! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں ڈیڈی۔ سوچ رہا ہوں کل راولپنڈی جا کر اپنے دوست کی ماں سے تعزیت کر آؤں۔''

''آف کورس! تم وہاں ضرور جاؤ۔ چلو کھانا کھالیں۔''

ڈائننگ روم میں امی اور اختر بھائی بھی موجود تھے۔ میں نے زبردستی دو چار نوالے زہر مار کیے اور اپنے کمرے میں آ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ایسے میں نیند کسے آتی ہے۔ جو شخص اچانک اپنی شناخت کھو بیٹھے وہ بھلا سکون سے سو سکتا ہے۔ میں پھر بھی بہت دیر تک آنکھیں بند کیے بیڈ پر پڑا رہا۔ سوچ سوچ کر دماغ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ وال کلاک نے پانچ بجائے تو مجھے احساس ہوا کہ ساری دوپہر میں نے کروٹیں بدلتے گزار دی ہے۔

میں جانتا تھا ابھی علیشاء بھی آنے والی ہوگی۔ اسے اب تک میرے آنے کی اطلاع مل گئی ہوگی اور وہ یہ سوچ کر نہیں آئی ہوگی کہ ہم لوگ سو رہے ہوں گے۔

میں نے غسل کیا اور بیرے سے چائے لانے کو کہا۔

میں چائے بنا ہی رہا تھا کہ علیشاء آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں پیار کے دیپ روشن تھے اور چہرہ بھی گلنار ہو رہا تھا۔

''ہیلو علیشاء!'' میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔ ''لو چائے بناؤ، خود بھی پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔''

اس نے ٹرالی اپنی طرف بڑھائی اور چائے بنانے لگی۔ ''تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم کمانڈو ٹریننگ کے لیے

سلیکٹ ہوئے ہو؟'' اس نے چائے کا کپ میری طرف بڑھایا۔

''ہاں پچیس تاریخ کو مجھے بہاولپور جانا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''کیا بات ہے احمر؟'' اس نے بہ غور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کوئی پریشانی ہے، کوئی فکر ہے تمہارے لہجے میں پہلی سی شگفتگی نہیں ہے۔''

''ہاں علیشاء، میرے ایک بہترین دوست کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں کل اس کی ماں سے تعزیت کرنے پنڈی جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر میرا دل رو پڑا۔

پھر ہم دونوں ہی بہت دیر تک خاموش رہے۔ کمرے میں بوجھل اور ناگوار سا سکون طاری تھا۔ علیشاء ہی نے خاموشی کو توڑا۔

''پنڈی سے واپس کب آؤ گے احمر!''

''مجھے وہاں صرف تعزیت ہی تو کرنا ہے۔ پرسوں تک واپس آجاؤں گا۔''

پھر وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رکی۔ مجھے اُداس دیکھ کر اس کے چہرے کی شادابی بھی ماند پڑ گئی تھی۔ وہ صبح آنے کا وعدہ کرکے چلی گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن میں نے ڈیڈی سے اجازت لے کر ان کی کرولا لے لی۔ ان کے استعمال میں تو فلیگ اسٹاف کار رہتی تھی۔ اس لیے وہ گاڑی یوں بھی فالتو تھی۔ صبح سات بجے کوہاٹ سے نکلا تھا اور بارہ بجے تک بخشو کے گاؤں 'جھنڈیاں' پہنچ گیا۔ وہ چھوٹا سا گاؤں تھا اس لیے مجھے بخشو کا پتا معلوم کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ ایک بوسیدہ سا کچا مکان تھا اور مجھے حیرت تھی کہ بارشوں میں یہ گرنے سے محفوظ کیسے رہ جاتا ہے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ پھر وہ خود بھی دروازے پر آگئی۔ اس کے ہاتھ مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ غالباً وہ گھر کا صحن لیپ رہی تھی۔

''بخشو کا گھر یہی ہے؟'' میں نے پوچھا تو اُس نے مجھے یوں حیرت سے دیکھا جیسے اُسے میرے ذہنی توازن پر شک ہو۔ ''مجھے بخشو سے ملنا نہیں ہے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ بخشو کا گھر یہی ہے؟''

وہ میری شخصیت اور گاڑی سے مرعوب ہوگئی تھی۔

''ہاں جی اُن کا گھر تو یہی ہے مگر انہیں تو فوت ہوئے بہت عرصہ ہوا۔ میں اُن کے بڑے بیٹے کی بیوی ہوں۔''

''اور..... اور تمہاری ساس..... وہ تو ہوگی؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں بے بے موجود ہے۔ مگر اس کا بھی ہونا نہ ہونا برابر ہی ہے جی! اسے آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا اور اونچا بھی سننے لگی ہے..... پَر..... پَر آپ کو کیا کام ہے اُس سے؟'' اس کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

''مجھے اس سے ملواؤ؟'' میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''ممکن ہے وہ میرے کسی کام آجائے اور تمہارا آدمی کہاں ہے؟''

''آپ اندر آجائیں۔ میں گڈو کے ابا کو ابھی بلواتی ہوں۔ وہ غلامو کاکی دکان پر ہوگا۔ وہیں بیٹھا رہتا ہے جی وہ مزدوری کی تلاش میں، مگر یہاں اتنی مزدوری کہاں ملتی ہے۔ وہ تو اگر ہمارے پاس یہ ''مجھیں'' نہ ہوتیں اور عارف صاحب ہمیں پیسے نہ بھیج رہے ہوتے تو ہم بھوکے مرجاتے۔'' اس نے اپنا دُکھڑا رونا شروع کیا ہی تھا کہ ایک سات آٹھ سالہ بچہ آگیا۔ وہ فوراً اس سے بولی۔

''گڈو جا جلدی سے بابا کو بلالا، کہنا شہر سے مہمان آئے ہیں۔'' اس نے مجھے کمرے میں بٹھایا اور اپنی ساس کو بلانے چل دی۔

تھوڑی دیر بعد میں ایک نہایت بوڑھی عورت لاٹھی کے سہارے بہ مشکل وہاں پہنچی اور وہاں پڑی چارپائی پر تقریباً ڈھے گئی۔ اس کی بہو جس انداز میں اسے لے کر آئی تھی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ساس سے خاصی بیزار ہے۔

''کون ہے پتر؟ کون ملنے آیا ہے مجھ سے؟'' اس نے خلاء میں اپنی ویران آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"اماں جی میں آیا ہوں۔" میں نے کہا مگر اس بڑھیا نے کچھ نہیں سنا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ یہ تو بہری ہے اس لیے نسبتاً تیز آواز میں کہا۔ "اماں جی میں ہوں عارف صاحب کا بیٹا!"

بڑھیا کے چہرے پر رونق سی دوڑ گئی۔ "اچھا اختر ہو! مگر ابھی تو پیسے بھیجے تھے صاحب جی نے، صاحب جی بھی کتنے فرشتہ آدمی ہیں۔ کریمے کا ابا مر گیا مگر وہ ابھی تک ہمارا خیال رکھتے ہیں۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ مگر تم کیسے آئے ہو بیٹا؟"

"اماں جی! بخشو کا کا نے مجھے گود میں کھلایا ہے۔ میں پنڈی آیا تو سوچا آپ کی خیر خبر لیتا چلوں۔" پھر میں اصل بات پر آ گیا۔ "اماں جی آپ سے ایک بات معلوم کرنا تھی۔ شاید آپ جانتی ہوں؟" مجھے بہت چیخ چیخ کر بولنا پڑ رہا تھا۔ "آپ بھی تو بخشو کا کا کے ساتھ ہمارے گھر میں رہتی تھیں؟"

"ہاں بیٹا! اس وقت عارف صاحب میجر تھے۔ جب کریمو کے ابا نے وہاں نوکری کی تھی۔" اصل میں صاحب جی کو فوجی نوکری پسند تھی۔ ان کے والد بھی تو فوج میں تھے نا۔ اور انگریز سرکار نے جنگ کے بعد انہیں بہت سے مربعے انعام میں دیے تھے۔ زمین کی دیکھ بھال تو ساجد صاحب کرتے تھے۔ صاحب جی تو ہمیشہ نوکری ہی کرتے رہے۔ اب تو سنا ہے وہ بہت بڑے افسر ہیں۔ تم بھی تو فوج میں ہونا۔ مگر تم لوگوں کو نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے بیٹا۔ اتنی زمینیں اور جائیداد ہے تو نوکری کا فائدہ۔ اور ساجد صاحب کی تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ اسے شاید بہت عرصے بعد بولنے کا موقع ملا تھا ورنہ گھر میں اس سے کون بولتا ہوگا۔ وہ مسلسل بول رہی تھی۔

"صاحب جی نے تو کریمے کو بھی فوج میں بھرتی کرا دیا تھا۔ مگر وہ نامراد وہاں سے بھاگ آیا پھر صاحب جی ہی نے اسے بچایا ورنہ فوجی بھگوڑوں کو تو لمبی سزا ہوتی ہے۔ اپنا نقصان کیا اس نامراد نے اب صاحب جی کے پاس جاتا بھی نہیں۔ بیٹا تم ہی اسے کوئی نوکری دلوا دو!" اس نے نہایت خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

"اماں تم کہتی ہو تو اسے نوکری بھی دلوا دوں گا۔" پھر میں نے اچانک پوچھا۔ "اماں جی تمہیں احمر یاد ہے۔ عارف صاحب کا چھوٹا بیٹا؟" میں نے پھر چیخ کر کہا۔

اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا ہے۔ "ہاں مجھے صاحب جی کے سارے بچے یاد ہیں وہ اور سعید جڑواں تھے۔" اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جیسے وہ جھوٹ بول کر شرمندہ ہو رہی ہو۔

"وہ...... احمر مر گیا اماں جی۔" میں نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔ اس کی گاڑی ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔"

بڑھیا کی بے نور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "مر گیا بے چارہ!...... اس نے تاسف سے کہا۔ اس کی ماں نے تو اس کے پیدا ہوتے ہی اسے مارنا چاہا تھا۔" بڑھیا مسلسل رو رہی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو اماں جی؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"ممی نے اسے مارنا چاہا تھا۔"

"عارف صاحب اور بیگم صاحب نے مجھے قسم دی تھی کہ یہ راز کبھی ظاہر نہ ہو کہ احمر ہمارا بیٹا نہیں ہے۔ مگر اب تو وہ غریب مر ہی گیا ہے۔ اب...... کیا فائدہ اس بات کو چھپانے کا؟"

"مجھے بتاؤ! اماں جی احمر کون تھا؟" میں نے وحشت زدہ آواز میں چیخ کر کہا مگر بڑھیا اور اس کی بہو میری چیخ میں لہجے کی وحشت محسوس نہ کر سکیں۔

"اس زمانے میں صاحب جی ملتان میں تھے اور تمہارے نانا کے گھر لاہور جا رہے تھے۔ بیگم صاحبہ اُن دنوں امید سے تھیں۔ ڈاکٹروں نے اُن سے کہا بھی تھا کہ وہ سفر کے قابل نہیں ہیں مگر تمہارے نانا کی طبیعت بہت خراب تھی اس لیے صاحب جی نے کار میں لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تمہیں اور انور کو صاحب جی نے ملتان میں گل نواز کے پاس چھوڑ دیا۔ اس کی بیوی گھر میں کام کرتی تھی۔ اللہ بخشے۔ بہت نیک عورت تھی۔ مجھے تو وہ بالکل بہنوں کی طرح سمجھتی تھی۔"

"اماں جی پھر کیا ہوا؟" بڑھیا کو پٹڑی سے اُترتے دیکھ کر مجھے ایک دفعہ پھر چیخنا پڑا۔

اسی دوران میں اس کی بہو چائے بنا لائی۔ بے

چاری نہ جانے کہاں سے پتی مانگ کر لائی تھی۔'' لیں صاحب جی! اس نے ایک بھدا سا کپ میری طرف بڑھا دیا۔ پھر بولی۔

''کہاں رہ گیا یہ مرن جوگا گڈو، جہاں جاتا ہے، مر جاتا ہے، کہا تھا باپ کو بلا کر لا، اب وہ کہیں کھیل رہا ہوگا۔''

''آ جائے گا ابھی، میں اس سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا، پھر بڑھیا سے چیخ کر بولا۔'' ہاں اماں جی پھر کیا ہوا؟''

''پھر صاحب جی نے مجھے اور کریمے کے ابا کو ساتھ لیا اور لاہور روانہ ہو گئے۔ گاڑی کریمے کا ابا چلا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ بہت نڈھال ہو رہی تھیں۔ وہ پچھلی سیٹ پر میری گود میں سر رکھے لیٹی تھیں۔ رات کا وقت تھا۔ صاحب جی برابر کریمو کے ابا سے تیز چلنے کو کہہ رہے تھے۔ کئی بار انہوں نے جھلا کر کہا کہ تم ہٹو میں چلاؤں گا۔ مگر کریمو کے ابا نے انہیں گاڑی نہیں چلانے دی۔ پھر چلتے چلتے ایک جھٹکا سا لگا اور گاڑی سڑک پر ڈولنے لگی۔ کریمو کا ابا کہنے لگا کہ صاحب جی گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا ہے۔ میں ابھی ایک منٹ میں بدلتا ہوں۔ بیگم صاحبہ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ انہوں نے تکلیف سے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ سڑک کے ساتھ ہی ریل کی پٹری تھی۔ میرے کانوں میں کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اس وقت میں کانوں سے بوڑھی نہیں تھی بیٹا صاحب جی نے بھی شاید بچے کی آواز سن لی تھی۔ اس وقت تک کریمو کا ابا پہیا بدل چکا تھا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ صاحب جی نے اسے روک دیا اور کہنے لگے کہ بخشو دیکھو تو کس کا بچہ رو رہا ہے۔'' پھر وہ اپنی بہو سے مخاطب ہوئی۔ ''او کریما آیا کہ نہیں؟ تُو دیکھ جا کر وہ گڈو کہاں رہ گیا۔''

وہ بار بار تسلسل توڑ دیتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں حقیقتِ حال جاننے کے لیے کتنا بے چین ہوں۔

''اماں جی!'' میں ایک بار پھر چیخ کر بولا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں دو تین دفعہ اور چیخا تو میرا گلا بیٹھ جائے گا۔'' پھر اس بچے کا کیا ہوا؟''

''کریمو کا ابا اور صاحب جی اُتر کر ریل کی پٹری کی طرف گئے تو پٹری کے اوپر ایک بچہ پڑا رو رہا تھا۔ کتنی سنگ دل ماں تھی جو اپنے جگر کے ٹکڑے کو مرنے کے لیے چھوڑ گئی تھی۔'' بڑھیا نے جھرجھری لے کر کہا۔

''اور وہ بھی اتنے بھیانک انداز میں کہ ریل سے اس کے پرخچے اڑ جائیں۔ ریل کی سیٹی سن کر کریمو کے ابا نے جھپٹ کر اس بچے کو اٹھا لیا۔ وہ بتاتا تھا کہ اگر ہمیں ایک منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو اس بچے کے ٹکڑے بھی نہ ملتے۔ وہ تو ریل کے پہیوں میں چپک کر ہی رہ جاتا۔ وہ ذلیل عورت پتا نہیں کیوں اپنے بچے کو مرنے کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ ورنہ گناہ گار مائیں بھی بچوں کو ایسی جگہ پھینکتی ہیں جہاں سے کوئی انہیں اٹھا لے مگر وہ......''

''بس کرو اماں جی...... بس کرو۔'' میں اتنی زور سے چیخا کہ وہ بڑھیا بھی کانپ کر رہ گئی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اسی وقت مجھے اپنے وجود سے نفرت سی ہو رہی تھی۔ میں اتنی ظالم اور سنگ دل ماں کا بیٹا تھا یا پھر اُسے میرے باپ سے اتنی شدید نفرت تھی کہ وہ میرے باپ کا نشان تک مٹا دینا چاہتی تھی۔ نفرت کی ایک شدید لہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس وقت اگر میری ماں میرے سامنے ہوتی تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کے ٹکڑے کر دیتا۔ مائیں تو بچوں کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیتی ہیں۔ وہ کیسی ماں تھی جس نے مجھے جنم دیا اور پھر مارنے کا ایسا اذیت ناک طریقہ اختیار کیا۔ اسے مارنا ہی تھا تو میرا گلا گھونٹ کر مار دیتی۔ میں اس بھیانک موت کا تصور کر رہا تھا اور میرے جنون میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں عارف صاحب کے دوسرے بچوں سے کیوں مختلف ہوں۔

بڑھیا میرے جذبات سے بے خبر بولتی رہی۔'' پھر صاحب جی اس بچے کو اٹھا لائے اور مجھے دے دیا۔ اسے پیدا ہوئے مشکل سے دو دن ہوئے ہوں گے۔ بیگم صاحب کی حالت اچانک بہت خراب ہو گئی۔ ہم اس وقت خانیوال کے نزدیک تھے، صاحب جی نے وہیں رُکنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہیں خانیوال میں تمہارا بھائی سعید پیدا ہوا۔ صاحب جی نے کریمو کے ابا اور مجھے سختی

سے تاکید کردی تھی کہ کسی یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ بچہ ہم نے کہیں سے اٹھایا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ دونوں بچے جڑواں پیدا ہوئے ہیں۔ آج تک یہ راز میرے سینے میں دفن تھا مگر اب تو وہ بدنصیب مر ہی گیا مگر بیٹا تو اب بھی کسی کو یہ نہ بتانا کہ میں نے تجھے کچھ بتایا ہے۔ بڑھیا نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''بخشو تو تمہارے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا مگر وہ زندہ بھی ہوتا تو کبھی تمہیں نہ بتاتا۔''

''اماں جی! میں کسی کو کیوں بتاؤں گا اور کیا بتاؤں گا؟'' میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آئے گا کیوں نہیں ابھی آ جائے گا کریمو، تم بیٹھو بیٹا۔'' بڑھیا نے میری بات سمجھے بغیر کہا کیوں کہ میں چیخنا بھول گیا تھا۔

اسی وقت گڈو آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کریمو بھی تھا۔

''کون ہے بے بے؟'' اس نے بڑھیا سے چیخ کر پوچھا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ جھٹ اس نے مجھے سلام کیا۔ ''سلام صاب جی!''

''عارف صاحب جی کے بیٹے ہیں یہ۔'' بڑھیا نے اُسے بتایا۔

کریمو چہرے ہی سے کاہل اور کام چور نظر آتا تھا۔ میں نے پھر بھی اسے نوکری دلانے کا وعدہ کر لیا۔ پھر جیب سے کچھ پیسے نکالے اور بڑھیا کے ہاتھ میں تھما دیے۔

''یہ رکھ لو اماں جی!'' یہ کہہ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں چلتا ہوں۔'' میں نے چیخ کر بڑھیا سے کہا پھر کریمو سے بولا۔ ''میں آج کل راولپنڈی میں ہوں۔ تمہاری نوکری کا بندوبست کرتے ہی تمہیں بلوا لوں گا۔''

میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ اپنی حقیقت جاننے کے بعد مجھ سے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ میرے پورے جسم میں سنسناہٹ ہو رہی تھی مگر میں اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا ورنہ دل یہ چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دوں۔ میں آہستہ آہستہ گاڑی کی طرف بڑھا اور بہت ہی سُست رفتاری سے گاڑی سے باہر نکل آیا۔

تمہاری حقیقت کیا ہے لیفٹیننٹ احمر! تم...... جو اپنے نام کے ساتھ بریگیڈیئر عارف کا دُم چھلا لگائے پھرتے تھے اور بہت اکڑتے تھے کہ ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہو، تمہارے دادا نے وکٹوریہ کراس لیا تھا۔ بریگیڈیئر صاحب تو اس راز کو راز ہی رکھنا چاہتے تھے مگر اب یہ راز راز نہیں رہا تھا۔ اختر بھائی بھی جانتے تھے، ممکن ہے انہیں ممی نے بتایا ہو۔ دولت اور جائیداد تو سگے رشتوں کی پہچان بھلا دیتی ہے۔ میں تو پھر ایک غیر اور بے شناخت آدمی تھا۔ ان کا یہ احسان ہی کیا کم تھا کہ انہوں نے مجھے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ کبھی مجھ میں اور دوسرے بچوں میں فرق نہ کیا مگر اب اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ میں ان کی جائیداد میں بھی حصہ بٹاتا۔ ساجد چچا کو شاید معلوم نہیں تھا کہ میں ان کے بھائی کا بیٹا نہیں ہوں۔ ورنہ وہ مجھے بھی اپنا وارث نہ بناتے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں خود ہی ان لوگوں سے اتنی دور چلا جاؤں گا کہ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔

☆☆☆

میں کوہاٹ پہنچا تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ اختر بھائی کی گاڑی موجود تھی اور اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی گئے نہیں ہیں۔ گل نواز نے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا اور اس سے ایک کپ ملک کوفی کے لیے کہا۔ میری ذہنی کیفیت اس وقت عجیب سی ہو رہی تھی میں اب تک بریگیڈیئر صاحب کے ٹکڑوں پر پلتا رہا۔ وہ بھی تو آخر ماں تھی جس نے اپنے بچے کے حصے کی آدھی محبت میری جھولی میں ڈال دی۔ ایک میری ماں تھی بے حس اور پتھر دل! مجھے ماں لفظ سے چڑ سی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے صبح ہی یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کوفی پی کر میں نے اپنا ضروری سامان ایک سوٹ کیس میں بھرا اور سوچا کہ کسی سے ملے بغیر ہی روانہ ہو جاؤں مگر میرے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا۔ جن لوگوں نے مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا میں ان کے

ساتھ یہ سلوک کیسے کر سکتا تھا۔
ناشتے کی میز پر ڈیڈی مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے۔
''تم رات ہی آ گئے تھے احمر؟''
''جی ڈیڈی! میں جی ایچ کیو گیا تھا نا تو مجھے معلوم ہوا کہ مجھے کل ہی بہاولپور پہنچنا ہے۔ وہ لوگ مجھ سے فون پر رابطہ قائم کرنے ہی والے تھے کہ میں خود ہی پہنچ گیا۔'' میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔
ڈیڈی مشکوک انداز میں میری طرف دیکھنے لگے۔ ''احمر بیٹا! اِدھر دیکھو میری طرف۔'' انہوں نے سخت لہجے میں کہا مگر اس لہجے میں بھی ایک شفقت تھی۔
''میں تیس سال سے فوج میں نوکری کر رہا ہوں اور تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔ تم تو بہت ذہین ہو۔ پھر ایسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ فوجی احکام اتنی آسانی سے تو نہیں بدلتے اور وہ بھی فون پر، پروگرام بدلنے کے لیے نئے سرے سے لیٹرز ایشو کیے جاتے ہیں اور ان لیٹرز کے ایشو ہونے کے بعد اتنا وقت ہوتا ہے کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی سب کو لیٹرز مل جائیں۔ تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟''
''ارے ڈیڈی!'' اختر بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ابھی بچہ ہے یہ۔ میرا خیال ہے کہ پنڈی میں اس کے کچھ دوست مل گئے ہوں گے اور انہوں نے گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا لیا ہوگا۔ اب یہ اصل بات آپ کو بتانا نہیں چاہ رہا ہے کہ ممکن ہے آپ اجازت نہ دیں۔ کیوں احمر! ہے نا یہی بات؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔
''جی بھائی جان!'' میں نے شرمندگی سے کہا۔
''جاؤ بیٹا! مگر بہاولپور جانے سے ایک دن پہلے یہاں پہنچ جانا، او کے خدا حافظ۔''
''خدا حافظ، ڈیڈی! ممی، بھائی جان خدا حافظ۔'' میں نے سب کو خدا حافظ کہا اور کمرے سے سوٹ کیس اُٹھا کر رخصت ہو گیا۔
میرا ارادہ تھا کہ پہلے میں ساجد چچا کے پاس سانگھڑ جاؤں گا۔ زمینیں سانگھڑ ہی میں تھیں۔ ساجد چچا ہر دو تین مہینے بعد ہمارے گھر آتے تھے۔ وہ نہ جانے کیوں میرے ساتھ اتنی محبت کرتے تھے۔ حالانکہ اور بھی بچے تھے مگر ساجد چچا خاص طور پر میرے ہی لیے تحفے لے کر آتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان سے کبھی کوئی فرمائش کی ہو اور انہوں نے پوری نہ کی ہو۔ ڈیڈی کہتے بھی تھے کہ ساجد! تمہارے لاڈ پیار نے اسے بالکل بگاڑ دیا ہے۔ وہ بھی ہنس کر جواب دیتے تھے کہ یہ تو میرا بیٹا ہے بھائی جان، بگڑنے دیں۔
میری پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقع پر وہ نہ آ سکے تھے کیونکہ وہ زمین کے ایک مقدمے میں اُلجھے ہوئے تھے مگر انہوں نے فون پر مجھ سے آدھے گھنٹے تک بات کی اور وہ اتنے خوش تھے کہ فون پر گفتگو کرتے ہوئے رونے لگے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے اپنے حصے کی تمام جائیداد مجھے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انہیں شاید علم نہیں تھا کہ میں ان کے بھائی کا بیٹا نہیں ہوں۔ ان کا خون نہیں ہوں ورنہ وہ کبھی مجھے اتنی بڑی جائیداد کا وارث نہ بناتے۔ کیا حق تھا میرا اس جائیداد پر؟ ان لوگوں کا یہ احسان کیا کم تھا کہ انہوں نے ایک لاوارث بچے کو نئی زندگی دی، معاشرے میں ایک باعزت مقام دیا۔
میں انہی خیالات میں گم سوٹ کیس اٹھائے پیدل ہی چل دیا کہ کوئی تانگا نظر آئے گا تو بیٹھ جاؤں گا۔ میں نے علیشاء سے ملنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ مین روڈ پر آتے ہی مجھے ایک تانگا مل گیا اور میں اس میں بیٹھ کر بس اسٹاپ پہنچ گیا۔ راولپنڈی جانے والی بس تیار تھی۔ میں بس کے ذریعے پنڈی پہنچا تو دوپہر کے دو بجے تھے۔ میں پہلے پی آئی اے کے ریزرویشن آفس پہنچا مگر وہاں مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے ٹرین سے جانے کا فیصلہ کیا اور تیز گام کے ذریعے حیدر آباد روانہ ہو گیا۔
☆☆☆
ٹرین کی گڑگڑاہٹ اور اس کے ہارن کی آواز میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ مجھے ٹرین میں بیٹھ کر احساس ہوا کہ مجھے ٹرین اور ریل کی پٹری سے نفرت ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا کہ ٹرین سے وہاں تک سفر کیا تو یا تو میں پاگل ہو جاؤں گا یا حالت جنون میں ٹرین سے کود پڑوں گا۔ مجھے لگ رہا

تھا کہ اسی ٹرین کے آگے کہیں وہ بچہ پڑا ہوگا جسے اس کی سنگ دل ماں اپنا گناہ چھپانے کو پھینک گئی ہوگی۔ جیسے ہی گاڑی اگلے اسٹیشن پر رکی میں اپنا سوٹ کیس اٹھا کر وحشت زدہ انداز میں گاڑی سے اتر گیا۔

وہاں سے میں بسوں اور ٹیکسیوں کے ذریعے سفر کرتا ہوا سانگھڑ پہنچا۔ ساجد چچا مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں وہاں نہیں جاسکا تو کیا ہوا، میرا بیٹا میرے پاس ضرور آئے گا۔''

مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ میں فوراً ہی سانگھڑ کیوں نہ آیا۔ میں پاس آؤٹ ہونے کے بعد یہاں آسکتا تھا مگر میں تو علیشاہ کی زلفوں میں اُلجھ کر سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔

''چچا جان! پاس آؤٹ ہونے کے بعد مجھے موقع ہی نہیں مل سکا آنے کا۔ جیسے ہی موقع ملا میں آپ کے پاس آگیا۔'' میں اپنے جھوٹ پر خود ہی شرمندہ تھا۔

پھر میں نے انہیں بتایا کہ اب میں بہاولپور جاؤں گا اور یہیں سے جاؤں گا تو وہ خوش ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے۔

''جاؤ پہلے نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ شام کو تفصیل سے باتیں کریں گے۔''

وہاں وقت گزرنے کا مجھے احساس بھی نہ ہوا۔ شکار اور گھڑ سواری میں سارا وقت گزر گیا۔ اور میں بہاولپور روانہ ہو گیا۔ اب بھی میں نے ٹرین کی بجائے بس کو ترجیح دی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں ساجد چچا سے گاڑی مانگ لوں گا مگر پھر وہی خیال آڑے آگیا کہ آخر کیوں؟ وہ نہیں جانتے تھے مگر میں تو جانتا تھا کہ میں اُن کا بھتیجا نہیں ہوں۔

کچھ عرصہ بہاولپور میں تربیت کے بعد ہمیں مری بھیجا گیا پھر آزاد کشمیر اور پھر کوئٹہ! اس تربیت کے دوران میں مجھے احساس ہوا کہ ملٹری اکیڈمی کی ٹریننگ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تربیت کے اختتام پر مجھے بہترین کمانڈو قرار دیا گیا اور کیپٹن بنا دیا گیا۔

اس دوران میں ڈیڈی وقتاً فوقتاً مجھ سے فون پر بات کرتے رہے۔ میں تو انہیں نہیں بتاتا تھا کہ میں کہاں ہوں لیکن وہ معلوم کر ہی لیتے تھے اور یہ ان کے لیے کچھ مشکل بھی نہیں تھا۔ وہ بہرحال بریگیڈیئر تھے اور اب تو وہ کوہاٹ کے بجائے جی ایچ کیو راولپنڈی میں تھے۔

☆☆☆

ہماری ٹریننگ ختم ہوئی تو ہمیں ایک بار پھر جی ایچ کیو طلب کرلیا گیا۔ میں نے سوچا کہ گھر کی بجائے آفیسرز میں رہوں مگر ڈیڈی کے احسانات یاد کر کے میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میرے اس عمل سے انہیں صدمہ ہو۔ میں سیدھا گھر ہی پہنچا۔ گھر کا پتا ڈیڈی نے مجھے فون پر بتا دیا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ساجد چچا بھی آئے ہوئے ہیں۔ انہیں وہاں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔

ڈیڈی مجھ سے بہت گرم جوشی سے ملے۔ بہت دیر تک مجھے سینے سے لگائے پیار کرتے رہے۔

''احمر بیٹا! تم نے میرا نام روشن کر دیا۔'' انہوں نے فخر سے کہا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہیں بریگیڈیئر عارف، کیپٹن احمر کے والد جس نے کمانڈو ٹریننگ میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔''

شام کو آفیسرز میس میں تربیت میں کامیاب ہونے والے تمام کمانڈوز کی پارٹی تھی۔ پارٹی میں بہت لطف آیا۔ سینئر افسروں کے رخصت ہونے کے بعد ہم لوگوں نے خوب ہلا گلا کیا۔ وہیں کیپٹن سمیر بھی تھا۔ وہ نہ جانے خود کو کیا سمجھتا تھا۔ مجھ سے تو وہ خاص طور پر جلتا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں ٹریننگ میں پہلی پوزیشن لایا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ کمانڈوز تو سبھی ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوتے ہیں مگر نہ جانے کیوں یہ بات اسے ناگوار گزری تھی۔

وہ جب بھی میری طرف دیکھتا تھا کینہ توز نظروں سے دیکھتا تھا۔ پارٹی میں بھی تمام وقت وہ مجھے گھورتا ہی رہا۔ میں نے اس بات کا نوٹس بھی نہ لیا۔ پھر وہ کیپٹن جمال سے بولا۔

''یار جمال! لوگ باپ اور بھائیوں کے بل بوتے پر کس خوب صورتی سے دوسروں کا حق

مار لیتے ہیں۔''

''ارے چھوڑو! کوئی اور بات کرو۔'' جمال نے بیزاری سے کہا۔

''نہیں یار حیرت تو مجھے اس وقت ہوتی ہے جب وہ اس بات پر اکڑتے ہیں اور واقعی خود کو کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ مثلاً ہمارا دوست کیپٹن احمر! باپ کی سفارش سے پہلی پوزیشن لے کر کتنا خوش ہے جیسے واقعی یہ بہترین کمانڈو ہے۔'' اس نے بہ راہ راست میرا نام لے کر خاصی بلند آواز میں کہا۔

مجھے بھی ایک دم غصہ آ گیا۔ ''مسٹر سمیر!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اپنے الفاظ واپس لو۔''

''ورنہ...... ورنہ کیا ہوگا؟'' اس نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

''ورنہ...... تمہیں اس پر پچھتانا پڑے گا۔ سمجھے!'' میں نے کھڑے ہو کر تیز لہجے میں کہا۔ ''اپنے الفاظ واپس لو ورنہ یہاں سے اسٹریچر پر واپس جاؤ گے۔''

وہاں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سمیر بھی جھٹکے سے اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''شٹ اپ!'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''میں تمہیں بھی جانتا ہوں اور تمہارے باپ کو بھی۔''

اس کے اس جملے نے مجھ پر جنون طاری کر دیا۔ کیا وہ میرے باپ کو جانتا تھا؟ میرے کانوں میں ٹرین کی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی۔ میری نظروں سے ریل کی پٹری اور نوزائیدہ بچے کے علاوہ سارے منظر اوجھل ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی بیچ میں آتا میں نے زبردست ہاتھ اس کے منہ پر مار دیا۔ ایک دو ساتھیوں نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش بھی کی مگر میں نے انہیں بھی زخمی کر دیا۔ ''کوئی بھی اگر بیچ میں آیا تو اپنی ٹوٹ پھوٹ کا خود ذمے دار ہوگا۔''

میں نے کرخت لہجے میں کہا اور بیچ میں کھڑے کیپٹن مسعود کو زبردست کک مار کر درمیان سے ہٹا دیا۔ ''میں اسے بتاؤں گا کہ میں کس کی سفارش پر فرسٹ آیا ہوں۔'' میں نے جنونی انداز میں آگے بڑھ کر سمیر کو گریبان سے پکڑ لیا اور دیوار سے مارنے کی کوشش کی۔

اس دوران میں ہمارے کئی ساتھیوں نے مجھے اور اسے پکڑ لیا۔ ''پاگل ہوئے ہو تم لوگ!'' کیپٹن جمال نے کہا۔ ''بالکل اسکول کے بچوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ چلو احمر!''

مگر مجھ پر تو جنون طاری تھا۔ میں نے درمیان میں آنے والے ہر شخص کو زخمی کر دیا اور سمیر کو گھسیٹ کر لان میں پھینک دیا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں نے کیا کیا۔ میرے کانوں میں ٹرین کی گڑگڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔

مجھے اس وقت ہوش آیا جب ایم پی والوں کی سیٹیاں اور ان کی گاڑیوں کے ہارن مجھے سنائی دیے۔ کیپٹن سمیر بے سدھ پڑا تھا اور میری چاروں طرف ملٹری پولیس کے لوگ کھڑے تھے۔

''ڈونٹ ٹرائی ٹورن کیپٹن احمر! یو آر انڈر اریسٹ۔'' ایم پی کے ایک میجر نے آگے بڑھ کر کہا۔ میں خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ میجر نے میری تلاشی لی اور مجھے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا جیپ میں جا بیٹھا۔ اس دوران سمیر کو ایمبولینس میں سی ایم ایچ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

ایم پی والوں نے مجھے گھر ہی میں ہاؤس اریسٹ کر دیا۔ بنگلے کے گیٹ پر دو سپاہیوں کی ڈیوٹی لگانے کے بعد انہوں نے ایک ڈیوٹی افسر میرے کمرے کے دروازے پر متعین کیا اور ڈیڈی کو سلوٹ کر کے چلے گئے۔

اس کے جانے کے بعد ڈیڈی کمرے میں آ گئے۔

''کیا ہوا احمر بیٹا! تم نے اسے کیوں مارا؟ وہ بچ تو جائے گا۔'' انہوں نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

''میں نہیں جانتا کہ وہ بچے گا یا نہیں۔ اسے مارتے وقت مجھے ہوش نہیں تھا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ میں برداشت نہ کر سکا۔'' میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا تم آرام کرو، ڈونٹ وری اباؤٹ دیٹ۔'' وہ مجھے تسلی دے کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میرے کمرے میں رکھے

ہوئے ٹیلیفون انسٹرومنٹ کی گھنٹی وقفے وقفے سے بجنے لگی۔ غالباً دوسرے سیٹ پر ڈیڈی کہیں فون کر رہے تھے۔ میں نے بھی ریسور اٹھالیا۔ رابطہ ملتے ہی دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''سی ایم ایچ راولپنڈی۔''

''بریگیڈیئر عارف اسپیکنگ! پلیز پٹ می آن ٹو ڈاکٹر بلال۔'' ڈیڈی نے باوقار لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے ہولڈ کرنے کو کہا گیا پھر فون پر ڈاکٹر بلال کی آواز آئی۔ ''یس سر ڈاکٹر بلال اسپیکنگ۔''

''ڈاکٹر بلال صاحب! کیپٹن سمیر کی اب حالت کیسی ہے؟'' ڈیڈی کی آواز میں فکرمندی تھی۔

''بہت خراب ہے سر!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اگر اسے اگلے دو گھنٹوں میں ہوش نہ آیا تو اس کا بچنا مشکل ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''تھینک یو ڈاکٹر! میں ایک گھنٹے بعد دوبارہ فون کروں گا۔'' ڈیڈی نے مایوس لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اگر سمیر مر گیا تو...... تو میرا کورٹ مارشل ہوگا...... اور پھر فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے مجھے گولی مار دی جائے گی۔ ٹھیک ہے کیپٹن احمر، بہت دن جی لیے۔ تم تو پیدا ہوتے ہی موت کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ اس وقت تمہاری زندگی کے کچھ دن باقی تھے سو بچ گئے۔ اب فائرنگ اسکواڈ سے تمہیں کون بچائے گا۔ میں دل ہی دل میں خود سے ہم کلام تھا اور کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

فون کی گھنٹی دوبارہ بجنا شروع ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ ایک گھنٹہ گزر چکا ہے اور ڈیڈی دوبارہ سی ایم ایچ فون کر رہے ہیں۔ میں نے بھی ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے ڈاکٹر بلال نے کہا کہ کیپٹن سمیر ابھی تک بے ہوش ہیں، ہم ان کی جان بچانے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں مگر ان کے زندہ بچنے کے امکانات صرف دس پرسنٹ ہیں۔

ڈیڈی نے بغیر کچھ کہے فون رکھ دیا۔ مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اب موت ہی میرا مقدر ہے۔ میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں یوں آسانی کے ساتھ مرنے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا کروں؟ میں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچا۔ مجھے فرار ہو جانا چاہیے۔ مگر کیسے؟ کمرے کے باہر ایک آفیسر ڈیوٹی پر ہے۔ دو سپاہی گیٹ پر ہیں۔ باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ اور...... اور میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے پھر...... پھر میں کیا کروں؟

میں نے گھڑی دیکھی، اسی سوچ بچار میں آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور بہت آہستگی سے کمرے کا ذرا سا دروازہ کھولا۔ ڈیوٹی آفیسر دروازے کے عین سامنے کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کا سروس ریوالور اس کی گود میں رکھا تھا اور وہ کوئی میگزین پڑھ رہا تھا۔ وہ دروازے سے اتنے فاصلے پر تھا کہ اگر میں نکل کر فرار ہونا چاہوں تو وہ مجھے شوٹ کر سکے۔ شاید یہی سوچ کر اس نے ریوالور گود میں رکھ لیا تھا۔ مجھے دروازے پر دیکھتے ہی وہ لمحوں میں ریوالور سنبھال سکتا تھا۔

میں نے فون کا ریسور اٹھا کر ٹپ کیا۔ کافی دیر کے بعد ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو کون ہے؟''

''میں احمر ہوں۔ مجھے ایک کپ کوفی لا دو مگر ذرا جلدی!''

''اس وقت؟'' اس کی آواز میں حیرت تھی۔

''بکواس مت کرو اور کوفی لے کر آؤ، زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کے اندر سمجھے!'' میں نے کرخت لہجے میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

پھر میں نے بہت پھرتی سے اپنی تمام نقد رقم، پاسپورٹ اور دیگر ضروری چیزیں کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسیں۔ میں ابھی تک وہی سوٹ پہنے تھا جو پارٹی میں پہن کر گیا تھا۔ میں نے تو جوتے تک نہیں اتارے تھے۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد کمرے کے دروازے پر باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ ملازم کوفی لے کر آیا تھا اور ڈیوٹی آفیسر اسے اندر نہیں جانے دے رہا تھا۔ ملازم نے کہا کہ میں بس کوفی دروازے ہی سے صاحب کو دے کر چلا جاؤں گا یا آپ خود ہی کافی انہیں

دے دیں، ورنہ صبح میری خیر نہیں ہوگی۔ احمر صاحب میری کھال اُدھیڑ دیں گے۔ اس پر ڈیوٹی افسر نے کہا اچھا ٹھیک ہے تم کمرے کے اندر مت جانا باہر ہی سے کوفی دے دینا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے اندر کی لائٹ جلائے بغیر دروازہ کھول دیا۔ میں نے دیکھا ڈیوٹی آفیسر کے ریوالور کا رُخ میری ہی طرف تھا۔ میں نے کوفی کی پیالی ہاتھ میں پکڑی اور اچانک وہ پیالی آفیسر کے منہ پر پھینک دی۔ وہ اس افتاد سے بوکھلا گیا۔ گرم گرم کوفی سے اس کا چہرہ جل گیا تھا۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں نے ایک جسٹ لگائی اور ڈیوٹی افسر کو ساتھ لیے برآمدے سے باہر جا گرا۔ پھر میں نے ایک ہاتھ اس کی کنپٹی پر مارا تو وہ بے ہوش ہوگیا۔ میں نے اسی کا ریوالور اٹھایا اور گیٹ کے مخالف سمت دوڑ لگا دی۔

باؤنڈری وال خاصی اونچی تھی مگر مجھے اس سے بھی زیادہ اونچی دیواروں کو پھلانگنے کی مشق تھی۔ میں نے پنجوں پر اچھل کر زقند لگائی اور باؤنڈری وال پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کودنے سے پہلے میں نے اندر کا جائزہ لیا۔ ڈیوٹی افسر اسی حالت میں پڑا تھا اور ملازم ہکا بکا کھڑا ابھی تک اسے دیکھ رہا تھا مگر بھاگنے سے پہلے میں نے اسے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ تم کسی کو کچھ مت بتانا۔ میں نے دیوار کی دوسری طرف چھلانگ لگائی اور اندھیرے میں بھاگتا چلا گیا۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ ڈیوٹی افسر کے ہوش میں آتے ہی راولپنڈی کی تمام ملٹری پولیس حرکت میں آجاتی۔ پنڈی یوں بھی چھوٹا شہر ہے اور دارالحکومت ہونے کی وجہ سے وہاں کی پولیس کی نفری بھی زیادہ ہے اور وہ چاق و چوبند بھی ہے۔ ممکن ہے ایم پی والے پولیس سے بھی مدد لے لیں۔ اس صورت میں میرے بچنے کے امکانات اور بھی کم ہوجاتے۔ سب سے بڑا مسئلہ سواری کا حصول تھا۔ بہت سوچنے کے بعد مجھے نعیم کا خیال آیا۔ وہ میرا بہترین دوست تھا۔ پنڈی میں اس کا گارمنٹ کا کاروبار تھا۔ وہ مجھے اس صورتِ حال میں اگر پناہ نہ بھی دیتا تو کم از کم اپنی گاڑی تو دے ہی سکتا تھا۔

اس کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں تیز رفتار سے چلتا ہوا اُس کے گھر پہنچ گیا۔ کال بیل کے جواب میں اس کے چوکیدار نے اندر ہی سے ہانک لگائی کون ہے؟''

''میں نعیم کا دوست ہوں اور لاہور سے آیا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

اس نے ذیلی کھڑکی کھول کر جھانکا اور میری شخصیت سے مرعوب ہوکر مجھے اندر بلا لیا اور کہنے لگا کہ آپ ذرا انتظار کریں، میں صاحب کو اٹھاتا ہوں۔

تھوڑی دیر میں نعیم آنکھیں ملتا ہوا وہاں آ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اسے علم تھا کہ راولپنڈی میں میرا اپنا گھر ہے اور یہ کہ میں لاہور سے بھی نہیں آیا ہوں۔

''کیا بات ہے احمر! خیریت تو ہے؟ آؤ اندر آجاؤ۔''

''خیریت کہاں ہے یار۔'' میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک مصیبت میں گھر گیا ہوں نعیم!'' میں نے کہا۔

اس دوران میں ہم اس کے بیڈ روم میں پہنچ چکے تھے۔ پھر میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بتادی۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اگر چاہو تو یہیں رہو ورنہ میرے پاس دو گاڑیاں ہیں، ان میں سے جو بھی پسند ہو لے جاؤ۔''

میں نے کہا کہ میں یہاں رہا تو تم بھی مصیبت میں گرفتار ہوسکتے ہو۔ تم مجھے گاڑی دے دو، کوشش کروں گا کہ جلد از جلد تمہاری گاڑی واپس کردوں۔''

اس پر اُس نے برا مانتے ہوئے کہا کہ گاڑی سے زیادہ اہم تمہاری جان ہے۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے فوراً کرو۔

اس کے پاس ایک کار تھی اور ایک سوزوکی جیپ تھی۔ میں نے جیپ کو ترجیح دی۔ جب میں جیپ میں سوار ہوا تو اس نے بھاری سا لفافہ میری طرف بڑھا دیا اور کہنے لگا کہ یہ کچھ کھانے کی چیزیں ہیں ممکن ہے تمہیں راستے میں کہیں بھوک لگے۔ اچھا جاؤ خدا حافظ۔''

میں نے ایک پیٹرول پمپ پر جیپ روک کر اس کا ٹینک فل کرایا۔ اسی دوران مجھے خیال آیا کہ دیکھوں تو نعیم نے کھانے کی کیا چیز دی ہے؟ میں نے لفافے میں جھانک کر دیکھا تو نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ اس بے چارے نے حتیٰ الامکان دوستی نبھانے کی کوشش کی تھی۔

میں برق رفتاری سے لاہور کی طرف بڑھا۔ راستے میں مجھے کسی نے بھی نہیں روکا۔ دن کا اجالا پھیلتے ہی مجھے جو پہلا قصبہ نظر آیا وہاں سے ایک دھوتی اور لمبا لمبا کرتا خرید لیا۔ وہ کرتا کسی اور کا تھا مگر جب میں نے درزی کو زیادہ پیسوں کا لالچ دیا تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں یہی کپڑا خرید کر گاہک کو دوسرا کرتا سی دوں گا۔ میں نے کپڑے کا ایک بڑا تھیلا اور ایک بڑا سا ریشمی رومال اور کھسا بھی خرید لیا۔ وہاں سے نکل کر ایک ویران جگہ پر میں نے ضروری کاغذات اور پیسے نکال کر تھیلے میں بھرے، سوٹ اُتار کر ایک جوہڑ میں پھینکا اور دھوتی اور کرتا پہن کر کسی حد تک اپنا حلیہ بدل لیا۔

کپڑے بدل کر میں پھر تیز رفتاری سے روانہ ہوگیا۔ اگلے قصبے میں رُک کر میں نے ایک نائی کی دکان سے اپنا سر منڈوایا اور مونچھیں بھی صاف کرادیں۔ اس کی حیرت دُور کرنے کو میں نے کہا کہ یار بالوں میں جوئیں ہوگئی ہیں۔ اس لیے صاف کروا رہا ہوں۔“

وہاں سے تھوڑا بہت کھانا کھا کر میں پھر آگے بڑھ گیا۔ اسی طرح برق رفتاری سے سفر کرتا ہوا میں رات کو دس بجے کے قریب لاہور پہنچ گیا۔

لاہور پہنچ کر میں نے نعیم کو فون کیا کہ تمہاری جیپ فلاں ہوٹل کے سامنے کھڑی ہے۔ وہاں سے منگوالینا۔ اس کی چابی میں نے سیٹ کے نیچے چھپا دی ہے۔ پھر میں ایک لگژری کوچ میں سوار ہوگیا جو ملتان جارہی تھی۔

☆☆☆

ملتان سے سکھر پہنچا، پھر حیدر آباد اور پھر بہ خیریت کراچی پہنچ گیا۔ کراچی پہنچ کر میرا ارادہ تھا کہ کسی ریکروٹنگ ایجنٹ کے ذریعے ملک سے باہر نکل جاؤں گا۔ میں نے کراچی کے ایک گھٹیا سے ہوٹل میں کمرا بک کرایا اور ریکروٹنگ ایجنسیوں کے چکر لگانا شروع کردیے مگر مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ میرے ظاہری حلیے سے وہ لوگ مجھے بالکل بے وقوف سمجھتے ہیں اور سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔

میں نے سوچا حلیہ بدل کر اونچے ہوٹلوں میں جاؤں۔ شاید وہاں کوئی کام کا آدمی مل جائے۔ اس دوران میں میری شیو اتنی بڑھ گئی تھی کہ داڑھی لگنے لگی تھی۔ میں نے دو تین بہترین سوٹ خریدے داڑھی کو فرنچ کٹ انداز میں ترشوایا اور ایک اسموکنگ پائپ بھی خرید لیا۔ حالانکہ میں سگریٹ پینے کا عادی نہیں تھا۔

حلیہ بدلنے سے پہلے میں نے وہ گھٹیا ہوٹل چھوڑ دیا تھا اور اب ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کمرا لے لیا تھا۔ فرنچ کٹ داڑھی اور پائپ نے تو میری شخصیت ہی بدل دی۔ شام کو نہا دھو کر میں اسی ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جا بیٹھا۔ ایک عرصے کے بعد مجھے اچھا کھانا نصیب ہوا تھا۔ اس لیے خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد کوفی پی اور پائپ سلگا کر بیٹھ گیا۔ میں پائپ کے کش لگانے کے ساتھ ساتھ ہال کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ مجھ سے دو میزیں چھوڑ کر ایک اور جوڑا راز و نیاز میں مصروف تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت تھی۔ ان کی یا تو نئی نئی شادی ہوئی تھی یا پھر وہ شادی کرنے والے تھے۔ ان کے والہانہ پن سے یہی ظاہر ہورہا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے بے اختیار علیشاء یاد آگئی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی؟ مجھے یاد بھی کرتی ہوگی یا نہیں؟

اچانک ایک غنڈہ ٹائپ نوجوان اس لڑکی کی کرسی سے ٹکراتا ہوا گزر گیا۔ جھٹکے سے اس لڑکی کے کپ کی چائے چھلک کر اس کے کپڑوں پر گری۔ وہ نوجوان جان بوجھ کر اس کی کرسی سے ٹکرایا تھا۔

لڑکی کا ساتھی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ”اے مسٹر! اندھے ہوگیا؟“

”کیا کہا؟“ وہ غنڈہ پلٹ کر بولا۔ ”جانتا ہے میں کون ہوں؟ اس ہوٹل میں پہلی دفعہ آیا ہے کیا؟“

''تو کوئی بھی ہے مگر تجھے شرفاء میں اٹھنے، بیٹھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔'' لڑکی کے ساتھی نے بپھر کر کہا۔

جواب میں غنڈے نے اتنے زور سے اس کے تھپڑ مارا کہ پورے ہال میں اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔ لڑکی کا ساتھی بھی اس سے بھڑ گیا مگر دو ہی مکوں میں وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔ غنڈہ اس کے مقابلے میں کہیں طاقتور اور تنومند تھا۔ اس کے جسم سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نہ صرف طاقت ور ہے بلکہ لڑائی بھڑائی اس کا پیشہ ہے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس لڑکی کے چیخنے پیٹنے کے باوجود نہ تو کوئی آدمی ہی اس کی مدد کو آیا اور نہ ہی ہوٹل کی انتظامیہ کا کوئی آدمی وہاں پہنچا۔

لڑکی کا ساتھی بہ مشکل تمام اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تو اس غنڈے نے زوردار ہاتھ مار کر اسے پھر گرا دیا۔ لڑکی نے اب بلند آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔ مجھے لوگوں کی بے حسی پر حیرت ہو رہی تھی۔

میں اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہ رہا تھا کہ نہ جانے بعد میں حالات کیا رُخ اختیار کریں مگر مجھ سے لڑکی کا رونا برداشت نہ ہوا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور غنڈے کی گردن پکڑ کر اپنی طرف گھما لیا۔ وہ قد میں میرے برابر ہی تھا مگر جسامت میں مجھ سے بھاری تھا۔

میری اس حرکت سے اس کی آنکھوں میں حیرت دکھائی دی۔

''کیا تو بھی مجھے نہیں جانتا؟'' اس نے حقارت سے پوچھا۔

وہاں موجود لوگ دم سادھے بیٹھے تھے، کچھ کی آنکھوں میں میرے لیے رحم کے جذبات تھے۔ وہ میرے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا اور بہ غور میرا جائزہ لینے لگا۔ میں نے اچانک ہاتھ گھما دیا مگر وہ پھرتی سے جھکائی دے کر بچ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اناڑی نہیں ہے بلکہ لڑائی کے فن سے خوب واقف ہے۔ اب میں بھی محتاط ہو گیا۔ جوابی طور پر اس نے کراٹے کا ایک خوف ناک داؤ آزمایا۔ میں نے اس سے بچ کر پھرتی سے گھوم کر ایک لات اُس کے سینے پر جڑ دی۔ لات اتنی بھرپور تھی کہ اذیت سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ لوگوں نے خوف زدہ ہو کر آس پاس کی میزیں خالی کر دی تھیں۔ وہ خاصا جان دار آدمی تھا۔ ورنہ میری وہ لات اچھے اچھوں کو زمین چٹا دیتی تھی۔

اس نے بوکھلاہٹ میں مجھے پنچ مارنا چاہا۔ یہی اس کی غلطی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور ایک زوردار جھٹکے سے اس کی کہنی کا جوڑ نکال دیا۔ وہ درد کی شدت سے دُہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی دوسری کلائی بھی توڑ دی۔ وہ بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔ پھر میں نے اس نے اُس کے گھٹنے پر بھرپور لات ماری اور اس کی ٹانگ بھی ناکام کر دی۔ اس کے لیے میں نے اتنا ہی کافی سمجھا۔ اب وہ کم از کم چھ مہینے تک ہلنے جلنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔

لوگ اب بھی خوف زدہ انداز میں مجھے دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں میرے لیے تحسین کے جذبات تھے۔ لڑکی کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

''جاؤ بی بی گھر جاؤ' اب یہ تم سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے لڑکی اور اس کے ساتھی سے کہا۔

''ٹھہر جاؤ طرم خان!'' ہال میں ایک بھاری آواز گونجی۔ لوگ سہم کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ چار بدمعاش قسم کے آدمی ہاتھوں میں ریوالور لیے میری طرف بڑھ رہے تھے۔

''تم سمجھتے ہو کہ شاہ میر کو زخمی کر کے تم اپنے پیروں پر چل کر جاؤ گے یہاں سے؟'' ان میں سے ایک آدمی بولا۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی اور جسم سے وہ بھی خوب پلا ہوا بدمعاش دکھائی دے رہا تھا۔

''ان کھلونوں کو جیب میں رکھ لو۔'' میں تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ ''میں بھی اسی کی کمائی کھاتا ہوں۔''

''ٹھہر جاؤ نادر!'' ایک گونج دار آواز آئی۔

میں نے گھوم کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک خوش پوش آدمی تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار تھا۔ دبدبہ تھا۔ اس نے بہترین تراش کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور منہ میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ ''مجھے تمہاری جرأت اور بہادری نے متاثر کیا ہے نوجوان۔''

اس نے انگریزی میں کہا اور پھر بولا۔

''تم ترک ہو یا ایرانی؟''

''نہ میں ترک ہوں اور نہ ایرانی۔'' میں نے بھی انگریزی ہی میں جواب دیا۔ ''میں پاکستانی ہوں اور نوکری کی تلاش میں سرگودھا سے کراچی آیا ہوں۔''

''آؤ میرے ساتھ!'' اس نے زینوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ پھر مڑ کر اپنے آدمیوں سے بولا۔

''ان لوگوں کو اسپتال پہنچا دو۔''

میں اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ غالباً ہوٹل کا مالک تھا یا منیجر' کیونکہ وہ کمرا دفتر تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود بھی بڑی سی میز کے پیچھے رکھی ہوئی ریوالونگ چیئر پر جا بیٹھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا۔''

''میرا نام شہباز ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم وہاں کیا کام کرتے تھے؟'' اس نے غور سے میرا جائزہ لے کر کہا۔

''یہی کام کرتا تھا مگر وہاں آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کراچی میں چانس زیادہ ہے اس لیے یہاں چلا آیا۔''

''تم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''تمہارا نشانہ کیا ہے؟''

''اندھیرے میں آواز پر فائر کر سکتا ہوں اور میرا نشانہ مشکل ہی سے خطا ہوتا ہے۔''

''میں صاف بات کرنا پسند کرتا ہوں۔ دنیا جانتی ہے کہ میں اسمگلر ہوں اور سیٹھ زرداد کے نام سے مشہور ہوں۔ پولیس اور کسٹم کے بڑے بڑے اہل کار میری مٹھی میں ہیں۔ تمہیں میرے ساتھ کام کرنا پسند ہو تو میری طرف سے تم آج ہی سے میرے ملازم ہو۔ تم خوب اچھی طرح غور کر لو، سوچ لو! کیونکہ ایک بار میرے ساتھ شامل ہونے کے بعد تم مجھ سے علیحدہ نہیں ہو سکو گے۔''

''کام کیا کرنا ہو گا مجھے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر۔ کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کے لیے ہاتھا پائی اور بس عیش۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے یہ سوچ کر کہا کہ اس طرح میں پاکستان سے باہر کہیں بھی جا کر غائب ہو سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے آج سے تم میرے ملازم ہو اور تین مہینے کی آزمائشی مدت پر ہو۔ کام اچھا کیا تو تمہیں مستقل کر دیا جائے گا۔ اپنی گفتگو اور شخصیت سے تم معزز لگتے ہو اور ایسے لوگ ہمارے لیے بہت کام کے ہوتے ہیں۔ کسی اوسط درجے کی آبادی میں کوئی مکان لے لو کرائے پر۔ بس اب جاؤ۔ کل رات نو بجے ملاقات ہو گی۔'' میں جانے لگا تو بولا۔ ''ٹھہرو دوسروں سے تمہارا تعارف تو کرا دوں؟''

پھر اس نے میز کے نیچے لگے ہوئے کسی بٹن کو دبایا۔ فوراً ہی ایک آدمی اندر آ گیا۔

''سب لوگوں کو اندر بھیج دو۔'' اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ تھوڑی دیر میں وہاں تقریباً پندرہ بدمعاش قسم کے آدمی جمع ہو گئے۔

''یہ ہمارا نیا ساتھی شہباز ہے۔ اب یہ بھی ہمارے ساتھ ہی کام کرے گا۔''

ان سب نے باری باری مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ساتھ ساتھ سیٹھ زرداد ان سے میرا تعارف بھی کراتا جا رہا تھا۔ میں ان سب سے مل کر واپس آ گیا۔ ان سب میں مجھے ایک ہی نوجوان عادل نے متاثر کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور اس کی کشادہ پیشانی اس کے تابناک مستقبل کی ضمانت تھی۔ وہ پہلی نظر میں کالج یا یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ لگتا تھا۔

میں واپس آ کر پھر اسی جگہ بیٹھ گیا۔ اب مجھے وقتی طور پر ایک پناہ گاہ میسر آ گئی تھی۔ میں نے بیرے کو بلا کر مزید کوفی لانے کا آرڈر دیا اور ساتھ ہی عادل کو بھی بلوا لیا۔ تھوڑی دیر میں عادل مسکراتا ہوا میری میز پر آ بیٹھا۔

''مسٹر شہباز آپ نے مجھے بلایا؟''

''ہاں یار! وقتی طور پر مجھے ٹھکانے کی تلاش ہے۔ تمہاری نظر میں ہے کوئی جگہ؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''اگر آپ پسند کریں تو میرے ساتھ رہ لیں۔ میرے پاس تین کمروں کا ایک فلیٹ ہے اور میرا ساتھی

واپس چلا گیا ہے۔ مجھے یوں بھی وہ فلیٹ اب مہنگا پڑ رہا ہے کیونکہ ساتھی کے جانے کے بعد اب پورا کرایا مجھے ہی دینا پڑتا ہے۔ چلیے اچھا ہے، میں بھی خوامخواہ کی پریشانی سے بچ جاؤں گا اور آپ بھی۔"

"تمہارا ساتھی کیا کرتا تھا؟" میں نے یوں ہی ایک سوال پوچھ لیا۔

"وہ بھی میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ وہ میرے ہی ڈپارٹمنٹ میں تھا لیکن مجھ سے ایک سال سینئر تھا اس لیے ایم اے کرتے ہی چلا گیا۔ وہ کویت سے یہاں پڑھنے آیا تھا اور آئی آر (انٹرنیشنل ریلیشنز) کا طالب علم تھا۔"

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ عادل یونیورسٹی کا طالب علم تھا مگر وہ اسمگلروں کے اس بین الاقوامی گروہ کے ہتھے کیسے چڑھ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ عادل کو ان لوگوں کے پھندے سے نکال لوں گا۔ وہ گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس پوری بلڈنگ میں سبھی شریف اور پڑھے لکھے لوگ رہتے تھے۔

وہیں سامنے والے فلیٹ میں ایک گھرانا آباد تھا۔ احسن کمال صاحب ایک مقامی بینک میں منیجر تھے۔ ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں حنا اور بشریٰ! حنا انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہی تھی اور بشریٰ نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ یہ ساری تفصیلات مجھے عادل نے بتائی تھیں اور یہ بھی بتا دیا کہ بشریٰ سے میرا افیئر چل رہا ہے اور یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی میں اس سے شادی کر لوں گا۔ اس نے بتایا تھا کہ بشریٰ کے گھر والے تو مجھ سے بہت خوش ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں بس مجھے گاؤں جا کر اپنے بابا کو منانا پڑے گا۔ مگر وہ ذرا مشکل ہی سے مانیں گے۔"

ہم دونوں رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر نہ جانے کب سو گئے۔ صبح میری آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ عادل غائب تھا مگر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ایک پرچہ چھوڑ گیا تھا۔

"شہباز صاحب! میں یونیورسٹی جا رہا ہوں۔ اب وہاں سے واپسی پر ملاقات ہوگی۔"

اس کا پرچہ پڑھ کر میں مسکرا دیا۔ میں نے نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ فرنچ کٹ داڑھی سے واقعی میرے چہرے پر ایک وقار پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے گھوم پھر کر فلیٹ کا سرسری جائزہ لیا۔ اس فلیٹ میں تین کمرے تھے۔ دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ / ڈائننگ روم۔ دونوں بیڈ رومز میں اٹیچ باتھ تھے۔ وہ بہت خوب صورت فلیٹ تھا اور بہت اچھے لوگوں کی آبادی میں تھا۔ عادل کے دوست کا فرنشڈ بیڈ روم اب میرے استعمال میں تھا۔

فلیٹ کا جائزہ لے کر میں ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ اس وقت ناشتا کرنے کو میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لیے میں نے کوفی بنا کر پی لی تھی۔ میں نے اخبار دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ کئی دن پرانے اخبار دیکھنا چاہئیں۔ ممکن ہے ان میں میرے متعلق کوئی خبر چھپی ہو مگر کسی بھی اخبار میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فوجی حکام نے اس خبر کو عام نہیں کیا تھا اور نہ ہی سول پولیس سے مدد لی تھی ورنہ اخبار میں خبر ضرور ہوتی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ پھر میں نے ایک میگزین اٹھا لیا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو!" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"ثریا باجی ہیں؟" دوسری طرف سے کوئی خاتون بول رہی تھیں۔

"جی نہیں خاتون، یہاں کوئی ثریا باجی نہیں رہتیں۔ آپ نے غلط نمبر پر فون کیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

پھر مجھے نہ جانے کیوں خیال آیا کہ علیشاء سے فون پر بات کروں۔ کچھ نہیں تو اس کی آواز ہی سن لوں گا۔ نہ معلوم کیوں وہ مجھے اچانک اتنی شدت سے یاد آئی تھی۔ میں نے آپریٹر کا نمبر ڈائل کر کے علیشاء کے نمبر پر کوہاٹ ٹرنک کال بک کرا دی۔ مجھے ایک موہوم سی امید تھی کہ ممکن ہے وہ لوگ ابھی کوہاٹ ہی میں ہوں۔

تقریباً پچالیس منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو آپریٹر نے بتایا کہ کوہاٹ بات کریں۔

میں نے کہا۔ ’’ہیلو! کون بول رہا ہے۔‘‘
’’ہوم ڈو یو وانٹ؟‘‘ دوسری طرف سے علیشاء کی امی کی آواز آئی۔ انہیں نہ جانے کیوں انگریزی بولنے کا جنون تھا۔
’’علیشاء ہے کیا؟‘‘ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔
’’کون عامر؟‘‘ وہ مجھے کوئی عامر سمجھ رہی تھیں۔ ’’علیشاء تو اپنی سُسرال میں ہے بیٹا۔ یہاں تو وہ پچھلے ہفتے آئی تھی...... اور تم سناؤ' سب خیریت ہے امی ٹھیک ہیں۔‘‘
’’جی ہاں سب ٹھیک ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔
مجھے علیشاء کی شادی کی خبر سے ایک دھچکا سا پہنچا تھا۔ وہ تو ساری زندگی انتظار کرنے کا دعویٰ کرتی تھی مگر دو سال بھی انتظار نہ کر سکی۔ وہ میرا انتظار کرتی بھی کیوں؟ میں نے کب اس سے رابطہ رکھا تھا۔ میں نے تمام رشتے ناتے ختم کرنے کی ٹھان لی تھی مگر میں اس وقت بھول گیا تھا کہ کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ٹوٹنے کے بعد بھی قائم رہتے ہیں۔ میں دیر تک اُداس بیٹھا رہا۔ غلطی میری ہی تھی۔ علیشاء سے تعلقات ختم کرنے کی آخر کیا تُک تھی۔ میں اگر اس سے شادی کرنا چاہتا تو وہ لوگ انکار تو نہیں کر دیتے۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سفید لباس میں ایک لڑکی کھڑی تھی، میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے علیشاء میرے سامنے کھڑی ہو۔ وہی ناک نقشہ' ویسے ہی لمبے اور گھنے بال اور وہی قد و قامت!
’’جی فرمایئے؟‘‘ میں نے اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا۔
’’سوری! میں سمجھی عادل گھر پر ہے۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا نا!‘‘ اس نے میرے مسلسل گھورنے سے جھینپ کر کہا۔ ’’آپ......‘‘
’’میں عادل کا کزن ہوں۔‘‘ میں نے جلدی سے کہا۔ ’’اور میرا نام شہباز ہے۔‘‘
’’کمال ہے اس نے بتایا ہی نہیں۔ ناشتا تو میں نے صرف اس کے لیے بھیجا تھا۔ آپ تو اب تک بھوکے بیٹھے ہوں گے۔ ٹھہریے میں آپ کے لیے ناشتا بھجواتی ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ سامنے والے فلیٹ میں گھس گئی۔
میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا مگر وہ تو جا بھی چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے لیے ناشتا لے کر آ گئی۔
’’عادل بھی کہے گا کہ میرے کزن کو بھوکا مار دیا۔‘‘ اس شوخ لہجے میں کہا۔
’’معاف کیجیے گا محترمہ، میں یوں آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔‘‘ میں نے بھی ہنس کر کہا۔
’’آپ نے نام نہیں بتایا اپنا؟‘‘ میں نے ٹرے اپنی طرف کھسکا کر کہا۔
’’میرا نام حنا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔
اس میں اور علیشاء میں کتنی حیرت انگیز مشابہت تھی۔ وہی لب و لہجہ، وہی گلابی رنگت اور سیاہ لمبے بال! میں انہی خیالات میں ڈوبا ہوا نہ جانے کب صوفے ہی پر سو گیا۔ خواب میں بھی مجھے علیشاء دکھائی دی پھر اس نے حنا کا روپ دھار لیا۔
پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی مسلسل دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو عادل تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ آپ شاید سو رہے تھے شہباز بھائی، میں پانچ منٹ سے دروازہ پیٹ رہا ہوں اور آپ کی آنکھ ہی نہیں کھلی۔‘‘
’’سوری عادل! مجھے واقعی بہت نیند آ گئی تھی۔‘‘ پھر میں نے اس سے کہا۔ ’’یار وہ سامنے والے فلیٹ سے ایک لڑکی آئی تھی وہ......‘‘
’’کون...... بشریٰ؟‘‘ اس نے میری بات کاٹ دی۔
’’نہیں یار، اُس کی بڑی بہن حنا' وہ مجھے ناشتا دے گئی تھی۔ ویسے وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔‘‘ میں نے کہا تو عادل مسکراتے ہوئے بولا۔
’’ابھی میں آپ کو بشریٰ سے ملواؤں گا۔ آپ بھی دیکھیے میری پسند کیسی ہے؟‘‘
’’دیکھ لیں گے بھئی۔‘‘ میں نے ہنس کر کہا پھر اُس

سے پوچھا۔ ''ایک بات تو بتاؤ عادل، مگر دیکھو مجھ سے کچھ چھپانا مت۔''

''آپ پوچھیے تو سہی؟'' عادل نے حیرانی سے کہا۔

''تم ایک پڑھے لکھے اور باعزت خاندان کے فرد ہو پھر...... پھر تم ان اسمگلروں کے چکر میں کیسے پھنس گئے؟''

وہ ایک دم اُداس ہوگیا۔ ''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ شہباز بھائی! اب تو مجھے مجبوراً ان کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔ ان کے لیے کام نہ کروں تو وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس چکر میں مجھے میرے دوست نے اُلجھایا تھا جو میرے ساتھ رہتا تھا۔ اس وقت تو میں پیسوں کے لالچ میں ان کے ساتھ شامل ہوگیا مگر اب میری جان عذاب میں ہے شہباز بھائی!''

''تم ان لوگوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو نا؟'' میں نے کہا۔ ''تو اب میں تمہارا پیچھا ان لوگوں سے چھڑاؤں گا۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

میں نے اُس سے یہ بات کہہ تو دی تھی مگر اب سوچ رہا تھا کہ اگر اُس نے یہی بات سیٹھ زارداد کو بتا دی تو...... مجھے ایسی بے وقوفی کرنے کی کیا ضرورت تھی مگر نہ جانے کیوں مجھے عادل پر اعتماد تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں کرے گا۔

شام کو ہم لوگ اسی ہوٹل میں سیٹھ زارداد سے ملے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ کراچی میں دو تین جگہ میرا کچھ پیسا پھنسا ہوا ہے۔ اس کی ریکوری تمہاری ذمے داری ہے۔ پھر اُس نے مجھے ان لوگوں کے پتے بھی دیے۔

رات کو واپسی پر میری ملاقات پھر حنا سے ہوئی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی محسوس کی۔ عادل نے مجھے بشریٰ سے بھی ملوایا۔ وہ بہت ہی معصوم اور بھولی لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر اتنا بھولپن تھا کہ دیکھنے والے کو بے اختیار اس پر پیار آ جائے۔ اُس نے شرماتے ہوئے مجھے سلام کیا۔

وہ اور حنا تھوڑی دیر بیٹھی ہم سے باتیں کرتی رہیں، پھر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد عادل نے مجھ سے پوچھا۔

''شہباز بھائی! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں...... آپ حنا کو اس انداز سے دیکھ رہے تھے کہ مجھے...... آپ کے لیے بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''ہاں یار!'' میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اُسے دیکھ کر مجھے کوئی یاد آ جاتا ہے...... مگر...... اب وہ...... میری پہنچ سے دور ہے...... میں صرف اُسے یاد ہی کر سکتا ہوں...... مجھے حنا میں اُس کی جھلک نظر آئی تو بے اختیار ہوگیا۔''

''ارے ارے، آپ تو اُداس ہوگئے۔ چلیے وہ نہ سہی، اُس کی ہم شکل ہی سہی...... اگر حنا...... آپ کو مل جائے تو......''

''تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے حنا بازار میں رکھا ہوا کوئی کھلونا ہے۔ یہ زبردستی کے سودے نہیں ہوتے ہیں عادل، ممکن ہے...... وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو؟''

''یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال تو آپ سو جائیں۔'' وہ شب بخیر کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن عادل نے بشریٰ کے ذریعے حنا سے بات کی اور مجھے بتایا کہ حنا بھی آپ سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ میرا دل خوش گوار انداز میں دھڑک اٹھا۔

☆......☆......☆

سیٹھ زارداد کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے چار مہینے ہوگئے تھے۔ اُس نے ابھی تک مجھے پاکستان کی حد تک ہی محدود رکھا تھا۔ مجھے ابھی تک ملک سے باہر جانے کا موقع نہیں ملا تھا اور میں جبراً اُس کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس میں بھی زیادہ تر کام ایسے تھے جہاں مار دھاڑ کی ضرورت پڑتی تھی۔

اس دوران میں حنا نہایت تیزی کے ساتھ میرے حواس پر چھا گئی۔ علیشاہ کو کھو دینے کے بعد میں حنا کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی لے لی تھی۔ میں اور حنا اکثر شام کو کہیں گھومنے نکل جاتے تھے۔ میرے بال تو بڑھ گئے تھے مگر فرنچ کٹ داڑھی ابھی موجود تھی اور پائپ تو اب میں پینے کا عادی

ہو چکا تھا۔

ایک دن ہم لوگ ہاکس بے کے ساحل پر گھوم رہے تھے۔ حنا نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔ ''شہباز! تم نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ تم کہاں سروس کرتے ہو۔''

''کیا کرو گی معلوم کر کے؟'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''کبھی کبھی میں دن میں اتنی بور ہوتی ہوں کہ تم سے ملنے کو دل چاہتا ہے، مجھے معلوم ہی نہیں ہے کہ تمہارا دفتر کہاں ہے یا کم از کم ٹیلی فون نمبر ہی دے دو، تم سے فون ہی پر بات کر لیا کروں گی۔''

''حنا..... تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ میں اچھا آدمی نہیں ہوں...... پھر......؟''

''میں مان ہی نہیں سکتی کہ تم اچھے آدمی نہیں ہو۔ بُرے آدمی ایسے ہوتے ہیں؟'' اُس نے شوخ لہجے میں کہا۔

''حنا واقعی میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی، پھر نہایت فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''شہباز...... اگر تم برے آدمی ہو تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں یونہی چاہتی رہوں گی۔ ساری زندگی تمہاری بن کے رہوں گی۔ تم جیسے بھی ہو میرے ہو شہباز...... صرف میرے۔'' وہ ایک دم جذباتی ہو گئی۔

وہ اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ اُسے نارمل کرنے میں مجھے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ پھر ہم لوگ واپس آ گئے۔

اُس دن میں حسبِ معمول سیٹھ زارداد سے ملا تو اُس نے مجھ سے پشاور جانے کو کہا۔ مجھے کچھ ''مال'' لے کر پشاور جانا تھا اور وہاں سے بھی کچھ لے کر آنا تھا۔ اُس نے کہا کہ پرسوں تم روانہ ہو جانا۔ میں تمہاری روانگی کا تمام بندوبست کر دوں گا اور یہ کام نہایت احتیاط سے کرنا۔''

''ٹھیک ہے سیٹھ۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ گیا اور نیچے ڈائننگ ہال میں آ کر بیٹھ گیا۔

ڈائننگ ہال میں اُس وقت شہنشاہ وجود تھا۔ وہ سیٹھ زارداد کا خاص آدمی تھا اور سیٹھ اُس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے۔ اُس کے منہ اور کپڑوں سے شراب کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔

''کیا حال ہے شہنشاہ!'' میں نے پوچھا۔

''ارے حال کیا ہونا ہے یار، وہ اپنا...... سیٹھ ہے نا...... وہ کل ہمیں لندن بھیج رہا ہے۔''

اِسی دوران میں ایک بیرا شراب کی ایک بوتل اور گلاس میز پر رکھ گیا۔ شہنشاہ غالباً پہلے ہی شراب کا آرڈر دے کر میری طرف آیا تھا۔ اُس نے گلاس آدھے سے زیادہ بھرا اور ایک سانس میں چڑھا گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے آدھی سے زیادہ بوتل صاف کر دی۔ اب اس کے منہ سے جملے بھی صحیح طور پر ادا نہیں ہو رہے تھے۔

''تم لندن کیوں جا رہے ہو؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''یار اس...... دفعہ اپنے سیٹھ نے...... بہت بڑا ہاتھ مارا ہے...... اس نے دنیا کی ایک بہت...... بڑی طاقت...... سے پاکستان...... کے فوجی رازوں کا سودا کیا ہے۔'' اُس نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

میں چونک گیا۔ ''وہ راز تم لے کر جاؤ گے؟''

''اور نہیں تو...... کیا...... سیٹھ...... خود...... جائے گا...... وہ...... چھوٹی سی...... ایک مائیکرو...... فلم ہے...... مگر کروڑوں روپے کی اور...... میں کل...... شام...... کو جاؤں گا...... تمہیں...... اُدھر سے کچھ...... منگوانا ہے؟''

''میرے لیے تم بس ایک پائپ لیتے آنا...... اور بس!''

☆☆☆

میں واپس گھر آیا تو میرے دل و دماغ میں بگولے سے اُٹھ رہے تھے۔ میرے اندر کا کمانڈو احمر ایک بار پھر انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا۔ مجھے شہنشاہ کو ہر قیمت پر روکنا تھا۔ مجھے اپنے وطن کی آبرو کی حفاظت کرنا تھی۔ اسی کشمکش میں تمام رات میں نے جاگ کر اور ٹہل کر گزار دی۔

صبح ہوئی تو عادل میرے کمرے میں آیا اور میری حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں اس وقت بھی انہی کپڑوں میں تھا جو میں نے رات پہنے تھے۔

''آپ اتنی صبح تیار ہو گئے، شہباز بھائی؟''

میں نے اُسے بھی اس راز میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔ ''اب جو بات میں تمہیں بتانے والا ہوں عادل اسے اپنی ذات تک محدود رکھنا۔'' پھر میں نے اُسے بھی مائیکرو فلم کے بارے میں بتا دیا اور کہا۔

''تمہارا کام صرف اتنا ہے عادل کہ تم ...... دوسروں کی نظروں میں آئے بغیر میرے پیچھے رہو تاکہ مجھے کور کرسکو۔''

پھر میں اسے تمام تفصیلات بتاتا رہا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ شہنشاہ کو ایئرپورٹ جانے سے پہلے ہی پکڑ لوں گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مائیکرو فلم لینے سیٹھ زرداد کے پاس آئے گا اور وہیں سے وہ ایئرپورٹ جائے گا۔ ممکن ہے اسے ایئرپورٹ تک چھوڑنے کے لیے کچھ اور لوگ بھی جائیں...... ممکن ہے سیٹھ زرداد خود جائے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں شام ہی سے ہوٹل کے گرد منڈلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں ہوٹل میں بھی گیا تھا۔ مگر پھر باہر آ گیا کہ ایسا نہ ہو کہ شہنشاہ نکل جائے اور مجھے علم ہی نہ ہو۔

ٹھیک سات بجے شہنشاہ ہوٹل سے نکلا۔ اس کے ساتھ ساتھ دو باڈی گارڈ اور بھی تھے۔ سیٹھ زرداد ہوٹل سے باہر تک اُس کے ساتھ آیا۔ پھر لوٹ گیا۔ شہنشاہ کی گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے بھی اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور اُس کے پیچھے لگا دی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا ہوٹل سے ایئرپورٹ تک کے راستے میں کرنا تھا، مگر اس بھری پُری شاہراہ پر اگر میں کچھ کرتا بھی تو دوسرے لوگ بھی زد میں آتے۔

اِسی شش و پنج میں شہنشاہ کی گاڑی ایئرپورٹ پہنچ گئی۔ میں بھی پیچھے پیچھے پہنچا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے اندر داخل ہونے والا تھا۔ پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے ڈپارچر لاؤنج سے اندر داخل ہو گیا۔ میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں شہنشاہ کو کیسے روکوں؟

آخر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ میرے پاس میں ابھی تک میرا ملٹری کا سروس کارڈ موجود تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اسی کارڈ کو استعمال کروں گا۔

اسی دوران میں جہاز کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔ میں تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا ایئرپورٹ منیجر کے کمرے میں گھس گیا۔

''کیپٹن احمر فرام پاکستان آرمی۔'' میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا اور اپنا سروس کارڈ نکال کر اُس کے سامنے ڈال دیا۔

اُس نے ایک نظر کارڈ پر ڈالی اور ''کمانڈو'' کا لفظ پڑھتے ہی جھٹ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''لیس کیپٹن؟''

''اس طیارے کو رُکوایئے۔ خدا کے لیے جلدی کیجیے ورنہ ملک کا بہت عظیم نقصان ہو جائے گا۔'' میں نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

ایئرپورٹ منیجر نے فوراً کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کیا اور جہاز کی پرواز روکنے کا حکم دیا۔

پھر میں نے ایئرپورٹ سیکورٹی کے کچھ جوانوں کو ساتھ لیا اور جیپ لے کر طیارے کی طرف آندھی طوفان کی طرح بڑھا۔ طیارے سے سیڑھی ہٹالی گئی تھی مگر میرے حکم پر ایک بار پھر سیڑھی لگا دی گئی۔ میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا طیارے میں گھس گیا اور مسافروں میں شہنشاہ کو تلاش کرنے لگا۔

آخر ایک سیٹ پر وہ مجھے دکھائی دے گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''کیا بات ہے شہباز' خیریت!'' اُس نے حیرانی سے کہا۔

''شہباز نہیں، کیپٹن احمر کہو مجھے اور وہ فلمیں میرے حوالے کر دو سمجھے۔''

اُس نے اچانک مجھ پر چھلانگ لگا دی مگر میں غافل نہیں تھا اس لیے پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر میری لات اُس کی ریڑھ کی ہڈی پر پڑی۔ میں نے اُسے کینچوے کی طرح پکڑ کر اٹھا لیا اور طیارے سے

باہر گھسیٹ لایا۔

سکیورٹی کے ایک جوان نے اُس کا بیگ بھی اٹھالیا۔ وہ مائیکروفلم اُس نے اپنی بغل کی ایک خفیہ جیب میں چھپارکھی تھی۔

پورے کمانڈ وہیڈ کوارٹر میں ہلچل سی مچ گئی اور ڈویژن کمانڈر جنرل فاروق بہ نفس نفیس وہاں پہنچ گئے۔ وہ اتنے اہم فوجی راز تھے کہ اگر ملک سے نکل جاتے تو ہماری تباہی میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔

جنرل صاحب نے خوش ہوکر مجھے مبارک باد دی تو میں نے خود کو بھی گرفتاری کے لیے پیش کردیا۔

''فاروہاٹ بوائے؟'' جنرل صاحب نے حیرت سے کہا۔ میں نے انہیں تمام واقعہ بتایا۔ انہوں نے اُسی وقت جی ایچ کیو راولپنڈی سے رابطہ قائم کیا۔ پھر بہت دیر تک وہ کسی سے بات کرتے رہے۔ کئی بار میرا نام بھی گفتگو میں آیا مگر میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ گفتگو کیا ہورہی ہے۔

فون بند کرکے انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''آج رات تم میرے بنگلے پر رہو گے صبح بریگیڈیئر عارف آئیں گے اور تمہیں گرفتار کرکے لے جائیں گے۔ بے وقوف لڑکے! جلد بازی سے ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔ کیپٹن سمیر کو بچالیا گیا تھا۔ تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔''

''پھر میں جاؤں؟'' میں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

''ہاں بھئی مگر یاد رکھنا کل بریگیڈیئر صاحب سروس کلب میں رہیں گے، وہیں پہنچ جانا۔''

''اوکے سر! خدا حافظ!''

''خدا حافظ!''

میں وہاں سے نکل کر سیدھا اپنے فلیٹ کی طرف دوڑا۔ میں ایک بار پھر ایک باعزت آدمی تھا۔ ملک کا محافظ اور بہترین کمانڈو تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا خوشی سے ناچنے لگوں۔ سارے زمانے کو بتادوں کہ میں بے گناہ تھا اور اب ایک معزز شہری ہوں۔

میں دوڑتا ہوا بلڈنگ کا زینہ چڑھتا چلا گیا مگر اپنے فلیٹ کے دروازے پر خون دیکھ کر مجھے چکر سا آگیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ صرف بھڑا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور دیوانہ وار اندر گھس گیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میرے گھستے ہی ایک فائر ہوا اور گولی میری پنڈلی اُدھیڑتی ہوئی گزر گئی۔

میں پھرتی سے فرش پر گر گیا۔ مجھے حملہ آور کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ میں نے فوراً آواز پر فائر جھونک مارا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو پنڈی سے بھاگتے وقت میں نے ڈیوٹی آفیسر سے چھینا تھا۔ میری گولی رائیگاں نہیں گئی اور اندھیرے میں کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر آہستہ سے اُٹھ کر لائٹ جلادی۔

اندر کا منظر دیکھ کر میرے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔ عادل اور بشریٰ ایک طرف خون میں لت پت پڑے تھے۔ وہ ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہوچکے تھے۔ کچن کے قریب حنا پڑی تھی۔

وہ ابھی زندہ تھی۔ میں نے اُسے کندھے پر اٹھایا اور دیوانہ وار اپنی گاڑی کی طرف بھاگا۔ وہ دو دن تک بے ہوشی کی حالت میں اسپتال میں پڑی رہی۔

تیسرے دن اُسے ہوش آیا تو اُس نے بتایا کہ کچھ لوگ زبردستی گھر میں گھس آئے تھے اور کسی شہنشاہ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اذیتیں دے دے کر عادل کو ماردیا۔ بشریٰ کو بھی ماردیا۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ سیٹھ زرداد کے کچھ آدمیوں نے عادل کو شہنشاہ کے تعاقب میں دیکھ لیا ہوگا اور شہنشاہ کی گرفتاری کے بعد عادل سے حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن وہ بے چارہ خوامخواہ مارا گیا۔

☆......☆......☆

میں اب میجر احمر ہوں۔ حنا میری بیوی ہے مگر...... کبھی کبھی میں بہت اُداس ہوجاتا ہوں، جب مجھے عادل یاد آتا ہے، بشریٰ یاد آتی ہے یا...... وہ نوزائیدہ بچہ یاد آتا ہے جسے اُس کی ماں ٹرین کے آگے رکھ گئی تھی۔

حنا کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے ٹرین کے سفر سے وحشت کیوں ہوتی ہے؟ اور اس کی سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا۔

☆☆......☆☆

ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 16

یہ ایک بہت بڑا رسک تھا جو سلمان نے صرف اور صرف صنوبر کی محبت میں لے لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صنوبر کا دل اداس ہو اسے شرجیل کے دنیا سے چلے جانے کا دکھ ملے۔ اور اس دکھ سے اس کا سارا جیون کمہلا کے رہ جائے۔ وہ جانتا تھا صنوبر شرجیل سے کتنی محبت کرتی ہے۔ وہ اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسے شرجیل کے بغیر زندگی کی طرف واپس لانا اتنا دشوار ہو سکتا تھا کہ شاید اس کوشش میں ناکامی اس کا مقدر بن جائے اور یہ سب اس سے دیکھا نہ جا سکتا۔ یہی سب سوچ کر اس نے شرجیل کے وجود میں خود کو داخل کیا تھا اور اس وقت اس نے ایسا بالکل نہیں سوچا تھا کہ ایسا کرنے کے بعد اس کے اپنے ساتھ کیا ہو گا۔ ظاہر ہے وہ کوئی دنیا میں اکیلا نہیں تھا نہ ہی آسمان سے گرا تھا کہ اس کا کوئی نہ ہو۔ اس کے ماں باپ تھے جو اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اس کی ماں تو اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

اس نے جنات کی ساری تاریخ میں جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس کے لیے بھی اپنے بیٹے سلمان کا ساتھ دیا تھا۔ اسے انسان بننے اور انسانوں کے بیچ چلے جانے کی اجازت نہ صرف خود دی تھی بلکہ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنے دل کو بھی زخمی کر لیا تھا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی صورت مدتوں تک دیکھنے کو ترس جاتی اور ہر پل اس کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی... اب اسی ماں کو اس کی ضرورت تھی اور یہاں انسانوں کی دنیا میں وہ کتنی بری طرح خود کو دلدل میں دھنسا چکا تھا اس سے نکلنا کوئی آسان نہیں تھا۔

اس وقت بھی شرجیل کا باپ اس کے سر پر سوار تھا اور اس سے صنوبر کو بھول جانے کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا۔ ایسے میں اسے اپنے باپ ابراہیم کی آواز سنائی دی کہ اس کی ماں اور وہ مصیبت میں ہیں۔

اب مجھے کیا کرنا چاہیے اس کے ذہن نے فوری طور پر اسی بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ کیسے اپنے ماں باپ کی مدد کو پہنچے جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اسی کی وجہ سے کسی مصیبت میں پڑے ہیں۔ اس نے مصیبت کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ کیا ہو سکتا ہے تو اس کے ذہن نے جواب دیا کہ ہو نہ ہو سردار کی مجلس



کے لوگوں خصوصاً کیلاش نے اس کے باپ کا ناک میں دم کر دیا ہوگا۔ وہ ضرور بار بار یہ پوچھ رہا ہوگا کہ سلمان کہاں ہے وہ اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔ اور پتا نہیں کیا کیا.... ویسے بھی سلمان کو اندیشہ تھا کہ کیلاش کو اس پر شک ہو چکا ہے کہ وہ اپنے ماموں بدیل کا کہہ کر کہیں اور جاتا ہے۔ تو اب اس شک کو کیا یقین مل چکا ہے کیا اسے معلوم ہو چکا ہے کہ سلمان اپنے ماموں کے پاس نہیں ہوتا؟ اس قسم کی باتوں اور ابھرنے والے سوالوں نے اس وقت سلمان کے ذہن میں کہرام برپا کر دیا تھا۔

''بیٹا آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' شرجیل کے باپ نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا کیونکہ وہ کتنی ہی بار با آواز بلند شرجیل کو مخاطب کر چکا تھا لیکن شرجیل نے اسکی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی ایک لمحے کو سرفراز ملک کو ڈر سا محسوس ہوا کہ ان کا بیٹا جو ابھی کچھ دن پہلے ہی ہسپتال سے لوٹا ہے کہیں کسی ذہنی مرض کا شکار تو نہیں ہو گیا جو ان کے اتنا قریب سے بولنے پر بھی ان کی بات نہیں سن پا رہا تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ سلمان کہاں پہنچا ہوا تھا اسے اپنے اصل ماں باپ کی پریشانی نے گھیر لیا تھا اور وہ مسلسل یہاں سے نکل بھاگنے اور اپنے ماں باپ کے پاس پہنچنے کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

''ہیں.... کیا.....؟'' جیسے شرجیل نے واقعی اپنے باپ کی بات نہ سنی ہو۔ سرفراز ملک نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں ڈھیروں اندیشوں نے ڈیرہ جمایا ہوا تھا انھیں لگا کہ شاید ان کے بیٹے شرجیل کی طبیعت پوری سنبھلی نہیں ہے اس لیے انھیں اس سے ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ انھوں نے موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے شرجیل کو آرام کرنے کا کہا اور خود کمرے سے چلے گئے۔

کمرے کے باہر شرجیل کی ماں بے چینی سے ان کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھیں وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ بیٹے نے باپ کی بات سن کر کیا جواب دیا ہے کیا وہ ان کی بات مان گیا ہے یا.... اس کے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھیں کیونکہ شرجیل کو جیسے بھی ہو اپنے ماں باپ کی خاطر اور اس خاندان کو بڑا نقصان سے بچانے کے لیے ان کی بات ماننا ہی ہوگی۔ سرفراز ملک کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر رخسانہ کو سوال کرنے کی ضرورت نہیں رہی اور وہ خود سے بولی۔

''نہیں مانی اس نے آپ کی بات؟''

''نہیں ایسا نہیں ہوا۔'' سرفراز ملک نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''وہ ابھی اپنے حواسوں میں نہیں ہے بات کرتے کرتے پتا نہیں کہاں گم ہو جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اس کے سر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے اس کی ذہنی حالت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے اس سے ہمیں ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے اس کے ذہن پر زور پڑے اور وہ کسی بیماری میں چلا جائے۔''

سرفراز ملک نے اس طرح کہا جیسے وہ بیوی کو بتا نہیں رہے بلکہ سمجھا رہے ہوں کہ انھیں بھی ان کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔ رخسانہ یہ سن کر اس سے بھی زیادہ پریشان ہو گئیں جیسے وہ بیٹے کے انکار کا سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں۔

'' اچھا میں اس سے مل کر آتی ہوں کہیں اسے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔ اسے سوپ یا جوس پلاتی ہوں.... ایسے وقت میں دوا سے زیادہ اسے اچھی غذا کی ضرورت ہے.... آپ تو جانتے ہیں وہ کھانے کا کس قدر چور ہے.... سارے پھل میں نے جو اس کے کمرے میں رکھوا دیے تھے وہ سب اسی طرح رکھے ہوں گے اور اس نے کسی ایک کو بھی ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔'' وہ جیسے بس بولتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ شاید اپنی پریشانی کو کم کرنے کے لیے یا شوہر کا ذہن موجودہ ٹینشن سے ہٹانے کے لیے وہ جو کچھ دل میں آ رہا تھا بولے جا رہی تھیں۔ وہاں سے

اٹھ کر عجیب بکھرے سے خیالات کے ساتھ وہ شرجیل کے پاس پہنچیں اس وقت شرجیل بستر سے اٹھ کر کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا وہ اسے اس طرح پریشان دیکھ کر دھک سے رہ گئیں۔ان سے صبر نہیں ہوسکا اور وہ بولیں۔

''کیا بات ہے بیٹا آپ ایسے کیوں ٹہل رہے ہو۔آپ کو تو بیڈ پر لیٹا ہوا ہونا چاہیے ابھی آپ کی طبیعت بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ہے''

شرجیل نے رک کر ان کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ وہ ان کی بات کا کیا جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت اسے ان کی بات کا جواب دینے سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ کس طرح یہاں سے نکل کر اپنے اصل ماں باپ تک پہنچے اور انھیں مصیبت سے نکالے۔اس نے اسی کیفیت میں کہا۔

''مجھے یہاں سے جانا ہے!'' یہ سنتے ہی شرجیل کی ماں کے پیروں تلے جیسے زمین کھسکنے لگی وہ سمجھ نہیں سکیں کہ انھیں اس بات کے جواب میں کیا کہنا چاہیے۔ویسے بھی شرجیل کا یہ کہنا کہ اسے یہاں سے کہیں جانا ہے تو وہ کیسے سمجھ پاتیں کہ وہ ایسا کیوں کہتا۔جبکہ سلمان کا مسئلہ یہ تھا کسی بھی بہانے سے اسے باقاعدہ طور پر یہاں سے جانا ہوگا وہ بنا بتائے اپنی جن والی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے تو یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔اس سے مسائل کا ایک اور طومار جمع ہوجانے کا اندیشہ تھا۔

''اچھا یہاں بیٹھو اطمینان سے'' وہ شرجیل کو ہاتھ سے پکڑ کے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولیں۔''اب بتاؤ تمھیں کہاں جانا ہے اور کیوں؟''

شرجیل کے پاس ان دونوں باتوں کا جواب ہوتا تو وہ ایسی الل ٹپ ضد کرتا ہی کیوں اسے تو خود نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں سے کس طرح اور کہاں جانے کا کہہ کر نکل سکتا ہے۔

''بس کہیں بھی بھیج دیں۔ مجھے یہاں نہیں رہنا'' وہ اسی طرح ضد کے سے انداز میں بولا۔رخسانہ سمجھیں کہ وہ ڈر رہا ہے اس لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔کس سے ڈر رہا ہے؟ یہ تو وہ پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھیں کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ کیوں اور کس سے ڈر رہا ہے۔جس انسان پر جان لیوا حملہ ہوا ہو اسے ڈر لگنا فطری سی بات تھی۔وہ سمجھ گئیں کہ ان کے بیٹے کی حالت نازک ہے اور وہ ابھی پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوا ہے اسے اپنی جان کا خطرہ ہے اس لیے اس کے اوسان یکجا نہیں ہو رہے اور وہ اس طرح کی عجیب و غریب باتیں کر رہا ہے۔

یہ سب سوچ کر انھیں لگا کہ انھیں اپنے بیٹے کی جان بچانے اور اسے اس ڈر سے نجات دلانے کے لیے کچھ تو کرنا ہوگا۔

''اچھا آپ یہاں اطمینان سے بیٹھو بلکہ آپ لیٹ جاؤ اور یہ فروٹس.....کھاؤ.....'' اتنا کہہ کر انھوں نے فروٹس کی باسکٹ کی طرف دیکھا تو ایک لمحے کو حیرت سے ان کی آنکھیں پتھرا گئیں۔باسکٹ خالی تھی اور سارے فروٹس غائب تھے۔اضطراری طور پر ان کے منہ سے نکلا۔

''یہ فروٹس کہاں گئے!!'' وہ کب جانتی تھیں کہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا ان کا بیٹا شرجیل نہیں ہے جسے فروٹس کھانے سے چڑ تھی اور بڑی مشکل سے وہ فروٹس کا جوس پینے پر راضی ہوتا تھا اس طرح ثابت فروٹس کو کھا لینے پر اسے راضی کرنا تو جیسے کوہ طور کی خبر لانے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا۔اب انھیں کون بتاتا تھا کہ جنوں کی خوراک انسانوں سے چار گنا سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور اتنی شدید پریشانی میں بھی ان کے سامنے بیٹھا ہوا شخص جو ایک جن تھا وہ سارے فروٹس نگل چکا ہے۔سلمان نے انھیں اس بے کار کی بات میں الجھتے دیکھا تو جلدی سے بولا۔

''آپ فروٹس کو چھوڑیں مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے آپ جائیں اور ڈیڈی سے پوچھیں جا کر وہ مجھے

یہاں سے بھیجنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں... مجھے ابھی اور اسی وقت یہاں سے جانا ہے''

شرجیل کی بات سن کر وہ اپنے محویت سے نکل آئیں اور شرجیل کی بات سن کر بس اتنا کہہ سکیں کہ ''اچھا میں جاتی ہوں'' شرجیل کی امی چلی گئیں اور سلمان نے فروٹس کی باسکٹ اٹھا کر اسے اوپر نیچے سے دیکھا اور رکھ کر ایک دھپ کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گیا۔

رخسانہ میاں نے پاس پہنچیں اور جاتے ہی ایسے پریشانی سے بات شروع کی کہ سرفراز کو لگا ان کے بیٹے کو کچھ ہو گیا ہے۔

''شرجیل تو ٹھیک ہے نا؟'' وہ بیگم کی بات نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے بولے۔

''مجھے تو وہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ عجیب عجیب باتیں کر رہا ہے۔ کہتا ہے مجھے یہاں سے ابھی اور اسی وقت جانا ہے'' رخسانہ نے پریشانی سے کہا اور صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھتے ہوئے مذید بولیں۔ ''فروٹس بھی پتا نہیں کہاں چلے گئے باسکٹ تو خالی ہے۔ گھر کے نوکر ایسا تو پہلے کبھی نہیں کرتے تھے۔ کیا اب نوکروں نے گھر میں چوریاں بھی شروع کر دی ہیں۔'' جیسے وہ آخری بات انھوں نے اپنے آپ سے کہی ہو۔

''اسے کہاں جانا ہے؟'' سرفراز نے انھیں پھر اصل بات کی طرف متوجہ کیا۔

''مجھے کیا پتا... کہاں جانا ہے یہ تو وہ نہیں بتا رہا بس یہ کہے جا رہا ہے کہ مجھے یہاں سے جانا ہے۔ کہاں جانا ہے یہ اسے شاید خود بھی نہیں معلوم''

''اچھا یہ تو بتایا ہو گا کہ وہ جانا کیوں چاہتا ہے؟'' سرفراز کو بیوی کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا جو ڈھنگ سے اور ترتیب سے بات کرنے کے بجائے عجب لایعنی سی گفتگو کر رہی تھیں جانے اب تک اپنے فروٹس کے غائب ہو جانے کے صدمے سے دوچار ہوں۔

''نہیں یہ بھی نہیں بتا رہا بس یہ کہہ رہا ہے کہ اسے یہاں سے کہیں بھی بھیج دیا جائے مگر اسے جانا ہے۔'' وہ رکیں اور بولیں۔ ''مجھے تو لگتا ہے وہ ڈر گیا ہے۔ اسے اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ اس لیے یہاں سے جانا چاہتا ہے'' بیوی کی بات سن کر سرفراز اس بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

ایسے میں رخسانہ نے یہ بھی کہا کہ اس پر جان لیوا حملہ ہوا تھا۔ ڈرے گا نہیں تو کیا آرام سے رہے گا۔ پتا نہیں ہمارے بیٹے کو یہ کیا ہو گیا ہے'' ان کی آواز میں رونے جیسی کیفیت صاف سنائی دے رہی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کچھ کرتا ہوں'' سرفراز نے بیوی کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''کیا کریں گے آپ وہ تو ایک منٹ کے لیے بھی رکنا نہیں چاہتا فوراً ابھی کے ابھی جانے کی ضد کر رہا ہے''

''لیکن جب میں اس کے پاس تھا تو اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ یہ چند لمحوں میں اسے ہوا کیا ہے۔'' سرفراز ملک نے سوچتے ہوئے کہا۔

''آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ ایسی حالت میں کسی بھی انسان کو تبدیل ہونے یا کچھ بھی کہنے اور کرنے میں کیا وقت لگتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو مگر میں سوچ رہا ہوں۔ اتنی جلدی اسے کہاں بھیجا جا سکتا ہے اور کیا اسے اکیلے بھیجنا ٹھیک ہو گا؟'' سرفراز کی بات سن کر رخسانہ نے جواب دینے میں ایک لمحہ نہیں لگایا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہم اسے اس حالت میں کہیں بھی کیسے بھیج سکتے ہیں اور وہ بھی اکیلے... نہیں نہیں میں اس کے ساتھ جاؤں گی ویسے بھی وہ جہاں بھی جائے گا اس کا وہاں خیال کون رکھے گا اور اس وقت اسے ایک اٹینڈنٹ کی سخت ضرورت ہے'' رخسانہ جیسے اپنے فروٹس کے غائب ہونا کا غم بھول چکی تھیں۔

”لیکن آپ کیسے جاسکتی ہیں۔رخشی آرہی ہے لندن سے۔وہ یہاں اکیلی کیا کرے گی؟“

”رخشی....!!!میں تو بالکل بھول ہی گئی تھی۔اب کیا ہوگا۔وہ اگر شرجیل کو یہاں نہیں دیکھے گی تو سو سوال کرے گی۔اور اس حالت میں شرجیل کا اس سے ملنا.....“ جیسے بولتے بولتے انھیں خود ہی لگا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔”اس طرح تو سارا کام بگڑ جائے گا۔ہم نے اسے شرجیل سے ملنے اور اس کے ساتھ وقت بتانے کے لیے بلایا ہے تاکہ وہ شرجیل کے دل سے صنوبر کا نام ہمیشہ کے لیے مٹا سکے۔ایسے میں وہ شرجیل کی یہ حالت دیکھ کر کیا اسے پسند کرے گی۔سرفراز ہمارے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔آپ کوئی بھی بہانہ کرکے رخشی کو یہاں آنے سے روک دیں۔“

”ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔وہ تو اب تک ائیر پورٹ کے لیے نکل چکی ہوگی۔“ سرفراز کے لہجے میں بوکھلاہٹ تھی۔

”اس کا مطلب ہے ہم اب کچھ نہیں کرسکتے۔!!!“ رخسانہ نے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”ایسا ہی لگتا ہے۔ہمیں آنے والے خطرات کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔“ سرفراز کے لہجے کی مایوسی بتارہی تھی کہ وہ ہار مان چکے ہیں۔

”اس طرح خاموش بیٹھنے سے کیا ہوگا۔اگر آپ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تو مجھے ڈر ہے کہ شرجیل.....“ اس کے آگے وہ کہہ نہیں سکیں یا کہنا نہیں چاہتی تھیں۔

سرفراز نے کھلی اور وحشت زدہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔اور بولے آپ عبدل سے میرے لیے ایک کپ کافی تو بھجوادیں میرا تو سوچ سوچ کر سر دکھنے لگا ہے۔

بے چارگی سے شوہر کی طرف دیکھ کر رخسانہ کمرے سے نکل کر چلی گئیں۔انھیں اپنا گھر کسی بڑے طوفان کی زد پر دکھائی دینے لگا۔اور ان کا ذہن صرف ایک ہی بات مسلسل سوچے جارہا تھا کہ وہ شرجیل کو سمجھائیں گی اور اسے یہیں روکے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں گی۔

☆☆☆

سلمان صنوبر کی باتیں سننے کے بعد اس وقت فارس سے ملنے اس کے پاس آیا ہوا تھا اور وہ دونوں ایک امیروں والے کلب میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں کی ہر چیز ایسی تھی کہ غریب اس کے صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں' وہ بھی ایسے کسی کلب داخل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔جہاں کا صرف داخلہ ہی کئی لاکھوں کے ہندسوں پر محیط تھا اور سالانہ فیس تو اتنی زیادہ تھی کہ اس کلب میں خود بعض امیروں کو داخلہ لیتے ہوئے بھی سوچنا پڑتا تھا اسی لیے علاقے کے سب ہی خاندان یہاں رجسٹرڈ تھے بھی نہیں۔لیکن فارس ایسی کسی بھی جگہ کو اپنی جاگیر سمجھتا تھا جہاں لڑکیوں کا آنا جانا ہو۔لہٰذا اس کے لیے یہاں کی موٹی اور بھاری داخلہ فیس دینا کوئی اہم بات نہیں تھی ویسے بھی فارس کا پورا گھر اس کلب میں اپنا وقت گزارا کرتا تھا اور گویا اس کے گھر کے سب ہی افراد یہاں کے ممبرز تھے۔

سلمان البتہ یہاں کا ممبر نہیں تھا اس نے اپنے والد سے کئی بار اس بارے میں خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن آصف کریم جنھیں یقین تھا کہ ان کا بیٹا وہاں جاکر اپنے آپ پر توجہ دینے کے بجائے خرافات میں زیادہ وقت گزارے گا ہمیشہ ہی اس کی بات کو ٹال جایا کرتے تھے۔

چنانچہ اس وقت سلمان فارس سے ملنے اس کے ساتھ ہی آیا ہوا تھا۔جس وقت سلمان فارس کے گھر پہنچا تو وہ کلب جانے کے لیے نکل رہا تھا اور اب دونوں کلب کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے جوس پیتے ہوئے باتوں میں مشغول تھے۔راستے بھر سلمان یہ سوچتا ہوا آیا تھا کہ فارس سے کس طرح اگلوائے گا کہ اس نے حماد کو اغوا کیا

ہوا ہے۔ یہ بات پوچھنا کوئی اتنا آسان نہیں تھا، اگر صاف صاف بات کی تو ظاہر ہے وہ سامنے سے مکر جائے گا ایسا جرم اگر کسی نے کیا ہو یا نہ کیا ہو کوئی بھی اقرار تو نہیں کر سکتا کہ اس نے ایسا کیا ہے۔ تو پھر کیا ترکیب ہو سکتی ہے... سوچتے سوچتے سلمان کو ایک ترکیب سمجھ میں آ ہی گئی۔

''تو آخر تم نے شرجیل کو سبق سکھا ہی دیا۔ کیا لگتا ہے اب وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے گا؟'' سلمان کی بات سن کر فارس نے ایک گہری نظر سے دیکھا اور سوچتے ہوئے بولا۔ ''یار شرجیل باز بھی آ گیا تو کیا صنوبر اس کے بعد بھی نہیں مانی تو کیا کروں گا'' اس نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا جیسے یہ سلمان کی بہن صنوبر کی نہیں کسی ایسی لڑکی کی بات ہو رہی ہے جسے وہ صرف جانتے ہیں۔ رشتا کوئی نہ ہو۔

''ہاں یہ تو ہے'' سلمان نے جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگا کر ایک گھونٹ بھرا اور اسے نگلتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر تم کیا کرو گے اب؟''

''کچھ نہیں بس ایک امید ہے کہ اگر شرجیل باز آ گیا تو شاید اس کے پاس انکار کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔'' فارس نے جس انداز سے پہلے بات کی تھی اب وہ اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جان چکا تھا اس کی حرکتوں کی وجہ سے سلمان میں بھی یہ جذبہ بیدار ہو چکا تھا کہ وہ اپنی بہن کی شادی ایک اوباش انسان سے کرنا نہیں چاہتا۔ ورنہ ابتدا میں ایسا نہیں تھا سلمان یہ سن کر کہ فارس اس کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے نہ صرف خوش ہوا تھا بلکہ وہ خود بھی اس رشتے کو کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا لیکن جب صنوبر نے اس سے بات کرنا بند کر دیا اور اس کے پاپا آصف کریم نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ صنوبر کی شادی وہیں ہو گی جہاں وہ چاہے گی تو۔ اس نے خود بھی اس مسئلے پر غور کیا کہ اگر فارس شادی کے بعد بھی ایسا ہی رہا اور نہ بدلا تو وہ کیا کرے گا۔

اس وقت تو وہ اس کا بہنوئی بن چکا ہو گا۔ اس رشتے سے تو وہ اس کا گریبان بھی نہیں پکڑ سکے گا۔ اس لیے وہ اس معاملے سے علیحدہ تو ہو گیا مگر اب بھی وہ سمجھتا تھا کہ شرجیل کے مقابلے میں خاندانی اعتبار سے فارس کا رشتا شرجیل سے بہتر تھا ہو سکتا ہے فارس خود کو تبدیل کر لے۔ عموماً لڑکے شادی کے بعد یکسر بدل بھی جاتے ہیں۔

اسی لیے جب فارس نے اس سے اپنے رویے کی معافی مانگی تو اس نے اسے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ کبھی فارس کی محفل میں چلا جائے کرے گا۔ لیکن اس کے بعد سے اسے فارس سے ملنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ آج وہ آیا بھی تو تھا تو اس کی وجہ صنوبر اور حماد بنا تھا۔ اب وہ مسلسل سوچتے ہوئے فارس سے یہ اگلوانا چاہتا تھا کہ آخر حماد کہاں ہے اسے فارس نے اغوا کیا بھی ہے یا نہیں....

''شرجیل کی جان ہمارے ایک ملازم نے بچائی تھی۔ یہ بات مجھے جہانی اور صنوبر دونوں نے ہی بتائی ہے۔ یہ بتاؤ کہ حماد کو کیسے پتا چلا کہ شرجیل کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اور یہ حادثہ کہاں پیش آیا ہے۔ وہ کیسے پہنچ گیا وہاں...'' پھر وہ ایک مصنوعی ہنسی بولتے ہوئے بولا'' مجھے تو لگتا ہے ہمارے اس ملازم کو بھی تم نے خرید لیا تھا اور اسے تم ہی نے بتایا کہ شرجیل کہاں زخمی حالت میں پڑا ہوا ہے کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''نہیں یار.... قسم لے لو یہ بات ٹھیک نہیں ہے...وہ کہاں ہے یہ بات تو مجھے بھی نہیں معلوم تھی۔ پتا نہیں وہ وہاں کیسے پہنچ گیا وہ بھی عین اسی جگہ.... جبکہ صابو بتا رہا تھا کہ اس نے تو شرجیل کو مردہ سمجھ کر ایک جھاڑی میں اس کی لاش چھپا دی تھی تاکہ اس کی لاش دیر سے ملے تو جرم کرنے والوں تک پہنچنا آسان نہ ہو۔ اس نے اپنے بچاؤ کی کوشش میں ساری احتیاط کی مگر اس سالے کی زندگی باقی تھی جو وہ بچ گیا۔'' فارس نے اپنی طرف سے سلمان کو مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

"تو تم کہہ رہے ہو حماد کو تم نے نہیں بتایا؟" سلمان نے ایک بار اور جما کر پوچھا۔
"باخدا میں نے اسے نہیں بتایا تھا۔ میں تو اسے جانتا تک نہیں تھا" فارس کو لگنے لگا سلمان یہی بات معلوم کرنے اس کے پاس آیا ہے۔
"اچھا اگر تم نے نہیں بتایا تو یہ بات تو تم نہیں جھٹلاؤ گے... اسے تم نے اغوا کر کے کہیں دور بھیج دیا ہے یا اپنے کسی ویئر ہاؤس میں چھپا کے قید کر کے رکھا ہوا ہے تا کہ اگر بات پولیس تک پہنچ جائے تو موقع کا وہ ایک ہی گواہ کسی کو کچھ بتا نہ سکے۔"
سلمان نے ایسے گھما کر بات کی فارس کو لگا جیسے سلمان صحیح کہہ رہا ہے اگر اس نے حماد کو اغوا نہیں بھی کیا تھا تو یہ اس کی غلطی ہے اسے اس لڑکے کو فوراً ٹھکانے لگا دینا چاہیے تھا۔
"تو تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔ میں نے اسے اغوا کرایا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ تمہارے گھر میں موجود نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور سلمان کے قریب آ کر بولا۔
"یقین کر سلمان وہ میرے پاس نہیں ہے لیکن اگر تجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے تو میں اسے اب اغوا ضرور کرانا چاہوں گا کیونکہ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ لڑکا میرے لیے خطرہ بن سکتا ہے"
"اچھا بس... اب تم زیادہ ناٹک مت کرو۔ سیدھی طرح بتا دو تم نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے" سلمان نے اس کے چہرے پر ایسے ہاتھ پھیرا جیسے یہ بھی ساتھ ہی کہہ دیا ہو کہ مجھ سے زیادہ ہوشیاری کی تو کچھ اچھا نہیں ہوگا۔
"اچھا تو تمہیں واقعی میری بات کا یقین نہیں ہے۔ شک ہے مجھ پر... اچھا بولو کیسے یقین آئے گا۔ کس کی قسم کھاؤں کون سا حلف اٹھاؤں کہ تمہیں یقین آ جائے۔ سچ کہتا ہوں۔ میں نے اسے اغوا کیا ہوتا یا وہ میرے پاس ہوتا تو تیرے کہنے پر میں اسے ایک منٹ نہیں لگاتا آزاد کرنے میں۔ خدا کی قسم میرے پاس نہیں ہے وہ چھوکرا۔ ویسے بھی اب تک سارے جرم کیے ہیں مگر کسی کو اغوا کرنے کا جرم کبھی نہیں کیا۔ تم تو جانتے ہو۔ یار مجھے...."
سلمان کو لگا جیسے فارس جھوٹ نہیں بول رہا۔ جس قسم کا بڑبولا فارس تھا اس سے ایسی ہی توقع کی جا سکتی تھی کیونکہ اسے اپنے باپ کی پہنچ اور دولت پر اتنا بھروسا تھا کہ اسے یقین تھا کہ اگر ایک وقت وہ قتل کے کیس میں بھی پکڑا جائے تو اس کا باپ اسے چھڑا کر لے آئے گا۔
"تو پھر وہ کہاں گیا ہوگا۔ گھر سے بھی اسی دن سے غائب ہے؟" سلمان نے بے اختیار کہا۔
"وہ کہیں بھاگ گیا ہے بھائی۔ ڈر گیا ہوگا کہ اب اگر شرجیل کے جن دشمنوں نے اس کی یہ حالت کی ہے وہ اسے چھوڑیں گے نہیں۔ بس چلا گیا...." وہ رکا ایک لمحے کو اور پھر بولا۔
"ایک نوکر ہی تو تھا یار اس کے لیے اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ نوکر تو بہت مل جاتے ہیں اس میں ایسی کیا خاص بات تھی جو تم اس کے لیے میرا بھیجا فرائی کر رہے ہو۔ اور اگر زیادہ ہی محبت ہے اس سے تو اس کے گھر جا کے پتا کر لو۔ گھر نہیں جا سکتے تو فون کر کے پتا کر لو آج کل تو سب کے پاس فون ہوتا ہے۔"
یہ سن کر سلمان کسی گہری سوچ میں چلا گیا جیسے وہ فارس کی باتوں کو تول رہا ہو۔
"کیا سوچنے لگے میرے یار اس نے کوئی تو نام و نشان بتایا ہوگا اپنا۔ وہاں سے پتا کر لو بات ختم..." اس کے بعد وہ اپنی ٹولی کے ممبران کے بارے میں روز مرہ کی باتیں کرتے رہے فارس کو خوشی تھی کہ سلمان کے ذہن میں جو شک اس کے لیے آیا تھا وہ رفع ہو چکا ہے۔ سلمان سوچ رہا تھا اگر فارس نے اسے اغوا کیا ہوتا تو وہ اسے راز کی بات کہہ کر ضرور بتا دیتا۔ ہو سکتا ہے اس کے کہنے پر اسے چھوڑ بھی دیتا۔

☆☆☆

''اس نے ضرور اسے مار دیا ہوگا۔ قتل کرنا اور کرانا اس کے لیے کیا مشکل ہے بھائی'' صنوبر کی بات سن کر سلمان کو ایک نیا جھٹکا لگا۔ اس بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ فارس یا اپنے گروپ کے کسی بھی لڑکے کے بارے میں اس طرح نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ کسی کا قتل بھی کر سکتا ہے۔

''اس نے شرجیل پر جان لیوا حملہ ہی کرایا تھا۔ اس کے خیال میں تو اس نے شرجیل کو مار ہی ڈالا تھا۔ یہ تو اللہ کی مرضی اور حماد کی وجہ سے ہوا کہ شرجیل کی جان بچ گئی'' صنوبر کو سلمان کی ایسی باتوں پر قطعی یقین نہیں آیا جو اس نے فارس کے بارے میں کہی تھیں۔

''اچھا یہ بتاؤ تم اور ماما اس کے گھر فون کر کے کیوں پتا نہیں کر لیتیں ہو سکتا ہے وہ ڈر کے اپنے گھر چلا گیا ہو۔ اس قسم کا ایکسیڈنٹ دیکھنا کسی بھی اس کی عمر کے لڑکے کے لیے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اسے ڈر لگا ہوگا' وہ کسی کو بھی بتائے بغیر بھاگ گیا ہے اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔''

سلمان کی پوری بات سن کر صنوبر سوچ میں ڈوب گئی۔

''تم چپ کیوں ہو۔ اس کے گھر فون کر کے معلوم کرنے میں کیا رکاوٹ ہے صنوبر؟'' سلمان کی آواز میں ایک ایسا دبا ہوا غصہ تھا جسے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''اس نے ہمیں کوئی نام و پتا دیا ہی نہیں۔ وہ بس یہ کہا کرتا تھا کہ اس کا تعلق پنجاب کے کسی چھوٹے سے علاقے سے ہے۔''

''کیا.............؟؟؟ تم لوگوں نے ایک ملازم کو بنا اس کا نام و پتا جانے نوکری پر رکھ کیسے لیا۔ صنوبر تم لوگ اتنی بڑی غلطی کر کیسے سکتے ہو۔ اب اگر خدانا خواستہ وہ گھر نہ پہنچا ہو اور اس کے ماں باپ اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آجائیں تو کیا جواب دو گے تم لوگ انھیں .... یہ بہت بڑی اور ناقابل معافی غلطی ہے یار''

سلمان پریشانی سے ٹہلنے لگا۔ اور صنوبر کو جیسے چپ لگ گئی اسے یقین ہونے لگا کہ سلمان سچ کہہ رہا ہے اب اگر ایسا ہوا تو وہ اور اس کی ماما کیا جواب دیں گی۔

سب سے پہلے تو خود اسے پاپا انھیں اتنا سنائیں گے کہ وہ شرم اور ندامت سے زمین میں دھنس ہی تو جائیں گی۔ یا اللہ ہماری غلطی کے لیے ہمیں معاف فرما اور ہماری طرف آنے والی کسی بھی بڑی مصیبت سے ہمیں بچا۔ دل ہی دل میں صنوبر اللہ سے دعائیں مانگنے لگی۔ سلمان مسلسل سوچ رہا تھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

رات مہیب اور تاریک تھی جیسے اکثر ہمیشہ سے کچھ زیادہ ہو جایا کرتی ہے۔ شرجیل کے بھیس میں گھسا ہوا سلمان بہت زیادہ پریشان ہو چکا تھا اس کے نام کے والدین نے اس کی ضد پوری کرنے کے بجائے اسے دلیلوں کے ساتھ یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس وقت اس کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ انھوں نے رخشی کا بھی بتایا تھا جس کے بارے میں جاننے کے بعد کہ وہ اس کے ماموں کی بیٹی ہے اسے اس کے آنے یا جانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ان حالات میں تو وہ کوئی دلچسپی لینا بھی چاہتا تو نہیں لے سکتا تھا۔ اسے تو جلد سے جلد اپنے اصل ماں باپ تک پہنچنے کی جلدی تھی اور اب اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستا نہیں بچا تھا کہ وہ چپکے سے یہاں سے چلا جائے۔ وہ جانتا تھا اس کے اس طرح جانے کے بلکہ یوں غائب ہونے کے کیا نتائج نکلیں گے، مگر اس وقت اس کے ماں باپ کی زندگی کسی بھی نتیجے سے زیادہ اہم تھی۔

وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے چلے جانا ہوگا چاہے کوئی بھی نتیجہ کیوں نہ نکلے۔ اسے صنوبر کا خیال آیا جس کی خاطر

اس نے یہ ساری مصیبت مول لی تھی۔ اس نے سوچا وہ یہ جان کر کہ میں کہیں غائب ہو گیا ہوں پتا نہیں میرے بارے میں کیا سوچے گی اس لیے کم سے کم اسے تو ضرور بتا دیتا ہوں کہ میں کچھ عرصے کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔ مگر فون کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ یہ سوچ کر رک گئے کہ وہ صنوبر سے کہے گا کیا۔ دنیا میں کوئی ایسا عذر نہیں ہو سکتا تھا جو صنوبر کو اس امر پر قائل کر لیتا کہ وہ جا رہا ہے تو اسے ضرور جانا چاہیے۔ ظاہر ہے وہ صنوبر کو سچ تو کسی بھی قیمت پر نہیں بتا سکتا تھا۔

اس لئے اس کے ہاتھ رک گئے اور وہ چاہتے ہوئے بھی صنوبر کو نہیں بتا سکا بلکہ ایک اور دکھ اسے یہ بھی جھیلنا پڑا کہ صنوبر نے کتنی ہی بار اسے فون کیا مگر وہ صنوبر کا فون بھی نہیں اٹھا سکا کیونکہ وہ جانتا تھا صنوبر سے بات کرنے کے بعد اس کا ارادہ یہاں سے جانے کا کمزور پڑ سکتا ہے اور اس وقت وہ اپنے ماں باپ کو ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا انھیں مصیبت کی اس گھڑی میں اکیلا چھوڑ دینا دنیا کی سب سے بڑی کمینگی اور بے وفائی تھی اس لیے اس نے یہاں سے جانے کا ارادہ کر لیا مگر وہ چاہتا تھا۔ جن کی طرح غائب ہونے کے بجائے اسے ایسے یہاں سے جانا چاہیے جیسے وہ رات کے اندھیرے میں کہیں چلا گیا ہے۔

یہ سوچ کر وہ رات کے کوئی دو بجے اپنے کمرے سے نکلا اور راہداری سے ہوتا ہوا ایک داخلی دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ قریب ہی اس نے اپنی ماں کی آواز سنی وہ اس کے باپ سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ ایک دم سے ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کا مطلب ہے شرجیل کے ماں باپ اب تک جاگ رہے تھے۔ وہ اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور ان کی باتوں میں کسی رخشی کا بھی ذکر تھا۔ لیکن اس وقت سلمان کو ان سب باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ جلد سے جلد اپنے ماں باپ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے جائزہ لیا کہ اس دیوار سے کسی شرجیل جیسے لڑکے کے لیے کودنا کس قدر مشکل ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے تو بند دروازوں سے نکلنا بھی کوئی دشوار بات نہیں تھی لیکن یہاں سے وہ عین اس طرح جانا چاہتا تھا کہ انھیں لگے کہ شرجیل کہیں چلا گیا ہے تاکہ جب وہ لوٹ کر آئے تو اسے آسانی سے پھر سے اس گھر میں پناہ مل جائے۔

یہ سوچ کر اس نے ایک اور راستے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اور اپنی سوچوں کے بہاؤ میں وہ وہاں سے نکل بھی گیا پھر اس نے رک کر جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہ ایک لوہے کا جالی دار دروازہ تھا اور اس میں اندر کی طرف تالا لگا ہوا تھا یعنی شرجیل اس تالے کو کھولے بغیر اس دروازے سے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ واپس دروازے کے دوسری طرف چلا گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔ شرجیل ہوتا تو کیا کرتا۔ ظاہر ہے وہ تالا کھول کر ہی جا سکتا تھا۔ لیکن تالے کی چابی کہاں سے لائے۔ کس کے پاس ہو سکتی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے آنکھیں بند کیں اور اِدھر اُدھر سب طرف تلاش کیا تو اس نے دیکھا کہ ایک معمولی سے کمرے میں پلنگ پر لیٹے ہوئے ایک آدمی کے قریب رکھی ہوئی میز پر کچھ چابیاں رکھی ہوئی تھیں۔

یہ عبدل تھا گھر کا ملازم.... پھر اس نے یہ جائزہ لیا کہ عبدل کا کے اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند تو نہیں ہے۔ عبدل اس گھر کا نوکر تھا اور یہ اس کا رہائشی کمرا تھا۔ اس کا مطلب ہے عبدل چوبیس گھنٹے کا ملازم ہے اور گھر کے جن جن حصوں تالا لگانا پڑتا ہے وہ عبدل ہی لگاتا ہے۔ اسی لیے چابیوں کا ایک بنچ عبدل کے قریب رکھی ہوئی میز پر رکھا ہوا تھا۔ سلمان نے دل سے دعا مانگی کہ کاش عبدل کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہ ہو ورنہ اس کے لیے عبدل کو نیند سے جگانا ضروری ہو جائے گا اور پتا نہیں ایسا کرنے سے عبدل اس کا ساتھ دے گا یا نہیں۔ اسے یقین تھا عبدل اسے مانگنے سے چابیاں دینے سے پہلے سو سوال کرے گا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ عبدل کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہو اور وہ چابیاں لے کر خاموشی سے یہاں سے نکل جائے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا اس کی دعا قبول نہیں ہوسکی عبدل کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے اسی منظر کی رہنمائی میں عبدل کے کمرے کی طرف چلنا شروع کر دیا لیکن یہ کیا...... ابھی اس نے چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ اس کے راستے میں پھر ایک گھیر دار دالان آ گیا جس کی چھت پر بہت اچھی گرافکس کا کام ہوا ہوا تھا اور دالان ایسا لگتا تھا جیسے کسی مسجد کے گنبد کے عین نیچے کی جگہ ہو اس نے دیکھا کہ اس دالان کا دروازہ ایک بڑے سے لان میں کھلتا تھا اور شاید اسی لان سے گزر کر گھر کے ایک دوسرے حصے میں عبدل کا کمرا تھا۔ اب کیا کیا جائے اسے یہ دروازہ بھی شرجیل کے مطابق چابی سے ہی کھولنا چاہیے تھا۔ کچھ دیر وہ وہیں رک کر سوچتا رہا کہ کیا کروں.... کیا کروں.... پھر ایک اچھوتا خیال اس کے ذہن میں کوندا اس نے سوچا کہ کم سے کم ایک دروازے کے بارے میں تو یہ سوچا ہی جاسکتا ہے کہ عبدل اس ایک دروازے کا تالا لگانا بھول سکتا ہے چنانچہ اس نے اس دروازے سے اپنے جن والی صلاحیت کے تحت نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور وہ آناً فاناً دروازے کے دوسری طرف چلا گیا اور اب اس کے قدم عبدل کے کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ عبدل کے کمرے کے قریب پہنچتا اس نے دیکھا.... یہ کیا اس لان کا اختتام تو داخلی دروازے کے قریب ہی ہو رہا تھا اور اس کے پاس ہی گارڈ کے لیے ایک چھوٹی سی چوکی نما عمارت بنی ہوئی تھی جس میں یقیناً اس وقت گارڈ موجود ہوگا۔ اب اس کا ذہن اس رخ پر سوچنے لگا کہ گھر کے رہائشی حصے سے کسی بھی ایک دروازے سے نکلا جائے تو باقی حصوں کے تالے کھولنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جیسے ہی وہ ایک حصے سے باہر نکلا تو خود بخود وہ باہر آ گیا تھا اور لان سے چونکہ مین گیٹ کچھ زیادہ ہی قریب تھا اس لیے آسانی سے نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے سے جس کی چابی لینے وہ عبدل کے کمرے کی طرف جا رہا تھا اگر اس دروازے کا تالا کھولا جائے تو وہاں سے بھی رہائشی حصے سے باہر آیا جاسکتا ہے۔

لیکن کچھ طویل گزرگاہ اور کار پورچ وغیرہ سے گزرنے کے بعد اور یہ راستا جب اس نے اندر کے کوریڈور سے پاس کر لیا تو وہ ایک ایسے ہی دروازے کے پاس پہنچا جس میں تالا لگا ہوا تھا اور یہ غالباً واحد دروازہ تھا جس میں باہر کی طرف سے تالا لگا ہوا تھا یعنی عبدل اندر کے سارے دروازوں کو بند کرنے کے بعد اس لان والے دروازے کو بند کرتا ہے اور اس کے بعد وہ لان کی طرف سے عمارت کے پیچھے بنے ہوئے اپنے کوارٹر میں چلا جاتا ہے۔

سلمان کی سوچوں میں ایک قسم کی بے چینی محسوس ہونے لگی اس کا تو مطلب یہ ہے کہ عبدل کوئی بھی دروازہ بند کرنا بھول سکتا ہے لیکن اس دروازے کو بند کرنا نہیں بھول سکتا کیونکہ یہ واحد دروازہ ہے جس کا لوک باہر کی طرف سے لگانا پڑتا ہے۔ اب اس کو یہ سوچنا تھا کہ شرجیل یہاں سے کیسے نکل سکتا ہے۔ اس طرح اس دروازے کو کھلا سمجھنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس نے سوچا یعنی اسے عبدل کے کمرے میں جا کر وہ چابیاں لازمی لانا ہوں گی...

ایسا کرنے سے بھی ایک سوال سر اٹھا رہا تھا کہ شرجیل عبدل کے کوارٹر تک کیسے پہنچ سکتا ہے کیونکہ عبدل کے کوارٹر تک جانے کا جانے جو بھی راستہ اختیار کیا جائے یہ ضروری ہے کہ عبدل نے کوئی ایک دروازہ لازمی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ تب ہی یہ سمجھا جائے گا کہ شرجیل گھر سے فرار ہو گیا ہے جو ایسا نہ کیا تو شرجیل کا گھر سے نکلنا ایک معمہ بن جائے گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ صنوبر کے گھر کی طرح یہاں بھی اس قسم کے سوالات کے بارے میں سوچا جائے۔ ہر طرف سے مشکلات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

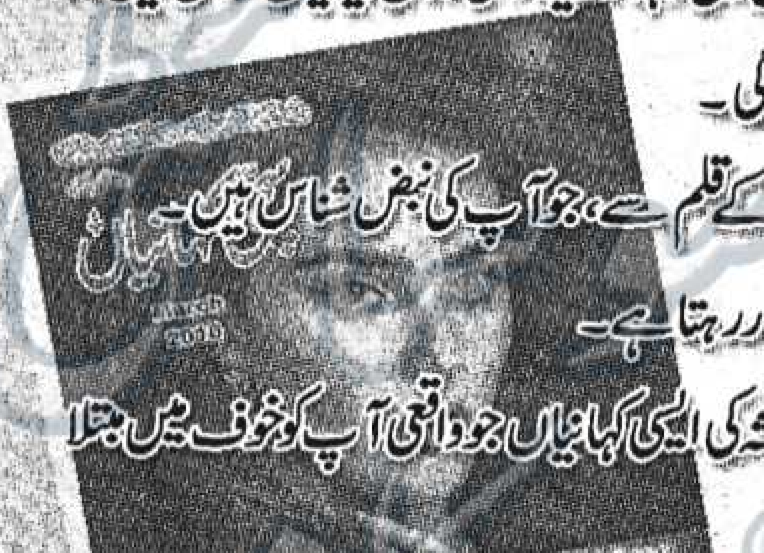
سوچتے سوچتے اسے پھر ایک اور راہ سجھائی دی اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے کمرے میں ایک ایسا انٹر کام لگا ہوا تھا جو عبدل کے کوارٹر میں بھی بجتا تھا۔ اس نے اپنی اس آخری ترکیب کے مطابق

پراسرار کہانی نمبر 2

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔



آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

عبدل کو انٹر کام کیا۔ وہ سو رہا تھا شاید گہری نیند اور عموماً ایسا نہیں ہوتا تھا کہ عبدل کے اپنے کوارٹر میں چلے جانے کے بعد کوئی اسے کسی کام سے بلاتا ہو۔ لیکن انٹر کام کا ہونا بتا رہا تھا کہ اسے بہر حال بلایا تو جا سکتا ہے۔ اس لیے کئی بار کی کوشش کے بعد جب اسے عبدل کی نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تو اس نے عبدل سے کہا کہ اسے اس وقت کوفی کی طلب ہو رہی ہے۔ اسے ایک کپ کوفی چاہیے۔

کوئی اور موقع ہوتا تو عبدل کا اس طرح نیند سے اٹھا کر کوفی مانگنے پر موڈ خراب ہو جاتا لیکن اسے بھی یہ بات معلوم تھی کہ شرجیل بابا کو موت کے منہ سے واپس لایا گیا ہے اور ان کی طبیعت خراب ہے اس لئے وہ کسی بھی وقت کچھ بھی مانگ سکتے ہیں ورنہ جب وہ تندرست تھے تو انھوں نے کبھی اسے اس طرح نیند سے نہیں جگایا تھا۔ کوفی یا چائے تو وہ خود بھی بنا لیا کرتے تھے اب ایسا انھوں نے نہیں کیا تو یہ ان کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تھا۔ اس لیے وہ اچھے موڈ سے اٹھا اور اپنے کوارٹر سے نکل کر رہائشی حصے میں بنے ہوئے کچن کی طرف خراماں خراماں چل دیا۔ سلمان نے اندازے سے سوچا کہ اس وقت عبدل کہاں ہوگا کہاں پہنچا ہوگا۔ اسے پورا یقین تھا کہ عبدل نے اس وقت لان والے دروازے سے اندر آتے ہوئے اسے اندر سے بند کرنا غیر ضروری سمجھا ہوگا کیونکہ کچھ ہی دیر بعد تو اسے واپس اپنے کوارٹر میں چلے جانا ہے اور جاتے ہوئے پھر باہر سے ہی تالا لگانا ہوگا تو بار بار تالا لگانے کی مشقت سے عبدل کی جگہ کوئی بھی ہوتا وہ بچنا چاہتا ایسا ہی عبدل نے بھی کیا۔

سلمان ایک لمحے میں اس لان میں کھلنے والے گھیر دار دالان میں پہنچا اس نے دیکھا کہ دروازہ نہ صرف کھلا ہوا تھا بلکہ اس دروازے کے تالے میں باقی سارے گھر کے دروازوں کی چابیوں کا گچھا بھی لٹکا ہوا تھا۔ اب سلمان کو کسی بھی چابی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے تو باہر نکلنے اور تالا کھلا ملنے تک کا موقع ہی درکار تھا جو اسے مل چکا تھا۔ وہ جلدی سے لان سے گزر کر وہ بھی اس طرح کہ وہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا گارڈ کی چوکی تک پہنچا گارڈ ایک اونچے اسٹول پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔

سلمان نے اسے چند لمحوں کے لیے بے ہوش کیا اور مین گیٹ کی چابیاں اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا جو اسے کہیں بھی نہیں ملیں تو اسے کچھ مایوسی ہوئی کہ اب اگر اس گیٹ کی چابیاں بھی مسئلہ بن گئیں تو وہ کیسے یہاں سے نکلے گا۔ اور اگر اسے یہاں سے نکلنے میں دیر ہوئی۔ عبدل اس کی کوفی لے کر اس کے کمرے میں پہنچ گیا تو اسے نہ پا کر اس کے بارے میں شور مچا دے گا اور پھر سارے مکین جاگ جائیں گے ویسے بھی اس کے ماں باپ پتا نہیں کیوں اتنی رات تک جاگ رہے تھے۔ یہ بات سلمان کو نہیں معلوم تھی کہ صبح کے چار بجے کے لگ بھگ رخشی کی فلائٹ تھی اور اس وقت چار بجنے ہی والے تھے اس لیے شرجیل کے ماں باپ جاگ رہے تھے۔ تاکہ وہ رخشی کا استقبال کر سکیں۔

بدقسمتی سے رخشی کو یہی فلائٹ خالی ملی اور اسے اپنی پھوپو شرجیل کی ماں کے کہنے کے مطابق جو بھی پہلی فلائٹ ملے اسے پکڑ کر کراچی پاکستان پہنچنا تھا۔ ایسا رخسانہ نے اس لیے بھی کیا تھا کہ اگر دیر ہوگئی اور شرجیل نے گھر سے باہر جانا آنا شروع کر دیا تو پھر اس کی صنوبر کی ملاقاتوں میں دونوں میں نئے عہد و پیمان شروع ہو جائیں گے اور اس طرح شرجیل صنوبر سے خود کو الگ نہیں کر سکے گا۔ اسی لیے رخشی کا فوری طور پر بھاگی چلی آ رہی تھی۔

سلمان کو جب چابیاں نہیں ملیں تو ایک جھماکہ سا اس کے ذہن میں ہوا اور گھیر دار دالان والے گیٹ کا منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا جہاں عبدل نے چابیوں کا گچھا لٹکا ہوا چھوڑ دیا تھا۔ وہ لمحے سے پیشتر مین گیٹ کے پاس پہنچا تو اس کا اندازہ درست نکلا مین گیٹ کی چابی بھی گارڈ کی کی چین میں تالے سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے

جلدی سے دروازہ کھولا اور باہر کی طرف رینگ گیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ گیٹ کے باہر رینگ گیا۔ اس کے بعد تو جیسے اسے پر لگ گئے۔ اب اسے کسی کا بھی پکڑ لینا آسان نہیں تھا۔ وہ سب انسانوں کی پہنچ سے دور جا چکا تھا۔

عبدل کوفی بنا کر ٹرے میں رکھ کر جب شرجیل کے کمرے کے پاس پہنچا تو دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ عبدل سمجھا شاید اندر سے بند ہے اس لیے اس نے دو چار مرتبہ آوازیں دیں اور جب اندر سے شرجیل کے متحرک ہونے کا کوئی نشان نہیں ملا تو عبدل نے سمجھا کہ شاید شرجیل بابا کوفی کا آرڈر دینے کے بعد سو گئے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ کوفی سمیت واپس جانے لگا پھر ایک خیال نے اسے روک لیا کہ اگر شرجیل بابا کی آنکھ اس کے جاتے ہی کھل گئی تو اسے پھر اتنی دور اپنے کوارٹر سے واپس آنا ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے اس وسوسے میں اس کی رات کی ساری نیند ہی خراب ہو جائے کہ اب شرجیل کا انٹر کام بجے گا اور اسے جانا ہوگا۔

اس خیال کے بعد اس نے واپس شرجیل کے دروازے کے پاس خود کو پایا اور اس بار اس نے دستک بھی دی۔ جب کئی دستکوں کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تو اسے خود ایک قسم کی تشویش نے پریشان کر دیا اس نے تھوڑی سی ہمت کی اور دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ عبدل نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں شرجیل کو آوازیں دیتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ لیکن یہ کیا...... لق ودق جیسا یہ کمرا جس کے ایک کونے میں شرجیل کا بیڈ تھا اور درمیان میں ایک میز اور صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا اور ساتھ ہی کمپیوٹر لیپ ٹاپ اور جانے کیا الا بلا دھری ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی رنگوں کی ایک پوری برسات سی وہاں موجود تھی عبدل کو بھی معلوم تھا کہ شرجیل تصویریں بناتا ہے لیکن اس کا اسٹوڈیو اور رہائشی کمرا الگ الگ تھے تاہم اس کے سونے کے کمرے سے یہ ضرور پتا چلتا تھا کہ یہاں ایک تصویر ساز کا بسیرا ہے۔ تاہم جب سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تب سے کوئی تصویر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی اس لیے کمرا کافی ستھرا نظر آرہا تھا۔

البتہ کچھ میگزینز اور اخبارات ایک طرف کو سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ عبدل کو یہ دیکھ کر بھی حیرانی ہوئی کہ کمرے کی لائٹ جل رہی تھی جس کی روشنی میں کمرے کی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی لیکن شرجیل خود غائب تھا۔ عبدل نے سوچا ضرور باتھ روم میں ہوں گے اس نے کچھ دیر کوفی وہیں ایک تپائی پر رکھ کر شرجیل کے باتھ روم سے نکلنے کا انتظار کیا جب کافی دیر ہو گئی اور شرجیل باتھ روم سے بھی باہر نہیں نکلا تو عبدل کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے باتھ روم کا دروازہ بجایا اور بہت ہولے سے شرجیل بابا کہہ کر اسے پکارا مگر وہاں کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ عبدل نے آہستگی سے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر گھمایا اور یہ دیکھ اس کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں کہ باتھ روم میں کوئی نہیں تھا۔

”یا میرے خدا! یہ شرجیل بابا کہاں چلے گئے۔“ اس کے منہ سے نکلا اور واپسی کے لیے کمرے سے باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ اس نے سرفراز ملک اور رخسانہ کے کمرے پر پہنچ کر بدحواسی میں ان کے کمرے کا دروازہ اس زور سے دھڑ دھڑایا کہ وہ دونوں اندر ایک دم خوف سے لرز کر رہ گئے جیسے گھر میں ڈاکو گھس آئے ہوں یا پھر ضرور زلزلے کے جھٹکے ہیں جن کی وجہ سے عبدل اور گھر کے باقی لوگ خوفزدہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں اور اب انھیں خبردار کرنے آئے ہیں۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا طوفان تو تھا مگر یہ اس طوفان سے مختلف تھا جو بڑے بڑے آشیانوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ یہاں صرف سرفراز ملک کا گھر ہی اس کی زد میں آیا تھا۔

بڑی مشکل سے روتے ہوئے عبدل نے انھیں ساری روئداد سنائی۔ سرفراز ملک نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شرجیل کے کمرے کی طرف تیز تیز چلنا شروع کر دیا جیسے وہ چل نہیں رہے بلکہ دوڑ رہے

ہوں۔ ان کے پیچھے پیچھے بیگم سرفراز اور ان کے پیچھے عبدل چل رہا تھا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد جب شرجیل کا کوئی نام نشان نہیں ملا تو سرفراز ملک نے جلدی سے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

گارڈ ابھی تک بے ہوشی سے پوری طرح نکلا نہیں تھا وہ دھیرے دھیرے اس غفلت سے نکل رہا تھا کہ اسے لگا کسی نے پکڑ کے اسے جھنجوڑ ڈالا ہے وہ فوراً ہی جاگ گیا اپنے سامنے گھر کے مالک کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ الرٹ کھڑا ہو گیا۔

''حکم جناب......'' اس کے منہ سے عادتاً نکلا۔

''حکم جناب کے بچے تم یہاں بیٹھے سو رہے ہو۔ یہ بتاؤ شرجیل بابا کہاں ہیں۔ کیا تم نے انھیں یہاں سے باہر جاتے دیکھا تھا؟''

سرفراز نے غصے سے کھولتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی بڑی بات' کوئی بڑا واقعہ رونما ہو چکا ہے۔

''نہیں صاحب یہاں سے کوئی باہر نہیں گیا''

''تم تو بیٹھے سو رہے تھے تمہیں کیا پتا کوئی گیا ہے یا نہیں.....!'' سرفراز ملک غصے اور وحشت کے مارے ایک جگہ کھڑے ہو کر بات نہیں کر پا رہے تھے وہ ادھر ادھر آتے جاتے بول رہے تھے۔

''لیکن صاحب گیٹ کو تو تالا لگا ہوا ہے کوئی اِدھر سے کیسے جا سکتا ہے اور چابی....''

یہ کہہ کر اس نے اپنے چابی لٹکانے والے ہولڈر پر ہاتھ مارا اور اس کا ہاتھ خالی واپس آ گیا وہ جلدی سے گیٹ کے پاس پہنچا جہاں چابیوں کا گچھا اور کھلا ہوا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ شدت سے بدحواس ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کہے ثابت ہو چکا تھا یہ سب اس کی غفلت سے ہوا تھا۔ شرجیل اسے سوتا دیکھ کر تالا کھول کر کہیں چلا گیا تھا۔ مگر کیوں اور کہاں چلا گیا تھا۔

ان سوالوں کے جواب کسی کے پاس نہیں تھے سرفراز ملک پر ساری حقیقت عیاں ہو چکی تھی اور اب انھیں رہ رہ کر گارڈ کی غفلت اور کام چوری پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ بتانے کی تو اب ضرورت نہیں رہ گئی تھی کہ صبح ہوتے ہی سرفراز ملک اس گارڈ کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

وہ جلدی سے گیٹ کے باہر نکلے اور رات کے سناٹے میں دور دور تک دیکھنے کے بعد بھی انھیں کہیں کچھ دکھائی نہیں دیا سوائے نیند سے جھکے ہوئے رنگ برنگ اور الگ الگ طرز تعمیر کے ساتھ ایستادہ مکانوں کے۔ سڑک بھی ایسے خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی جیسے وہ بھی نیند کے مزے لے رہی ہے۔ سارا عالم سو رہا ہے لیکن ان کی نیند اڑ چکی ہے ان کا اکلوتا بیمار بیٹا کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر کہیں جا چکا تھا۔

وہ گھر میں واپس آئے تو ان کی بیگم بھی وہاں پہنچ چکی تھیں اور عبدل بھی سب کے چہروں پر سوالوں کی ایک پوری فوج مورچہ لگا چکی تھی اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا عجیب و غریب بات ہوئی تھی۔ سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ شرجیل کو اس طرح چوروں کی طرح اپنے ہی گھر سے جانے کی کیا ضرورت تھی.....؟؟؟

☆☆☆

سلمان ختم ہوتی ہوئی رات کے آخری پہر اپنی وادی میں پہنچا اور اس نے اپنے گھر کے پاس پہنچ کر اپنی ماں کو آواز دی۔ وہ غار کے باہر دیکھ چکا تھا کیلاش نے پہرے بٹھائے ہوئے تھے۔ وہ سب کی نظروں سے بچتا ہوا اپنے غار میں داخل ہوا اور دھیرے سے اپنی ماں کو پکارا۔ اس کا باپ شاید گھر میں موجود نہیں تھا لیکن ماں موجود تھی اور جاگ رہی تھی اس نے سلمان کی آواز کو پہچانتے ہوئے وارفتگی میں غار میں بنے ہوئے اپنے کمرے سے

نکل کر دیکھا تو خوشی اس کی آنکھوں کی روشنی تیز ہو کر ایسے تھرتھرانے لگی جیسے اس میں تاب نہیں تھی کہ وہ اتنے والہانہ والے جذبات کو سہار سکتی ہو۔

''سلمان میرے بچے تم آ گئے''

وہ سلمان سے ایسے چمٹی جیسے کسی پھانسی کے مجرم کو اچانک کوئی اس کا اپنا آ کر خبر دے کہ اس کی پھانسی کی سزا ایک معجزے کی طرح معاف کر دی گئی ہے۔ نئی زندگی ملے تو کوئی بھی ذی نفس ایسے ہی والہانہ ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ وہ دیر تک سلمان کے ساتھ چمٹ کر روتی رہی سلمان اسے تسلیاں دیتا رہا۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی کہ تم کہاں چلے گئے تھے۔ تمہارے بابا تو تمہیں تمہارے مدرسے میں بھی دیکھ کر آ چکے تھے۔ وہ پھر جانا چاہتے تھے لیکن انھیں موقع نہیں ملا۔

''موقع نہیں ملا کیا مطلب ہے اس بات کا ماں!''

حیرت میں ڈوبے ہوئے اس سوال کو سن کر سلمان کی ماں چپ ہو گئی۔ ''میں کچھ پوچھ رہا ہوں ماں بابا کہاں ہیں اور ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' کچھ دیر تک سلمان کی ماں خاموش رہی پھر اس نے سلمان سے ناشتا کرنے کا پوچھا سلمان نے ماں کے ہر سوال کے جواب میں ایک ہی بات کہی کہ یہ سب چھوڑو ماں مجھے جلدی سے بابا کے بارے میں بتاؤ۔

تب اس کی ماں نے بتایا کہ سردار کے آدمی تمہارے بابا کو اٹھا کر لے گئے ہیں اور انھیں قید کر دیا گیا ہے۔''

''لیکن کیوں ماں بابا نے کیا پاپ کیا تھا؟'' سلمان کی بے چینی اور پریشانی آسمان سے لگ رہی تھی۔

''وہ کہتے تھے کہ ہم تمہارے بارے میں جھوٹ بولتے ہیں۔ ہم نے تمہیں کسی ایسے کام پر لگایا ہوا ہے جس کی جنات کے قوانین میں ممانعت ہے اس لیے ہمیں بتانا ہوگا کہ تم کہاں ہو اور کیا کرنے گئے ہو۔ ہم نے تمہارے ماموں والی بات کہی تو وہ تمہارے بابا کو لے کر تمہارے ماموں کے گھر گئے۔ تمہارے ماموں کو حضرت سلیمانؑ کی قسم دے کر سچ بولنے کو کہا گیا تو انھوں نے سب سچ بتا دیا کہ تم ان کے پاس آئے تھے مگر رکے نہیں تھے۔ تمہارے بابا کا یہ راز کھل گیا تھا کہ ہم نے مجلس سے جھوٹ بولا ہے اور جب جھوٹ بولا ہے تو ان کا خیال ہے کہ ہم کوئی خلاف ضابطہ کام کر وار ہے ہیں تم سے انھوں نے تمہارے بابا کو صرف ایک ہفتے کا ٹائم دیا کہ ایک ہفتے میں انھوں نے تمہیں مجلس کے سامنے روبرو نہیں کیا تو وہ تمہارے بابا کو سخت سے سخت سزا دیں گے اور تمہیں بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ تمہارے بابا اس ڈر سے صرف ایک بار ہی تمہارے مدرسے گئے تھے کہ کہیں ان کا پیچھا کر کے تمہارے ٹھکانے کا پتا نہ معلوم کر لیں۔ تم وہاں نہیں ملے اور ہم سمجھ گئے کہ تم اس انسان لڑکی کے چکر میں کہیں گھوم رہے ہو۔ تب ایک ہفتہ پورا ہونے پر مجلس کے ہرکارے تمہارے بابا کو پکڑ کر لے گئے۔''

ماں کی پوری بات سن کر سلمان کی پیشانی پر فکر و اندیشوں کی لکیریں گہری ہونے لگیں اور وہ مسلسل یہ سوچ چلا گیا کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا کوئی عذر، کوئی بہانہ اب اس کے کام نہیں آئے گا اور وہ اس سے بھی حضرت سلیمانؑ کی قسم دے کر سچ جاننے کی کوشش کریں گے۔ اصولوں پر زندگیاں گزارنے والے سب ہی جنات کے لیے حضرت سلیمانؑ کی قسم ایک ایسا درجہ رکھتی تھی کہ جان چلی جائے پر کوئی بھی حضرت سلیمانؑ کی قسم جھوٹی نہیں کھا سکتا تھا۔

''اب تم کیا کرو گے بیٹا... انھوں نے ہمارے گھر کے باہر پہرے لگائے ہوئے ہیں۔ تم گھر میں کیسے آئے انھیں پتا چلا تو وہ تمہیں بھی.... '' اتنا کہہ کر سلمان کی ماں جیسے روہانسی ہو گئی اور اس کی آواز رک سی گئی۔

''تم فکر مت کرو ماں انھیں پتا نہیں چل سکا کہ میں گھر میں آیا ہوں۔'' ماں نے ایک نظر اپنے لاڈلے کی

طرف دیکھا اور بولی۔

"تم نے بتایا نہیں اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔ کیا مجلس کے سامنے پیش ہو کر اپنے جرم کا قرار کرو گے۔ یا....؟" وہ جانتی تھی کہ دوسری کوئی اور صورت ابراہیم کی رہائی کی ممکن نہیں تھی بلکہ جب انھیں یہ پتا چلے گا کہ سلمان کے جرم میں ماں باپ بھی برابر سے شریک تھے تو انھیں بھی کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملے گی۔

مجلس کے قوانین بڑے سخت تھے اور سزاؤں پر لازمی عمل درآمد ہوتا تھا۔ معافی کسی کو نہیں دی جاتی تھی تا کہ پھر کوئی کسی بھی قسم کے جرم کا مرتکب نہ ہو اور سلمان کا جرم تو اتنا انوکھا تھا کہ اسے شاید عمر قید کی سزا ہو سکتی تھی۔

"ایک بات بتاؤ ماں... کیا بابا یہاں سے بھاگ نکلنے اور بستی چھوڑنے پر راضی ہو جائیں گے؟؟؟" سوال کیا تھا۔ کوئی تیر تھا جو سیدھا زلیخاں کے سینے میں جا کر لگا۔

"تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو بیٹا! بھاگ کر ہم کہاں جائیں گے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہوئے کہ بھاگے ہوئے جنات کو کائنات میں کہیں کوئی پناہ نہیں دیتا یہ بات جنات برادری کے اصولوں کے خلاف ہے۔"

"تم جانتی ہو ماں... میں یہاں نہیں رہ سکتا اور نہ ہی مجلس کے قوانین کے مطابق سزا کاٹ سکتا ہوں، مجھے یہاں سے جانا ہوگا اور اس بار میں سوچ کر آیا ہوں کہ تم دونوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو سلمان.... کیا تم نہیں جانتے سردار کے ہرکارے ہمیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہم کہیں نہیں چھپ سکتے، کہیں نہیں رہ سکتے اور تمہارے بابا...... وہ تو ان کی قید میں ہیں ان کا یہاں سے جانا ممکن نہیں ہوگا" وہ ایسے بول رہی تھی جیسے بیٹے کی انوکھی فرمائش پر اسے سمجھا رہی ہو۔

"میری بات سمجھو ماں، ہمیں ایسا کرنا ہی ہوگا۔ میرا یقین کرو میں ہم یہاں سے جا کر بھی کہیں اور رہ سکتے ہیں" سلمان نے ماں کو بازوؤں سے پکڑ کر سمجھایا۔

"مگر کہاں بیٹے... کہاں کوئی قبیلہ ہمیں پناہ دینے کی بھول نہیں کر سکتا۔ یہ جن جاتی کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے اور ایسا کرنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔" وہ اس سے زیادہ سوچ ہی نہیں رہی تھی۔

"ایسا مت کہو ماں کتنے ہی جنات ہیں جو انسانوں کی بستی میں رہا کرتے ہیں" سلمان نے ایسے کہا جیسے یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔

"انسانوں کی بستی میں..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا.. یہ تو پاپ ہے اور ہم یہ پاپ کیسے کر سکتے ہیں۔ تمہارے بابا کہا کرتے ہیں کہ جو جن انسانوں کی بستی میں رہتے ہیں وہ سب راندۂ درگاہ ہیں انھیں کوئی قبول نہیں کرتا حتیٰ کہ ان کے اپنے سگے سمبندھی بھی ان سے رشتہ ناتا توڑ چکے ہیں اور انھیں انسان بھی اپنے ساتھ نہیں رکھتے وہ برے برے کام کر کے جادو کرنے والوں کا ساتھ دے کر ایک حرام کی سی زندگی جیا کرتے ہیں۔"

"یہ سب چھوڑو ماں بس تم میرے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔ سمجھو تمھیں سب کچھ بھول کر میرے لیے یہ کرنا ہی ہوگا۔ گناہ ثواب کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دو اور یہاں سے چلو...." سلمان نے ایسے حتمی انداز سے کہا زلیخاں کو لگا اب اس مسئلے پر کوئی اور بحث کرنا بے کار ہے۔ وہ چپ ہو گئی اور غار کے سناٹے میں کافی دیر تک ایک ایسی مہیب لہر گھومتی رہی جیسے یہاں کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔

رات ختم ہو رہی تھی صبح کا سورج نکلنے کی تیاری شروع کر چکا تھا جانے کتنے ہی دواروں میں تو نکل بھی چکا تھا۔ بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد زلیخاں نے بڑے ہی دھیمے اور مایوس کن لہجے میں کہا۔

"کیا اپنے بابا کو یہیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

سلمان نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے لگا کہ اس کی ماں کافی حد تک اس کے ساتھ جانے پر

تیار ہو چکی ہے بس اسے اگر کوئی فکر ہے تو ابراہیم کی کہ اس کے بعد ابراہیم کا کیا ہوگا ؟؟؟

"نہیں....ہم بابا کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے" سلمان نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو... بابا کو کیسے ساتھ لے کر جاؤ گے۔ جانتے نہیں سردار کی قید سے کسی کو چھڑانا کتنا مشکل ہے اور وہ چھوڑے گا بھی کیوں... یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں...... بیٹا"

"میں بابا کو ایسے نہیں چھڑاؤں گا جیسے تم سمجھ رہی ہو ماں"

"تو..........؟؟؟"

ایک تُو تھی جس نے زلیخاں کے سارے وجود کو لرزا کے رکھ دیا تھا۔

"میں بابا کو سردار کی قید سے فرار کراؤں گا" سلمان نے ایسا کہتے ہوئے ماں کی آنکھوں میں دیکھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو میرے لعل یہ تو ناممکن ہے" زلیخاں کی جیسے گھگھی بندھنے لگی۔

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے ماں...میں یہ کر دکھاؤں گا" سلمان کے ارادے کو زلیخاں اس کے وجود میں جرأت سے کھڑا ہوتے اور جنگ آمد دیکھ رہی تھی۔

"یہ بغاوت سمجھی جائے گی....اور اس کی سزا...." وہ ایسے بولی جیسے بیٹے کو ڈرا رہی ہو۔

"جانتا ہوں اس کی سزا موت ہے وہ بھی اذیت بھری موت......!!!"

"پتا نہیں تم کیا کرنے والے ہو۔لیکن اگر اس کے علاوہ کوئی اور راستہ باقی نہیں ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں بیٹا" یہ سنتے ہی مارے جوش کے سلمان نے ماں کو گلے لگا لیا۔

"بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیے ماں سمجھ ہم نے بابا کو آزاد کرا لیا۔بس یہ سمجھو لو اس مشن میں تم بھی میرے ساتھ چلو گی ہم مل کر بابا کو رہا کرائیں گے"

زلیخاں نے بیٹے کے کاندھے پر ایسے ہاتھ رکھا جیسے اس کی جرات بڑھا رہی ہو...پھر وہ سوچنے لگی کہ اب جو بھی ہو اسے اپنے بیٹے کا ساتھ دینا ہے۔اسے اپنے بیٹے سے زیادہ دنیا میں کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی ہنسی کھیل کی بات نہیں ہے بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے۔اگر پکڑے گئے تو سردار بڑی اذیت کے ساتھ موت کے منہ میں دھکیلے گا۔لیکن اب جب فیصلہ کر ہی لیا ہے تو موت سے کیا ڈرنا۔یہ سوچ کر وہ اندر گئی اور بیٹے کے لیے دودھ لے کر آئی۔سلمان نے دودھ پی کر ماں کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا کر اسے یہ پیغام دے رہی تھی کہ انشا اللہ جیت ہماری ہی ہوگی....

دن کے اجالے میں سلمان کا پکڑے جانا لازمی تھا اس لیے وہ بستی سے کافی دور جا کے روپوش ہو گیا۔دو جنات کا ایک گروپ ہر روز زلیخاں کے گھر میں سلمان کو تلاش کرنے آیا کرتا تھا ورنہ شاید سلمان رات ہونے تک اپنی ہی غار میں چھپا رہتا۔پہرے دار آئے اور پہلے کی طرح خالی ہاتھ واپس چلے گئے۔انھیں شبہ ہوا یا نہیں مگر وہ زلیخاں سے کچھ بھی پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکے کیونکہ زلیخاں اب ان کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے انھیں کھری کھری سنایا کرتی تھی اس لیے وہ بنا کچھ کہے خاموشی سے ادھر ادھر دیکھ کر چلے گئے۔

رات کو سلمان واپس آیا اور دونوں ماں بیٹے رات کی تاریکی کا سہارا لے کر غار سے نکلے۔ابھی انھوں نے چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا تھا انھیں اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی...

"تم جا رہے ہو!!!"

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ مئی میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو کہ ایک آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

II 88-C خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیزو!

سب سے پہلے رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ مبارک ہو۔ بہت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں یہ ماہ مبارک صحت وتندرستی اور مکمل ایمان کے ساتھ نصیب ہوا۔ میں اپنے تمام بچوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو میری آواز پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے مسلمان بہن بھائیوں کی بنا کسی صلے کی امید کے مدد کرتے ہیں۔ میں ادارہ سچی کہانیاں کے ذمہ داروں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو مکمل ایمان داری اور نیک نیتی کے ساتھ میرا ساتھ دیتے ہیں۔ میں کمزور بوڑھا سوائے دعاؤں کے کچھ نہیں دے سکتا مگر یہ یقین دلاتا ہوں کہ نیکی اور وہ بھی چھپی، ہر ایک کو کرنا نصیب نہیں ہوتی اور جن کو ہوتی ہے ان کے درجے بہت بلند ہوتے ہیں۔ میں تمام پڑھنے والوں کو نصیحت کروں گا کہ قرآن شریف ترجمے کے ساتھ پڑھیں اور اس کے معنی پر غور کریں...... اپنی زندگیوں کو قرآن میں دیے گئے ضابطہ حیات کے مطابق گزاریں۔ عبادت تنہائی میں کرنے کی عادت ڈالیں۔ جذبات کو گرما دینے والی تقریروں اور خطاب سے بچنے کی کوشش کریں...... یہ بات سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو مذہب زندگی کے ہر معاملے میں توازن کی تلقین کر رہا ہے وہ کسی بھی معاملے میں حد سے تجاوز کرنے کو پسند نہیں کرتا، چاہے خوشی ہو یا غم...... صبر اور مستقل مزاجی کامیابی کی ضمانت ہیں۔

میں نصیحت کروں گا کہ اس ماہ مبارک میں اور اس کے بعد آنے والے مہینوں میں بھی سچے دل سے اللہ کو پکاریں خوب صدقہ خیرات کریں۔ جائز ضرورت مندوں کی مدد کریں کہ یہی سب اس دنیا میں بھی کام آئے گا اور اُس دنیا میں بھی......

سورۃ بقرہ کی تلاوت کرنا بہت مبارک ہے۔ خاص طور سے آخری دو آیات پڑھے بنا مت سوئیں۔ سورۃ الم نشرح، سورۃ نور، سورۃ نسا، سورۃ رحمٰن ترجمہ کے ساتھ روز پڑھیں...... اور کوشش کریں کہ روز کم از کم ایک شخص کو پیٹ بھر کر کھانا ضرور کھلائیں۔ یہ وہ عمل ہے جو آپ کی روزی وافر رکھے گا۔ اللہ تمام مسلمانوں کو کارِ خیر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

□ ایک بیٹی۔ کراچی

○ بابا جی! میں آپ کا ہر لمحہ شکریہ ادا کرتی ہوں آپ نے مجھ پردہ دار عورت کا ایسا پردہ رکھا کہ مجھے دنیا میں اچھے لوگوں کی موجودگی کا یقین ہو گیا۔ جب میں پہلی بار آپ کے رابطے میں آئی تھی تب 3 دن کی بھوکی تھی۔ گھر میں بچیاں اور بوڑھے لاچار سُسر تھے۔ میں نے کس کس سے مدد کی درخواست نہ کی مگر سب تماشہ لگانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ نے میرا مان رکھا۔ آج ہم سب پیٹ بھر کر روٹی بھی کھاتے ہیں اور میرے سر پر جو ٹوٹی پھوٹی چھت تھی اُس کی بھی مرمت ہو گئی ہے۔ بابا جی میں ان لوگوں کی شکر گزار ہوں جو آپ کے توسط سے میری مدد کرتے ہیں۔ یہ خط لکھتے ہوئے بھی میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ ہماری زندگیاں اور عزتیں آپ کی مرہونِ منت ہیں۔ دھوکے اور چال بازی

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121-021

کے اس دور میں جب جائز ضرورت مند ہاتھ پھیلا ہی نہیں سکتا بے حس لوگ ہمارا بھی حق مار لیتے ہیں۔ آپ ملتے نہیں ہیں ورنہ میں آپ کے پاؤں پکڑ کر آپ کا شکریہ ادا کرتی، بابا جی مجھے، میری بچیوں کو اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیے گا اور دعا کیجیے گا کہ جلد ہی وہ اس قابل ہو جائیں کہ گھر کی ذمہ داری اٹھا سکیں تا کہ میں ہاتھ جوڑ کر آپ نے کہہ سکوں کہ اب مجھے امداد کی ضرورت نہیں یہ کسی اور کو دیجیے۔ بابا جی میری دعا ہے جو لوگ میری ہر ماہ مدد کرتے ہیں۔ اللہ خوش رکھے وہ ہمیشہ دینے والوں میں ہوں اور ان کے سروں پر چھت قائم رہے۔

☆ بیٹی! اللہ کی ذات بہت بڑی ہے۔ وہ بندوں کے لیے بندوں کو ہی وسیلہ بناتی ہے اور ظاہر ہے جن لوگوں کے نصیب میں کسی کی کفالت کرنا آتا ہے وہ اللہ کے بہت پسندیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ جلد از جلد تمہیں اس قابل کرے کہ تم دوسروں کی مدد کرو۔ میرے دو بچے جو تمہاری پابندی سے مدد کرتے ہیں اللہ انہیں بھی نواز رہا ہے اور آئندہ بھی بہت نوازے گا۔ بس تم دعائیں دیتی رہنا مجھے ان دونوں پر فخر ہے اللہ انہیں دین و دنیا سب عطا فرمائے، آمین۔

□ عمارہ عزیز۔ کراچی

o بابا جی! میری عمر **20** سال ہے۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ایسا وظیفہ دیں جس سے میری اچھے اور سلجھے ہوئے نیک لڑکے سے شادی ہو جائے۔ میں آپ کو ساری زندگی دعائیں دوں گی۔ میرے پاس دعاؤں کے سوا دینے کو کچھ نہیں۔ میرا نام عمارہ عزیز ہے، والدہ کا نام حاجرہ بی بی ہے۔ میرا جواب مئی کے شمارے میں ضرور دیجیے گا یا جون میں، میری مجبوری سمجھ کر اللہ کا واسطہ ضرور دیجیے گا۔

☆ بیٹی عمارہ! تم سب سے پہلے تو نماز کی پابندی رکھو کوشش کیا کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ طٰہٰ پڑھو اور دعا کرو۔ یہ وظیفہ **21** روز جاری رکھو انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔

□ افضالہ ناز۔ منڈی وار برٹن

o بابا جی! پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے ہر کام سے ہماری عزت خراب ہوتی ہے جو ہم نہیں بھی کرتے۔ ہم بہت پریشان ہیں۔ ہمارے ساتھ ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بابا جی! ہمارے ساتھ ایسے بہت سے برے حادثے ہو چکے ہیں۔ جن سے ہم بہنوں کی بدنامی ہوئی ہے۔ ہم جو کام نہیں کرنا چاہتے وہ ہی ہم سے ہو جاتا ہے۔ بابا جی ہمیں بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ آپ لوگوں پر کسی نے تعویذ کروائے ہیں۔ بابا جی یہ آپ ہی ہمیں بتا سکتے ہیں کہ یہ سب ہمارے ساتھ کیوں ہوتا ہے۔ میرے ان دونوں سوالوں کا جواب ضرور دیں اسی ماہ، میں آپ کو بہت دعائیں دوں گی۔ بابا جی اگر میری شادی اُس گھر میں ہو جائے تو میرے ماں باپ کے سر سے بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ بابا جی پلیز میری مدد کریں۔

☆ بیٹی افضالہ! تمہاری خواہش پر تمہارا پہلا مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی اگر کوئی شخص مخلص ہی نہ ہو تو زبردستی تو زندگی میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کو پسند کرنا گناہ نہیں مگر سب سے زیادہ محبوب اپنی عزت نفس کو رکھو۔ رزق میں برکت کے لیے بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ واقعہ پڑھو۔ بھائی سے کہو حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالا کرے۔ تم اپنی عادت میں شامل کر لو کہ روزانہ چڑیوں کو دانہ پانی ڈالا کرو گی۔ انشاء اللہ جلد مسائل حل ہوں گے۔ وظیفہ کی مدت ایک ماہ ہے۔

□ رمشا۔ مقام نامعلوم

☆ بیٹی رمشا! معتبر ذرائع سے معلوم کرواؤ۔ بھائی کسی مشکل میں تو نہیں کیونکہ یہ المیہ ہے کہ اکثر لوگ نامکمل کاغذات پر باہر ملکوں میں بھجوا دیے جاتے ہیں اور وہ بے چارے پھر ساری زندگی جیل میں گزارتے ہیں۔ اللہ نہ کرے کہ تمہارے بھائی کے ساتھ ایسا کچھ ہو مگر پھر بھی مکمل معلومات حاصل کرو۔ پھر مجھے مطلع کرو۔ تم یا والدہ روزانہ ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ بہن سے کہو وہ بعد نماز فجر ایک بار سورۃ احزاب ترجمہ کے ساتھ پڑھے اور دعا کرے۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ فاروق۔ کوٹری

o: محترم بابا جی! میں ''سچی کہانیاں'' میں کافی

عرصے سے آپ کے کالم پڑھ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ خلق خدا کو آپ کے وظائف سے بہت فائدہ ہوتا ہے اور مرادیں برآتی ہیں۔ میری نظر میں آپ کی بے پناہ عزت واحترام ہے۔ ہوسکے تو مجھے بھی اپنی دعاؤں سے نوازیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اور آپ کے تمام اسٹاف کی عمر دراز فرمائے۔(آمین) آپ کی صحت وتندرستی کو برقرار رکھے اور آپ یونہی خلق خدا کی مدد کرتے رہیں۔

☆: بیٹے فاروق! قابل تعریف تو وہ ذات باصفات ہے۔ اسی نے مجھ عاصی کو بھی یہ توفیق بخشی ہے کہ میں اس کی مخلوق کے کام آسکوں۔ تم نماز باجماعت کی پابندی کرو اور بلاناغہ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرو۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ''یاحی یاقیوم'' کا ورد کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ کبھی تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں آئے گی۔ تمہاری ہر جائز مراد پوری ہوگی۔ بس اخلاص شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔(آمین)

□ فرحت انیس۔ اسلام آباد

O: باباسائیں! السلام علیکم! گزشتہ سال آپ نے مجھے جو تعویذ دیا تھا، اس سے میرا مسئلہ حل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت اور تندرستی برقرار رکھے اور آپ کو عمر طویل عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح خلق خدا کی خدمت کرتے رہیں۔ آمین۔ باباسائیں! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ بس تاعمر آپ کو دعائیں دیتا رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ کی دعاؤں سے اور دیے گئے تعویذ سے میرا کاروبار بہت اچھا چل رہا ہے۔ میں نے آپ کو اپنی بہن کے مسئلے کے سلسلے میں زحمت دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔(انشاء اللہ تعالیٰ) اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

☆: بیٹے فرحت! میرا شکریہ ادا کرکے مجھے گناہ گار مت کرو۔ میں تو اس مولائے کل کا حقیر سا بندہ ہوں۔ اس رؤف ورحیم کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے تمہارا مسئلہ حل کیا۔ نماز سے غفلت مت برتنا۔ زیادہ افضل تو یہ ہے کہ تمام نمازیں باجماعت ادا کیا کرو۔ اپنی نیک کمائی سے ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں حسب توفیق واستطاعت خیرات دیا کرو۔ اس سلسلے میں ایک بات کا دھیان رہے کہ ہر مانگنے والا خیرات کا مستحق نہیں ہوتا۔ تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ فی زمانہ بھیک مانگنے کو بھی لوگوں نے پیشہ بنالیا ہے۔ ان پیشہ ور بھکاریوں کی بدولت اصل مستحقین محروم رہ جاتے ہیں۔ تمہارا جذبہ بہت نیک ہے کہ جس طرح اس مالک حقیقی نے تمہارا مسئلہ حل کیا ہے، تم اس کی مخلوق کے کام آنا چاہتے ہو۔ اپنے اردگرد نظر ڈالو، تمہیں ایسے لوگ مل جائیں گے جو اپنی سفید پوشی کے بھرم میں کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے۔ میرے پاس بھی ایسے بہت سے مستحق آتے ہیں۔ میں حتیٰ المقدور ان کی مدد بھی کرتا رہتا ہوں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خیرات کرنے سے اور خصوصاً اس ماہِ مبارک رمضان میں...... رزق میں بے پناہ برکت ہوتی ہے۔ تمہاری بہن کو میں نے براہ راست جواب لکھ دیا ہے۔ ان کا وظیفہ پورا ہوجائے تو مجھے صورت حال سے آگاہ کرنا۔

□ ارم۔ راولپنڈی

O: بیٹی ارم! تعالیٰ آپ کے گھرانے پر اپنا فضل وکرم فرمائے۔(آمین) ہر حال میں نماز کی پابندی کرو اور تمام مکروہات، جھوٹ، غیبت، موسیقی اور نمود ونمائش سے حتیٰ الامکان بچنے کی کوشش کرو۔ گھریلو حالات کی بہتری کے لیے تم یا تمہاری والدہ بعد نماز عشاء 41 مرتبہ سورۃ مزمل کا ورد کریں۔ اول وآخر درود شریف ضرور پڑھیں۔ عمل کی مدت تین دن ہے۔ وظیفے کے بعد کامل یقین اور دل کی گہرائی سے اس مالک بزرگ وبرتر کے حضور دعا کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے حالات میں بہتری پیدا ہوگی۔

□ ذاکر۔ حیدرآباد

O: بیٹے ذاکر! اللہ تعالیٰ تمہاری جائز مراد کو پورا فرمائے۔ آمین۔ نماز کی پابندی کو اپنا شعار بنالو اور رب کائنات پر کامل یقین رکھو۔ میں تمہیں ایک آزمودہ وظیفہ بتارہا ہوں۔ نماز مغرب کے بعد روزانہ ایک دفعہ سورۃ واقعہ پڑھا کرو اور اٹھتے بیٹھتے یاوہاب کا ورد کیا کرو۔ اس عمل کی کوئی میعاد نہیں ہے۔ جب تک تمہارا مقصد پورا نہ ہوجائے اسے کرتے رہو۔ ہر نماز کے بعد خصوصی طور پر قلب کی تمام تر گہرائیوں سے دعا مانگو کہ اللہ تعالیٰ

اپنے حبیب ﷺ کے صدقے اور وسیلے سے تمہاری دعاؤں کو قبول فرمائے۔ (آمین) حالات میں بہتری پیدا ہو جائے تو مجھے آگاہ کرنا۔

☐ شفق۔ گوجرہ

O: محترم بابا جی! السلام علیکم! میرے چھوٹے بیٹے کو کافی عرصے سے گلے کی تکلیف تھی۔ کبھی کبھی تو یہ تکلیف اتنی بڑھ جاتی تھی کہ وہ بے چین ہو جاتا تھا۔ میں نے اس کا بہت علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لوگوں کے کہنے پر میں نے اس کا ہومیو پیتھک علاج بھی کرایا۔ حکیموں کے نسخے بھی آزمائے مگر اس کی تکلیف جوں کی توں برقرار رہی۔ اس کے گلے اتنے پھول گئے تھے کہ ڈاکٹروں نے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا مگر میں آپریشن نہیں کرانا چاہتی تھی۔ گزشتہ دنوں میں نے آپ کے رسالے میں گلے کی دوا کے بارے میں پڑھا۔ میرے ایک عزیز کراچی میں رہتے ہیں۔ میں نے انہی کے توسط سے وہ دوا منگوالی۔ اس کے استعمال سے میرے بیٹے کے ٹانسلز بالکل ٹھیک ہو گئے۔ بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔ "سچی کہانیاں" کے آفس والوں نے کہا تھا کہ دوا کے استعمال کے بعد آپ کو صورت حال سے آگاہ کروں۔ اس لیے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔

☆: بیٹی شفق! شکریہ میرا نہیں، اس مالک بزرگ و برتر کا ادا کرو جو شفا دیتا ہے۔ یہ سب اسی کا کرم ہے۔ نماز کی پابندی کرو اور اپنے بچوں کو بھی نماز کی تلقین کرو۔

☐ نور احمد۔ امریکہ

O: محترم بابا جی! السلام علیکم! اچھے مستقبل کی تلاش میں تین مہینے پہلے یہاں آیا تھا مگر یہاں آکر شدید مایوسی ہوئی۔ یہاں ہم جیسے تارکین وطن کے لیے باعزت روزگار بہت کم ہے۔ جو دوسری چھوٹی ملازمتیں ملتی ہیں۔ ان کی ٹائمنگ بہت زیادہ اور معاوضے بہت کم ہیں۔ میں تو یہاں آکر پچھتا رہا ہوں۔ واپس بھی نہیں جا سکتا کیوں کہ میرے والدین نے مجھے قرض لے کر امریکا بھیجا تھا۔ میں نے انگلش میں ماسٹرز کیا ہے مگر یہاں ایک پیٹرول پمپ پر کام کرنا پڑ رہا ہے۔ پچھلے دنوں ایک دوست نے مجھے "سچی کہانیاں" پڑھنے کو دیا تھا۔ اس میں آپ کا کالم "مسئلہ یہ ہے" پڑھا تو مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ بابا جی! میں نے بہت امید سے آپ کو خط لکھا ہے۔ خدارا مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں کہ مجھے کوئی اچھی سی جاب مل جائے اور میرے معاشی حالات سدھر جائیں۔ میں اور میرے گھر والے تازندگی آپ کے ممنون اور احسان مند رہیں گے۔

☆: بیٹے نور! تمہارے حالات جان کر دکھ ہوا۔ فی زمانہ ہمارے تو جوانوں پر باہر جانے کا بھوت سوار ہے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو یہاں اچھی بھلی، باعزت ملازمت چھوڑ کر وہاں جاتے ہیں اور وہاں پیٹرول پمپوں پر، دکانوں میں اور ہوٹلوں میں گھٹیا قسم کے کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر رحم فرمائے۔ آمین۔ بیٹے اللہ تعالیٰ تمہاری جائز مراد پوری کرے۔ آمین۔ نماز کی پابندی کرو کہ وہاں اس کی بہت ضرورت ہے۔ پابندی سے نماز پڑھو گے تو تمام برائیوں سے محفوظ رہو گے کیونکہ وہ نماز، نماز ہی نہیں ہوتی جو برائیوں سے نہ روک سکے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے "یاحی یاقیوم" کا ورد کیا کرو۔ ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

☐ رامین۔ کراچی

O: محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں۔ مجھ سے چھوٹی بہن کی شادی ہو گئی مگر میری نہیں ہوئی۔ یہ بھی نہیں کہ رشتے نہ آتے ہوں۔ رشتے تو آتے ہیں مگر کوئی ایک دفعہ آنے کے بعد دوبارہ نہیں آتا۔ میں شکل کی بھی بری نہیں ہوں۔ خاصی خوب صورت ہوں۔ مجھے وظیفے پڑھنے سے بھی خوف آتا ہے۔ آپ مجھے کوئی تعویذ دے دیں۔

☆: بیٹی رامین! اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ کون سا کام کب ہوگا، ہوگا بھی یا نہیں، یہ وہی جانتا ہے۔ ہم عاجز اور گناہ گار بندے اس کے بھید نہیں سمجھ سکتے۔ اگر تم سے چھوٹی بہن کی شادی ہو گئی تو اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ وقت آنے پر اللہ تعالیٰ تمہاری مراد بھی پوری فرمائے گا۔ تمام ڈر اور خوف نکال کر اس قادر مطلق پہ مکمل یقین اور بھروسے کے

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کرجاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔
مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ساتھ اس کا ورد کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری دلی مراد ضرور پوری ہوگی۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

☐ کاشان۔ جڑانوالہ

○: بیٹے کاشان! تمہارے حالات جان کر بہت افسوس ہوا۔ ہر کام میں اس باری تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ بعض اوقات حالات مخالف بھی ہوجاتے ہیں۔ انسان کو ان نامساعد حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر حال میں اس مالک کل کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ہر مسلمان کا اس پر ایمان ہونا چاہیے کہ کلام الٰہی میں بہت تاثیر ہوتی ہے۔ فی الحال تمام وظائف واوراد ترک کردو۔ کبھی کبھی وظائف کی زیادتی بھی نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ صرف اور صرف نماز کی پابندی کرو۔ جماعت کے ساتھ پڑھو تو بہت اچھا ہے۔ ہر فرض نماز کے بعد 129 دفعہ ''یالطیف'' کا ورد کرلیا کرو۔ اپنے گھر والوں کو بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرو، بالخصوص اپنے بھائی کو نماز کا پابند بنانے کی کوشش کرو۔ انتہائی خشوع وخضوع سے اور اس رب رحیم وکریم پہ کامل یقین کے ساتھ دعا مانگا کرو۔ وہ مالک حقیقی اپنے حبیب کے صدقے اور وسیلے سے تمہاری تمام مشکلات دور فرمائے۔ آمین۔ بیٹے! میں تمھیں تعویذ کے لیے بھی کہوں گا۔ سچی کہانیاں کے آفس فون کرکے تعویذ کے بارے میں معلومات حاصل کرلو۔ دو مہینے بعد مجھے حالات سے آگاہ کرنا۔

☐ شجاع۔ لاہور

○: بزرگ محترم! السلام علیکم! مجھے کافی عرصے سے داد کی تکلیف تھی۔ میں نے اس کا بہت علاج کرایا مگر تکلیف نہ گئی۔ میں لاہور کی ایک کمپنی میں سیلز منیجر ہوں۔ بزنس کے سلسلے میں مجھے مختلف شہروں میں جانا پڑتا ہے۔ گزشتہ دنوں کراچی آیا تو میرے ایک عزیز نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ داد کی دوا بھی دیتے ہیں۔ ان کے کہنے پر میں نے بے دلی سے یہ دوا لے لی مگر اس کے استعمال سے حیرت انگیز طور پر انتہائی پرانا داد کا مرض جاتا رہا۔ محترم بزرگ! بہت بہت شکریہ! اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضرؑ عطا فرمائے تاکہ آپ یونہی خلق خدا کی خدمت کرتے رہیں۔ آمین۔ آپ کے دفتر والوں نے کہا تھا کہ دوا کے استعمال کے بعد آپ کو اطلاع دوں اسی لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔

☆: بیٹے شجاع! شکر تو رب رؤف الرحیم کا ادا کرو۔ ہاں، نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ اس سے کبھی غفلت مت برتنا۔ اللہ تعالیٰ تمھیں نیک توفیق دے اور اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین۔

☐ ارباب محمد۔ ملتان

○: بیٹے ارباب! اپنے مسئلے کے لیے نماز فجر کی سنتوں اور فرض کے درمیان سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کیا کرو۔ اس کے ساتھ کثرت سے ''یاوہاب'' کا ورد کیا کرو۔ نماز باجماعت پڑھنے کی کوشش کرو اور تمام مکروہات جھوٹ، غیبت، فضول گوئی وغیرہ سے مکمل پرہیز کرو۔ رب غفور الرحیم نے چاہا تو تمہاری جائز مراد ضرور پوری ہوگی۔ یہ عمل اس وقت تک کرتے رہو جب تک حالات میں سدھار کی کوئی صورت پیدا نہ ہوجائے۔ سورۃ الرحمٰن قرآن مجید کی زینت ہے۔ اگر تم نے یہ عمل ہمیشہ جاری رکھا تو وہ مالک حقیقی تمھیں اتنا دے گا کہ تم نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ ایک ماہ بعد مجھے خط لکھ کر حالات سے آگاہ کرنا۔

☐ فریحہ۔ جھنگ

○: محترم بابا جی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی اور تندرستی دے تاکہ آپ اسی طرح لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ آمین۔ میں آپ کا کالم 'مسئلہ یہ ہے' بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ بے شمار لوگوں کے مسئلے حل ہوئے ہیں۔ بے شک کلام الٰہی میں بہت تاثیر ہوتی ہے۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرکے بہت سے لوگ فیض یاب ہورہے ہیں۔ میں بھی اپنا ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ بابا جی! میرے گھر میں آج کل بہت زیادہ معاشی پریشانی ہے۔ میرے شوہر نے ملازمت کے ساتھ ساتھ کاروبار بھی شروع کیا ہے۔ وہ جس محنت، لگن اور ایمانداری سے کام کررہے ہیں، کاروبار اتنی ترقی نہیں کررہا ہے۔ ہم پہ بہت سے لوگوں کا قرض چڑھ گیا ہے۔ بہت سے لوگوں پہ ہمارے پیسے واجب الادا ہیں۔ جو وہ

واپس کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ آپ مجھے معاشی خوش حالی اور کاروبار میں برکت کے لیے کوئی تعویذ دیجیے۔ میرے بچے بہت چھوٹے ہیں۔ اکثر مجھ سے فجر کی نماز بھی قضا ہو جاتی ہے۔ میں اور میرے شوہر آج کل بہت پریشان ہیں۔

☆: بیٹی فریحہ! تمہارے طویل خط سے اندازہ ہوا کہ تم میں مستقل مزاجی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مایوس ہو جاؤ۔ مایوسی تو کفر ہے بیٹی، وہ رب رحیم وکریم اپنی مصلحتوں سے خوب واقف ہے۔ اس میں بھی اس قادر مطلق کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔ تم فی الحال صرف نماز کی پابندی کرو۔ جھوٹ، حسد، غیبت، کینہ اور اسی قسم کے تمام مکروہات سے پرہیز کرو۔ نماز فجر کی سنتوں کے بعد اور فرض سے پہلے سورۃ رحمٰن کی تلاوت کیا کرو۔ مغرب کی نماز کے بعد سورۃ واقعہ کی تلاوت کرو۔ دعا کے وقت خصوصی اہتمام کرو۔ قلب کی تمام تر گہرائیوں اور پوری یکسوئی کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کے صدقے اور وسیلے سے گڑگڑا کر دعا مانگو۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ مالک حقیقی تمہاری دعاؤں کو قبولیت بخشے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کو گریہ بہت پسند ہے۔ اس کے جو بندے وقت دعا گریہ کرتے ہیں، وہ انھیں احسانات سے نوازتا ہے۔ جب تک حالات میں بہتری کے آثار پیدا نہ ہوں، پابندی سے یہ عمل کرتی رہو۔ تعویذ کے لیے فوراً آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

☐ صفیہ۔ بولان

O: بیٹی صفیہ! تمہارے حالات جان کر افسوس ہوا۔ دکھ اور پریشانیاں بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پہ ہی آتی ہیں۔ جب بندہ انتہا سے زیادہ پریشان ہوتا ہے تو صدقِ قلب کے ساتھ اس غفور الرحیم کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور گڑگڑا کر اس کی بندگی کا اظہار کرتا ہے۔ اگر انسان ہمیشہ سکھی رہے تو دنیاوی عیش وعشرت میں پڑ کر اس معبود حقیقی کو یاد بھی نہ کرے۔ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، اس قادر مطلق کی یاد سے کبھی غافل مت ہونا۔ اللہ تعالیٰ تمھیں صبر اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین۔ بعد نماز فجر اور نماز عشاء 71 بار سورۃ آل عمران کی آیت 73-74 کا ورد کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس کے حبیب پاک حضرت محمد ﷺ کے وسیلے اور صدقے سے دعا مانگو۔ وہ ضرور تم پر اپنا کرم فرمائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

☐ نگہت۔ خانیوال

O: بیٹی نگہت! اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے اور تمہاری حاجت روائی فرمائے۔ آمین۔ میں تمھیں بھی یہی تاکید کروں گا کہ نماز کی پابندی کرو اور تمام تر مکروہات سے پرہیز کرو۔ خاص طور پہ دوسروں کی دل آزاری سے اجتناب برتو۔ ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرو۔

☐ شہزادی۔ پاکپتن

O: بابا جی! السلام علیکم! میں نے اس سے پہلے بھی آپ کا بھیجا ہوا تعویذ استعمال کیا ہے۔ میرا کام حیرت انگیز طریقے سے ہو گیا۔ اب میں پھر اپنا ایک مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ بابا جی! میری شادی کو تین سال ہوئے ہیں۔ جب میری شادی ہوئی تھی تو شوہر نے ملازمت چھوڑ کر کاروبار شروع کیا تھا۔ اس دن سے لے کر آج تک ہمارے معاشی حالات سنبھلنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ شوہر انتہائی دیانتداری محنت اور لگن سے کام کرتے ہیں مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی نے بندش کر دی ہے۔ ہمارا تو کوئی ایسا دشمن بھی نہیں ہے۔ بابا جی! آپ سے عاجزانہ درخواست ہے کہ خدارا میرے مسئلے کا کوئی حل بتائیں۔ ہر وقت کی پریشانی کی وجہ سے اب گھر میں بھی کشیدگی رہنے لگی ہے۔ میں تاعمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔

☆: بیٹی شہزادی! تمہارے حالات جان کر دکھ ہوا۔ ہر وقت کی پریشانی سے گھبرا کر انسان صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ میں پھر تاکید کروں گا کہ مومن کو کسی بھی حال میں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ پریشانیاں تو وقتی ہوتی ہیں۔ نماز کی پابندی کرو اور اپنے شوہر کو بھی نماز پڑھنے کی تاکید کرو۔ اٹھتے بیٹھتے "یاوہاب" کا ورد کیا کرو۔ جھوٹ، حسد، دروغ گوئی اور اسی طرح کی تمام فضولیات سے پرہیز کرو۔ بعد نماز عشاء 41 بار سورۃ مزمل کا ورد کیا کرو۔ عمل کی مدت 21 دن ہے۔ اس دوران میں سختی سے نماز کی پابندی کرنا۔ کوئی نماز قضا نہ ہونے پائے۔ یہ عمل کرنے کے بعد مجھے حالات سے

آ گاہ کرنا۔ مجھے اس قادر مطلق پہ یقین کامل ہے کہ وہ تمہاری حاجت روائی فرمائے گا۔ ہاں ہفتے میں ایک دفعہ خیرات ضرور یاد کرو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

□ ثمرہ۔ پتوکی

o: بیٹی ثمرہ! میں پہلے بھی بے شمار دفعہ کہہ چکا ہوں اور اب تم سے بھی یہی کہوں گا کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ یہ سوائے اس غفور الرحیم کے اور کوئی نہیں جانتا کہ کس کام کا کون سا وقت مقرر ہے۔ اگر وظیفہ کرنے سے کسی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خدانخواستہ، خدانخواستہ کلام الٰہی میں تاثیر نہیں ہے۔ یہ تو ہماری ہی کوئی خامی ہوتی ہے جو راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ دعا اور وظیفہ تو اس قادر مطلق سے اپنی حاجات طلب کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اپنے ان فاسد خیالات پہ استغفار پڑھو۔ وہ مالک بزرگ و برتر معاف فرمانے والا ہے۔ دراصل جلد جلد وظائف پڑھنے سے کبھی کبھی فائدے کی بجائے نقصان کا احتمال رہتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھو کہ ہر وظیفے کے لیے اس ذات باصفات پہ کامل یقین اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر حال میں پُرامید رہنے کا حکم دیا ہے۔ تم پہلے تو ذہن سے اس مایوسی کو نکالو۔ ہر نماز وقت پر، انتہائی عاجزی اور خشوع وخضوع سے ادا کرو۔ بندے کا کام ہے صرف دعا کرنا۔ اس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو اور اس پختہ یقین کے ساتھ کہ وہ مالک کل ہمارے حق میں بہتری کرے گا۔ میں فی الحال تمہیں کوئی وظیفہ تجویز نہیں کر رہا ہوں۔ بس پنج وقتہ نماز کی پابندی کرو۔ ہر فرض نماز کے بعد 129 دفعہ ''یالطیف'' کا ورد کرتی رہو۔ گھر کے دوسرے افراد کو بھی نماز کی تلقین کرو۔ ایک مہینے بعد مجھے حالات سے آگاہ کرنا۔ اور ہاں وظیفے کے بجائے تمہیں تعویذ کا مشورہ دوں گا۔

□ ثمینہ۔ گگو منڈی

o: محترم بابا جی! آداب و نیاز! ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی اور میں میٹرک میں پڑھ رہی تھی کہ مجھے گلے کی تکلیف شروع ہوگئی۔ آہستہ آہستہ یہ اتنی بڑھی کہ ذرا سی کھٹی چیز یا آئس کریم کھانے سے بھی مجھے گلے آجاتے تھے۔ میں نے ہر طرح کا علاج کروایا۔ وقتی طور پر تو مجھے افاقہ ہو جاتا تھا مگر یہ بیماری پوری طرح ختم نہیں ہوتی تھی۔ اب میری شادی کو تین سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ کی دوا استعمال کرنے سے پہلے میرے شوہر نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب مجھے آپریشن کروا ہی لینا چاہیے مگر مجھے آپریشن سے ڈر لگتا تھا اس لیے میں نے آپ کی دوا آزمانے کے لیے آپریشن کی رضامندی دے دی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ کی دوا کے استعمال سے میرے گلے آنا بند ہوگئے ہیں۔ اب میں وہی بڑے کھاؤں یا آئس کریم مجھے گلے نہیں آتے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کی خدمت خلق کا نیک صلہ دے۔ آمین۔

☆: بیٹی ثمینہ! صحت وشفا دینے والا تو وہی رحیم وکریم آقا ہے جو خالق و مالک کائنات ہے۔ بس اسی کا شکر ادا کرتی رہو اور نماز کی پابندی سے کبھی غفلت نہ برتنا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ صحت مند رہوگی۔

□ رخشی۔ مقام نامعلوم

o: جناب بابا جی! السلام علیکم! میں نے آپ کو پہلے رجسٹری خط بھیجا تھا اور اس میں اپنا حال بیان کیا تھا لیکن پورا مہینہ ہوگیا، کوئی جواب نہیں ملا۔ اللہ، رسولؐ کے واسطے میرے خط کا بہت جلد جواب دیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ تقریباً ایک سال پہلے آپ نے مجھے تعویذ دیا تھا۔ سورۃ رحمٰن روزانہ پڑھنے کو بتائی تھی اور چاروں قل پڑھ کر بچوں پر دم کرنے کو کہا تھا اور نماز کی پابندی اور درود شریف کثرت سے پڑھنے کی تاکید کی تھی۔ مدت ایک ماہ بتائی گئی تھی اور میرے بچوں پر جو حادثات ہوتے تھے، وہ بھی ختم ہوگئے اور ہر وقت بچے جو بیمار رہتے تھے، وہ بھی صحیح ہوگئے۔ گھر کی چھت دیکھ کر وہ بہت ڈرتے تھے۔ انھیں کچھ نظر آتا تھا۔ وہ بھی ٹھیک ہوگیا۔ ہر پریشانی اور مصیبت سے ہمیں نجات مل گئی تھی۔ گھر میں بہت سکون ہوگیا تھا۔ پورا ایک سال ہم سب آرام اور چین سے زندگی گزار رہے تھے کہ وہ تعویذ ہم سے کہیں کھو گیا اب پھر سے میرے شوہر کی نوکری ختم ہوگئی۔ بچے پھر سے بیمار رہنے لگے اور حادثات ہونے لگے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی بہت بُری طرح سے گرا دیتا ہے اور خون

بہنے لگتا ہے۔ بچے پھر سے ڈرنے لگے ہیں اور پھر سے ہمارے گھر میں تباہی آ گئی ہے۔ کوئی جن ہمارے گھر میں موجود ہے؟ تو پھر سے ہم بربادی کے راستے پر آ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اتنی طاقت ہے کہ ہم اس عذاب سے بچ گئے تھے۔ ورنہ 14 سال سے ہم سب ایک دن بھی سکون سے نہیں سوئے تھے۔ اللہ، رسول کے واسطے آپ جلد ہمیں تعویذ ارسال کر دیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔

☆: بیٹی رخشی! باری تعالیٰ تم لوگوں پر رحم فرمائے۔ آمین۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تم نے یہ کیوں نہ بتایا کہ تم لوگ نماز کی پابندی کر رہے ہو یا نہیں؟ جب حالات پھر بدلے تو تم نے وہی عمل کیوں شروع نہیں کیا؟ اگر نہیں کیا تو نماز کی مکمل پابندی کے ساتھ وہی عمل پھر سے کرو۔ ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ کر بچوں پر دم کرنا بھی مت بھولنا اور اٹھتے بیٹھتے "حسبنا اللہ ونعم الوکیل" بھی پڑھتی رہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ کرم ہوگا۔ تعویذ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے منگوالو۔

□ سلطانہ۔ کے پی کے

O: بیٹی سلطانہ! شکل وصورت کائنات کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ جو لوگ انسانوں کی شکل وصورت پر اعتراض کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں، جو سخت گناہ ہے۔ اگر شکل وصورت کی تخلیق انسان کے اپنے بس میں ہوتی تو دنیا کا ہر فرد خوبصورت ہوتا۔ کیا باری تعالیٰ کا یہی احسان کم ہے کہ اس نے کم صورت انسانوں کو بھی ہر طرح سے مکمل بنایا ہے اور بسا اوقات تو کم صورت لوگ، خوب صورت لوگوں سے زیادہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم نماز اور روزوں کی پابندی کرتی ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ تم چہرے کی خوب صورتی میں کمی کی بجائے دل میں اور چہرے پر نور پیدا کرنے کے لیے پارہ 8 سورۃ النور کی آیت نمبر 35 پانچ مرتبہ روزانہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور ہاتھوں پر پھونک کر ہاتھ چہرے پر پھیر لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تمہارے چہرے پر کشش پیدا ہو جائے گی۔

☆☆☆

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

مولانا رومی کی پسندیدہ دعا

"مجھے وہ طاقت نہ دے جس سے میں دوسروں کو کمزور کردوں۔ مجھے وہ دولت نہ دے جس کی خاطر میں دوسروں کو غریب سمجھوں۔ مجھے وہ علم نہ دے جسے میں اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں۔ مجھے وہ بلندی نہ دے کہ مجھے اپنے سوا کچھ نظر نہ آئے۔"

حسنِ انتخاب: خضر حیات۔ روڈہ تھل

پیاس

جب تک انسان کو پانی نہیں ملتا اسے یونہی لگتا ہے کہ وہ پیاس سے مرجائے گا مگر پانی کا گھونٹ بھرتے ہی وہ دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ پھر اسے خیال بھی نہیں آتا کہ وہ پانی سے بھی مر سکتا تھا۔ کوئی پیاس سے مرتا نہیں مرتے تو سب اپنے وقت پر ہی ہیں اور اسی طرح جس طرح اللہ چاہتا ہے۔ مگر دنیا میں اتنی چیزوں کی ہماری پیاس بن جاتی ہے کہ ہمیں زندہ رہتے ہوئے کئی بار موت کے تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔

حسنِ انتخاب۔ ایم افضل آزاد۔ ساہیوال

عورت

باکرم کردار تاریخ روشن المرتبت پیکر بصیرت وبصارت تخلیق سرمایۂ فکر صنف نازک اسلامی معاشرے میں اس منصب پر فائز ہے جس کا تصور بھی محال ہے۔ تاریخ کے اوراق میں آج بھی سنہری لفظوں میں خواتین کی داستانیں موجود ہیں جن کو کسی بھی حال میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مقام افسوس عہد ساز خواتین شاذ و نادر نہیں ہیں بس آج تک دنیا صرف اور صرف بری عورتوں کا ہی سراغ زیادہ لگا سکی ہے جبکہ یہ امر اپنی جگہ بجا ہے کہ جو مرد دنیا کو تعمیر کرتا ہے اس کو عورت ہی جنم دیتی ہے۔ منطق کی بات ہے کہ جو لوگ زیادہ خاموش رہتے ہیں۔ ان کے اندر کتنی لہریں چلتی ہیں۔

زورِ قلم۔ حسین خواجہ۔ سٹی منچن آباد

عظیم لوگ

زندگی کے سفر میں کتنے ہی لوگوں سے ملتے ہیں۔ کچھ تو دل پر یوں نقش ہوجاتے ہیں کہ یہ نگری ہمیشہ ان کی یاد سے آباد رہتی ہے۔ زندگی کا اثاثہ اور مقصد محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی یاد آنکھوں میں نور بن کر ہر راستے کو منور کردیتی ہے۔ منزلیں آسان ہوجاتی ہیں۔ ان کی چاہت میں جان سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی کا مقصد ان کی خوشنودی بن جاتا ہے۔ یاد کیا آتی ہے ویران راہیں آباد ہوجاتی ہیں۔ ماحول کے جنگل میں من مور بن کر ناچنے لگتا ہے۔ ہر چیز مہکی مہکی، خوشنما، ہشاش بشاش نظر آتی ہے۔ کتنے عظیم ہوتے ہیں ایسے لوگ جو کسی کی خوشی کا موجب بنتے ہیں۔ زندگی کا مقصد بن جاتے ہیں، زندگی اور موت کا معاملہ محسوس ہوتے ہیں۔ جینے کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ جب تک یادوں میں رہتے ہیں۔ محترم

ہوتے ہیں۔ کاش ہر انسان ایسا بن جائے۔

حسنِ خیال۔ مہر پرویز احمد دولو۔ میاں چنوں

میرے ابا جان

میرے ابا جان! آپ تھے کتنے مہان
آپ کی تعریف کرتے تھکتی نہیں سب کی زبان
آپ اعلیٰ ظرف تھے اور سب پر تھے مہربان
ہو امیر یا غریب، سب کے لیے تھے ایک سمان
آپ مشعل راہ تھے اور تھے میرِ کارواں
سب کو پہنچاتے تھے منزل، کشتی کے تھے بادبان

میرا پوتا

میرا پوتا پیارا پیارا، سب کی ہے یہ آنکھ کا تارا
ماں باپ کے اپنے راج دلارا
کام کرے تو ایسا پیارا، لوگ کہیں تجھے جگ اُجیارا
دکھیوں کا تو بنے سہارا، اُن سب کے دکھ درد کو ہارا
عمر تو پائے ڈھیروں سارا، جتنا ہے آکاش پہ تارا
دادا، دادی نے تن من وارا، میرا سب کچھ ہے تمہارا

شاعرہ: سلطانہ شوکت۔ رانچی۔ جھارکنڈ، بھارت

مسکراہٹ

مسکراہٹ ایک ایسا پھول ہے۔ جس سے آپ خود بھی کھلے کھلے لگتے ہیں اور سامنے والے کو بھی تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ اس کے برعکس نفرت اور غصہ جہاں ہماری نیکیوں کے دشمن ہیں۔ وہاں ان سے ہمارے چہرے پر بھی بہت غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں جو کہ ہم اور بیوٹی پارلر والے بھی نہیں ہٹا سکتے۔

زورِ قلم۔ راحیلہ بنتِ مہر علی شاہ۔ گاؤں آماخیل، ٹانک

سرکاری ملازم

ایک صاحب سگریٹ کا پیکٹ منگوانے کے لیے بستر پر لیٹے لیٹے اپنے بچوں کو پکار رہے تھے۔ مگر کوئی بھی سن نہیں رہا تھا۔ بیوی نے مشورہ دیا۔ ''اب ذرا سی دیر کے لیے خاموش بھی ہو جاؤ۔''

شوہر نے طنزیہ کہا۔ ''بیگم! مجھے تو ایسا لگتا ہے ہمارے بچے کسی ہوٹل کے بیرے بنیں گے۔ جب بھی انھیں بلاتا ہوں، حاضر نہیں ہوتے۔''

اس پر بیوی غضب ناک ہو کر بولی۔ ''زبان سنبھال کر بات کرو۔ میرے بچے سرکاری افسر بنیں گے۔ وہ کسی کی بات نہیں سنیں گے، خواہ وہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔''

مرسلہ: مقصود احمد بلوچ۔ حیدر آباد

دوستی کہتے ہیں جسے......

ایک اندھا لڑکا تھا...... جس کا پوری دنیا میں سوائے ایک دوست کے کوئی اپنا نہیں تھا۔ اسے اپنے دوست کے علاوہ پوری دنیا سے ہی نفرت تھی۔ دوست بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کا خیال رکھتا تھا۔ مگر اس اندھے لڑکے کی عجیب منطق اور انوکھی ہی سوچ تھی۔ وہ اپنے دوست کی دوستی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنے دوست سے کہتا۔ کہ اگرچہ تم میری پوری دنیا میں واحد میرے ہمدرد غمگسار ہو۔ تمہاری اس بے مثل دوستی پر کوئی شک کی گنجائش نہیں بنتی۔ لیکن میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ یہ دنیا اور اس میں بسنے والے لوگ کتنے خودغرض اور ظالم ہیں۔ اعتبار بھروسہ نام کی کسی بھی شے کے یہ بالکل قابل نہیں۔ اس لیے میرے دل کی خواہش ہے کہ میں تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ تم اس دنیا کے باقی لوگوں سے مختلف کیسے ہو۔ اس لیے تمہاری دوستی پر تب مجھے پختہ یقین آئے گا۔ جب تک تم کو دیکھ نہ لوں۔ کیونکہ آنکھوں دیکھا کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔'' ہمیشہ ہی دوست اس کی باتوں پر ہنس پڑتا تھا۔ ایک دن عجوبہ ہی ہو گیا۔ اس اندھے لڑکے کو آنکھیں مل گئیں۔ اس کو یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ اس کا دوست بھی اندھا ہے۔ اس نے دوست کا خوب مذاق اڑایا۔ تم بھی اندھے ہو۔ اور تم نے یہ بات مجھ سے چھپائی۔ تم بھروسے کے لائق نہیں ہو۔ اس لیے تمھیں چھوڑ کر میں جا رہا ہوں۔ ان دیکھی حسین خوب صورت دنیا میری منتظر ہے۔ تم جیسے اندھے سے دوستی رکھ کر میں مزید اندھیروں میں جینا نہیں چاہتا۔'' اس نے دوست کی دوستی ٹھکرا دی۔

دوست چپ چاپ کھڑا اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر وہ چلا گیا۔ بس جاتے ہوئے فقط اتنا کہہ گیا۔
''میری آنکھوں کی حفاظت کرنا۔''
پسند: ملک صفدر عباس اعوان۔ تحصیل جہانیاں

نوعمری کی محبت

میں پاگل تھی نادان تھی
کیا ہوتا ہے، انجان تھی
اس عمر کی کچی کلیوں کے
ہر خواب سہانے ہوتے ہیں
لمحے بھی زمانے ہوتے ہیں
آنکھوں میں دھند سی ہوتی ہے
باتوں میں کھنک سی ہوتی ہے
تارے بھی اچھے لگتے ہیں
سب جھوٹ بھی سچے لگتے ہیں
میں نے بھی تم سے پیار کیا
یادوں کو گلے کا ہار کیا
اس عمر میں ایسا ہوتا ہے
پھر سب کچھ دھوکا ہوتا ہے
میں پاگل تھی، نادان تھی
کیا ہوتا ہے، انجان تھی

شاعرہ: نوشابہ نوش۔ کراچی

مفت

ایک پہلوان جب گھر میں داخل ہوا تو گریبان کے بٹن ٹوٹے ہوئے، بال بکھرے ہوئے اور چہرے پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ بیوی نے پوچھا۔
''کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے؟'' پہلوان نے جواب دیا۔
''ہاں ایک لٹیرا راستے میں مل گیا تھا۔ اس نے میرا بٹوا چھین لیا اور مجھے مارا بھی۔''
بیوی نے کہا ''ارے آپ تو پہلوان ہیں۔ اس سے ہار کیسے گئے اور اپنا بٹوا بھی دے آئے؟''
پہلوان نے جواب دیا۔ ''بیگم! یہ درست ہے لیکن تمھیں پتا ہے کہ میں تو کشتی کے بڑے بڑے مقابلوں میں جاتا ہوں اور ان مقابلوں میں میرے لڑنے کی فیس 50 ہزار روپے تک ہے۔ میں اس بدمعاش سے کیا مفت میں لڑتا۔''
مرسلہ: انیل پٹھان۔ جامشورو

کمزور

ایک صاحب ماہر نفسیات کے پاس پہنچے اور بولے۔ ''میں نے اپنے بزنس پارٹنر کو دھوکا دیا ہے، جس کی وجہ سے میرا ضمیر مجھے مسلسل ملامت کر رہا ہے۔''
ماہر نفسیات نے کہا۔ ''اچھا...... اچھا تو آپ کی قوت ارادی کو مضبوط کر دوں تاکہ آپ اپنے بزنس پارٹنر سے معذرت کر سکیں اور غلطی کی تلافی......؟''
وہ صاحب جلدی سے بولے۔ ''نہیں نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ضمیر کو کمزور کر دیں۔''
مرسلہ: محمد جواد انور۔ اسلام آباد

کالی بلی

ملک صاحب کی وسیع و عریض حویلی میں یوں تو کئی انسان اور جانور پل رہے تھے لیکن موٹی کالی بلی ایک عرصے سے وہاں مقیم تھی۔ شاید وہ اپنی نسل کی قدیم ترین مخلوق تھی جو حویلی کے نمک پر پل رہی تھی اور دل و جان سے اس کی وفادار اور خیر خواہ تھی۔ وہ زیادہ سوشل نہ تھی۔ بس ایک چکر حویلی کا لگاتی جیسے صبح صبح ہر کسی کو سلام کر رہی ہو، پھر مٹی کے مخصوص پیالے میں پڑے ہوئے دودھ کو لپ لپ کر کے پی جاتی اور یوں ناشتے سے فارغ ہو کر مونچھوں پر زبان پھیرتی حویلی کے جنوب مشرقی کونے میں دبک کر بیٹھ جاتی۔ دوپہر تک وہاں استراحت کرتی، پھر کھانے کے لیے اٹھتی اور جو کچھ مل جاتا، صبر شکر کر کے کھالیتی اور پھر اپنی مخصوص جگہ پر لیٹ جاتی۔ وہ گھر والوں کو تنگ کرتی نہ چھوٹے بڑے جانوروں کے معاملوں میں دخل دیتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ تارک الدنیا ہے جو اپنا وقت مراقبے اور عبادت میں گزارنا چاہتی ہے۔ جانوروں میں غالباً وہ سب سے زیادہ نیک اور پرہیزگار بھی

جاتی تھی اور ملک صاحب کے بیٹے اور پوتے اسے احترام سے گرینڈ ما (Grandma) کہتے تھے۔ اتنی حلیم الطبع، خاموش اور نیک بلی پہلے کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ اس بلی میں ایک ہی نقص تھا کہ جب حویلی میں کوئی ناجائز بات یا ظلم ہوتے دیکھتی تو مہر سکوت توڑ کر فریاد ضرور کرتی۔ کبھی دھیمی آواز میں اور کبھی چیخ چیخ کر پتا نہیں شاید یہ بلی اپنے پیٹ کے درد یا بھوک اور پیاس کی وجہ سے بلبلاتی ہو لیکن وہاں کے باشندوں خصوصاً نوکروں کا خیال تھا کہ یہ صرف ناپسندیدہ کاموں پر صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔

مرحوم صدیق سالک کی کتاب ''ایمرجنسی'' سے فرح عالم اسلام آباد کا اقتباس

اقوال زریں

- تمہارے ایمان کی نشانی سادگی ہے۔
- اگر خوش رہنا چاہتے ہو تو ماضی کو بھول جاؤ۔
- لڑائی سے زیادہ طاقت محبت میں ہے۔
- غرور کو اپنے جسم سے نکال دو۔
- خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
- دوست نما دشمن سب سے خطرناک ہے۔
- ایک جاہل عقل مند ترین ہے اگر وہ خاموش رہتا ہے۔
- تنگ ذہن ہمیشہ تنگ راستوں کی طرف لے جاتے ہیں۔
- محبت کا ایک لمحہ نفرت کے سو برسوں پر بھاری ہے۔

مرسلہ: کرن شہزادی۔راولپنڈی

پیٹ کا درد

ایک شخص کو پیٹ میں درد کی شکایت تھی۔ وہ اسپتال گیا اور نرس سے پوچھا ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں۔

نرس نے جواب دیا وہ آپریشن روم میں ایک آدمی کے پیٹ سے قینچی نکال رہے ہیں جو ایک ہفتے پہلے آپریشن کے دوران اس کے پیٹ ہی میں بھول گئے ہیں۔

مرسلہ: کاشف نبی خان۔کراچی

ماں

ماں...... مجسم نہ سہی پر تیرے پاس ہوں
سن مجھے غور سے گوش بر آواز ہوں
دن کے اجالے میں نہ کر تلاش مجھے
میں تیری بند آنکھوں کا راز ہوں
تاج میرے لہو کا پہنا دے حاکم کو
ہو احساس انھیں...... وقت کی آواز ہوں
اور......!
میرے ماتھے کو چوم لینے کی حسرت نہ کر
اب میں حلقہ فرشتگان جہاں کا زہوں

(سانحہ پشاور سے متاثرہ ایک ماں کے لخت جگر کا نوحہ، مومینہ بتول کے قلم سے)

مشورہ

جہاز میں پاگلوں کا بہت شور تھا۔ کچھ پاگل جہاز میں ہاکی کھیلنے لگے۔ جہاز کا پائلٹ تنگ آ چکا تھا۔ آخر ایک پاگل نے کہا جہاز میں ہاکی کھیلنا منع ہے۔ کچھ دیر بعد ایئر ہوسٹس آئی تو کہنے لگی یہ پاگل کہاں گئے تو ایک پاگل کہنے لگا وہ ہاکی کھیل رہے تھے۔ میں نے جہاز کا دروازہ کھول کر مشورہ دیا کہ جاؤ باہر گراؤنڈ میں جا کر کھیلو۔

مرسلہ: حافظ شاہ ولی اللہ۔کوہاٹ

فوٹو

لڑکے نے لڑکی سے پوچھا۔
''کہاں جا رہی ہو؟''
لڑکی نے جواب دیا۔
''خودکشی کرنے۔''
لڑکے نے پھر کہا۔
''تو اتنا میک اپ کیوں کیا؟''
لڑکی نے فوراً کہا۔
''کل صبح اخبار میں فوٹو بھی تو آنی ہے۔''

مرسلہ: احمر عبدالغنی۔کراچی

فرض

سقراط نے کہا، ہر شخص پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کرے اور اپنے انفرادی استدلال اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کے درمیان حد فاصل قائم کرے۔ نہ صرف یہ کہ انسان خود ہر چیز کی کسوٹی ہے بلکہ ہر انسان بجائے خود اپنے لیے بھی ایک کسوٹی ہے۔

ایس ایم شاہد کی کتاب ''مغربی سیاسی افکار'' سے
تنویر فاطمہ کراچی کا انتخاب

باتوں سے خوشبو آئے

☆ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آیا کرو، جانے کس بھیس میں خدامل جائے۔

☆ حسرتوں کے ہجوم اور خوشیوں کے تلاطم میں ماں کی عظمت کو دیکھو۔

☆ خوب صورتی کی تلاش میں ہم چاہے پوری دنیا کا چکر لگا آئیں اگر وہ ہمارے اندر نہیں تو کہیں نہیں ملے گی۔

☆ جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ ہر ایک سے ڈرتا ہے اور جو خدا سے ڈرتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔

☆ قدرت نے دل و دماغ کو اونچی جگہ دی ہے۔ اس لیے جذبات کو ہر حالت میں دماغ کے تابع رکھنا چاہیے۔

☆ ادب انسان کا وہ حسین زیور ہے جو اس کا دل اور ذہن سنوارتا ہے۔

☆ علم دلوں کو روشن ذہن کو منور اور آنکھوں کو شاد کرتا ہے۔

مرسلہ: مسز نگہت غفار، کراچی

غزل

کچھ بھی کر گزرنے میں دیر کتنی لگتی ہے
برف کے پگھلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
اس نے ہنس کے دیکھا تو مسکرا دیے ہم بھی
ذات سے نکلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
ہجر کی تمازت سے وصل کے الاؤ تک
لڑکیوں کے جلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
بات جیسی بے معنی، بات اور کیا ہوگی
بات سے مکرنے میں دیر کتنی لگتی ہے
زعم کتنا کرتے ہو اک چراغ پر اپنے
اور ہوا کے چلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
جب یقیں کی بانہوں پر شک کے پاؤں پڑ جائیں
چوڑیاں بکھرنے میں دیر کتنی لگتی ہے

شاعرہ: نوشی گیلانی، انتخاب: شائستہ انور، اسلام آباد

یاد رکھنے والی باتیں

✠ سارے لوگ آسانیاں نہیں دیتے اور سارے مشکلیں بھی نہیں پیدا کرتے، کچھ سب کی تکریم کرتے ہیں اور کچھ دو جملوں میں ہی دل توڑ جاتے ہیں۔

✠ دل بجھ جائے تو شہر تمنا کے چراغاں سے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

✠ جب تم خدا سے محبت کرو تو یہ نہ کہو کہ وہ میرے دل میں ہے بلکہ یہ کہو کہ میں اس کے دل میں ہوں۔

✠ جب آپ کے کسی بھی عمل سے دوسروں کی آنکھوں کے جگنو بجھ جائیں اور ان آنکھوں میں خوشیوں کی رمق کی بجائے ویرانیوں کا بسیرا ہو جائے تو جان لیجیے کہ اس کی ویران اور بے نور آنکھوں سے آپ کے دل کی ویرانی کا راستہ شروع ہوتا ہے۔

مرسلہ: ارسلان یوسف۔ ڈسکہ

عشق

ایک شخص نے بس میں بیٹھتے ہوئے اپنے قریب کے ایک شخص کو مایوس اور افسردہ دیکھ کر باتوں باتوں میں کہا: ''کچھ یوں لگتا ہے جیسے آپ نے زندگی میں عشق کیا اور ناکام ہو گئے۔''

''میں نے زندگی میں ایک ہی بار عشق کیا تھا اور بدقسمتی سے کامیاب ہو گیا۔''

مرسلہ: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

خضر حیات.........روڑہ تھل

میرے ہاتھوں سے تیرا ہاتھ فقط اس لیے چھوٹا دوست
تو انمول اتنا تھا کہ میں تیری قیمت نہ دے سکا

ابو ہریرہ بلوچ.........بُورے والا

دھوکا دیتی ہے شریف چہروں کی چمک اکثر
ہر شیشے کا ٹکڑا ہیرا نہیں ہوتا

علی اصغر انصاری.........مچن آباد

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں
بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو
خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

شمائلہ شہزاد.........کوئٹہ

تمھیں کس بات کا غم ہے وہ اتنا پوچھ لیں ہم سے
وہ اتنا پوچھ لیں ہم سے تو پھر کس بات کا غم ہے

رانا حبیب الرحمٰن.........ڈسٹرکٹ جیل ٹوبہ ٹیک سنگھ

سیکڑوں حصوں میں دیکھو بٹ گیا میرا وجود
کس قدر مہنگی پڑی ان سے شناسائی مجھے
یہ بھی قدرت کا کرشمہ ہے عطا اس نے کیے
درد تم کو اور تاثیرِ مسیحائی مجھے

سلیمان شبیر.........اکوال تلہ گنگ

تم سے بچھڑے تو کوئی خواب پھر دیکھا بھی نہیں
جو ٹھہر گیا آنکھوں میں صبر تمھیں یاد کرتا ہے
راستوں کی کہانی میں تمہارا ذکر اب تک ہے
جسے بھول گئے ہو تم وہ شبیر تمھیں یاد کرتا ہے

ملک عاشق حسین ساجد.........ہیڈ بکائنی

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ عجب مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

حسین خواجہ.........مچن آباد

عروسِ زندگی کا چلن روزِ ازل سے ہے
یہ ہوگی مہرباں لیکن سلوکِ ناروا کے بعد

مہر پرویز احمد دولو.........میاں چنوں

دوپٹے میں کہاں تک جذب کرتی
وہ آنسو تو سمندر بن گیا تھا

راحیلہ بنت مہر علی شاہ.........گاؤں آما خیل

یقیں اتنا تھا تجھ پہ کہ
یقیں ٹوٹا ہمیں خبر نہ ہوئی

ملک صفدر عباس اعوان.........جہانیاں

نشانی تم کو بتاؤ اداس لوگوں کی
کبھی غور کرنا یہ ہنستے بہت ہیں

نزابت افشال.........مہورہ فتح جنگ

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

عبدالغفار عابد.........چیچہ وطنی

تمام عمر لکھتے رہے ورق پھر بھی رہے سادہ
جانے کیا لفظ تھے جو ہم سے تحریر نہ ہوئے

سیدہ آسیہ عنبر گیلانی.........اوکاڑہ

تتلی کے پر اڑان کی گرمی سے جل گئے
تارے فلک پہ دشت میں پتھر پگھل گئے
دشمن تھے ہوشیار جو بچ کر نکل گئے

ترکش میں جتنے تیر تھے اپنوں پہ چل گئے

شاہد حسین نظام.........جیکب آباد

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

ریاض حسین تبسم چوہان.........فیصل آباد

سورج کی کرنوں میں تپش انتہا کی تھی
پر اپنے سر پہ چھاؤں تو ماں کی ردا کی تھی

تجھ سے کوئی گلہ تو نہیں پر جواب دے
کاٹی جو عمر بھر وہ سزا کس خطا کی تھی

اسامہ بلال اعوان.........لاہور

آج پھر موسم نم ہوا میری آنکھ کی طرح
لگتا ہے بادلوں کا بھی دل کسی نے توڑا ہے

مختار احمد سکھیرا.........میلسی

خیال و خواب ہوئے ہیں وفاؤں کے خوگر
وفا کے پھول میں اب بُو نہیں ہے باس نہیں

معاویہ عنبر وٹو.........ہڑپہ

گھٹن اتنی ہے لینا سانس بھی دشوار ہے لیکن
دھرا ہے سنگ جو دل پہ ہٹانے بھی نہیں دیتا

شازلی سعید مغل.........کراچی

ہر بار کھا کے چوٹ سنبھلنا پڑا مجھے
میں موم تو نہیں تھیں پگھلنا پڑا مجھے
ہر دو قدم پہ ایک رکاوٹ کھڑی ملی
مجبور ہو کے رستہ بدلنا پڑا مجھے

قاسم خان بلوچ.........ٹوبہ ٹیک سنگھ

نیا اِک زخم مجھ کو روز مل جاتا ہے تحفے میں
مسیحا بھی پرانے گھاؤ بھر جانے نہیں دیتا
وہ دے کر زہر کہتا ہے اسے پینا ضروری ہے
میں اس کو پی تو لوں لیکن وہ مرجانے نہیں دیتا

نعیم اکبر.........قصور

انا پرست حسین بے مثال اتنا تھا
نگاہیں ہوگئیں خیرہ جمال اتنا تھا
محبتیں بھی تھیں لیکن شکایتیں بھی بہت
سمجھتا کاش وہ ہم کو ملال اتنا تھا

نبیل جاوید.........لک موڑ سرگودھا

اپنی تو عمر ان کی نذر ہوگئی تمام!
جو لوگ ہم پہ جینے کا الزام دھر گئے
پھر یوں ہوا کہ کل نے بھی رستہ بدل لیا
پھر یوں لگا کہ جیسے مقدر سنور گئے

شاعر عتیق.........کراچی

تم نے ہی ایک بار کہا تھا خوش رہ
ہم سامنے تمہارے سدا بے زباں رہے
ہم نے تو انتظار میں کاٹی تمام عمر
بدلیں لے گے دن ضرور یہ ہم کو گماں رہے

رانا عزیز الرحمٰن.........گوجرہ

گھاؤ جس طرح لگا ہو کوئی تلوار کے ساتھ
ناتا گہرا ہے بہت درد کا پیار کے ساتھ
اب تو وحشت ہے کبھی پھول کھلا کرتے تھے
زندگی تھی وہی جو کٹ گئی دلدار کے ساتھ

عماد رشید.........کراچی

دل کے موسم تو سدا بادِ موافق مانگیں
غم کی آندھی سے تو یہ باغ اجڑ جائے گا

شبانہ زماں.........کراچی

سچ بول کر جہاں میں تو جینا محال ہے
یہ سوچ کر لگالیے تالے زباں پہ

کوپن برائے
تیر نیم کش
جولائی 2016ء

میرا یہ پسندیدہ شعر ''سچی کہانیاں'' کی نذر ہے

پتا: